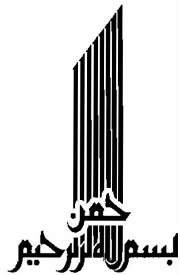
جناب غلام احمد پرویز کے
نظامِ ربوبیت پر ایک نظر

تالیف

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی



جناب غلام احمد پرویز
کے نظامِ ربوبیت پر ایک نظر

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

کی دیگر کتب

- جناب غلام احمد پرویز اپنے الفاظ کے آئینے میں
- ولادت عیسیٰ اور منکرین حدیث
- قرآن اور عورت

جناب غلام احمد پرویز کے نظامِ ربوبیت پر ایک نظر

تالیف

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

بیت الحکمت لاہور

۲۰۰۷ء ۱۴۲۸ھ

نام کتاب : جناب غلام احمد پرویز
کے نظامِ ربوبیت پر ایک نظر

مؤلف : ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

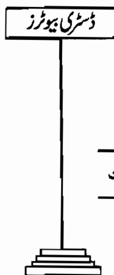
اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۱۸۰ روپے



اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724





کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hlkmat100@hotmail.com

انتساب

اُن بھولے بھالے افراد کے نام، جو طلوعِ اسلام کے لٹریچر کے یک طرفہ مطالعہ کی بناء پر، جناب پرویز صاحب کے دامِ ہمرنگِ زمیں کا شکار ہو چکے ہیں۔

ترتیب ابواب

ترتیب

باب سوم......ملکیتِ اراضی اور قرآن مجید

باب چہارم......ملکیتِ مال اور قرآن مجید

باب پنجم......انفاق اموال اور قرآن مجید

باب ششم......زکوٰۃ اور قرآن مجید

بابِ ہفتم......"نظامِ ربوبیت" کا نفاذ، منزل بمنزل

بابِ ہشتم......کیا صدرِ اسلام میں "نظامِ ربوبیت" نافذ تھا؟

باب نہم...... کیا خلافتِ راشدہ میں فاضلہ دولت کا وجود نہیں تھا؟

باب دہم...... "مفکر قرآن" اپنے تضادات کے آئینہ میں

باب یازدہم......صدرِ اسلام کے نظامِ معیشت کی اصل واساس

حرفِ آخر

☆............☆............☆

حرفِ اوّل

انسان، اپنی نگاہوں پر جس رنگ کی عینک چڑھالے، دنیا کی ہر چیز، اسے اسی رنگ میں مصبوغ نظر آتی ہے، رنگین چشمہ میں سے دیکھنے والے کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ، اشیاء کو ان کے اصلی اور فطری رنگ میں دیکھ سکے۔ جس طرح، سر کی آنکھوں کی کارکردگی، رنگدار چشموں کے باعث متاثر بلکہ متغیر ہوتی ہے، بالکل اُسی طرح، (سینہ اور) دل کی آنکھوں کی کارکردگی بھی، تغیر و تبدل کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ تہذیبِ غیر کے نقطۂ نظر کو اپنا لیا جاتا ہے، ایسا شخص، زندگی کا جو نقشہ بھی بناتا ہے، وہ ان افکار و نظریات کے زیر اثر ہوتا ہے، جو اس کے دل و دماغ پر مستولی ہو چکے ہوں، اور جن کے باعث، اس کا اپنا نقطۂ نظر، معیارِ اخذ و ترک اور زاویۂ نگاہ تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ راست روی کی نیت سے، مخلص ہو کر بھی، اگر کوئی قدم اٹھاتا ہے، تو وہ، اپنی ذہنی ساخت مجبور ہو کر، راہِ کج ہی پر جا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کا یہ قدم، دراصل اُن ایمانیات کی بناء پر نہیں اٹھتا، جن کو فی الحال مستور و مخفی رکھنا، مصلحت آمیز مجبوری بن جاتا ہے، بلکہ اُن اعتقادات کی تحریک سے اٹھتا ہے، جو تہذیبِ غیر کی فکری غلامی کے باعث، ان کے قلب و ذہن پر اپنی مضبوط گرفت قائم کر چکے ہیں۔ وہ، اپنی دانست میں، توحیدِ خالص کو بھی اپنانا چاہتا ہے، تو اس میں شرک کی آمیزش کر ڈالتا ہے۔ اور یوں، وہ، وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ کا جیتا جاگتا نمونہ بن جاتا ہے۔ اپنی زبان پر کلمۂ توحید اور اپنے ہونٹوں پر الفاظِ قرآن کو سجاتے ہوئے بھی، اپنے من کے مندر میں موجود، بتانِ وہم و گمان کی پرستش میں مشغول رہتا ہے۔ وہ جونہی، اپنے پسندیدہ ماحول کو دیکھتا ہے، قلب و ذہن میں رچے بسے عقائد کی کوکھ سے جنم لینے والی خواہشات، قومِ بنی اسرائیل کی طرح اس مطالبہ کا روپ دھار

لیتی ہیں یٰمُوسٰی اجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا اٰلِهَةٌ (الاعراف: ۱۳۸) ''اے موسیٰ! ہمیں بھی ایسا اِلٰہ بنا دو جیسا کہ ان لوگوں کا ہے۔'' وہ، اپنی زبان سے نظریاتِ حقّہ کا اعلان، اسی وقت تک کرتا رہتا ہے، جب تک مجبوریٔ حالات، اسے فقیہہِ مصلحت بین بننے پر اکسائے رکھتی ہے۔ جونہی، وہ، حالت میں تبدیلی پاتا ہے اور انہیں اپنے لیے سازگار محسوس کرتا ہے، تو وہ، اپنے قلبی عقائدِ باطلہ کے زیرِ اثر، مکروفریب کے ذریعہ، ایسی ''سامریت'' کا مظاہرہ کرتا ہے کہ قوم کی اعجوبہ پسند طبیعت، اس سے متاثر ہوکر، اس کی اس بات کو مان لیتی ہے کہ هٰذَا اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوسٰی فَنَسِیَ ''یہی دراصل، تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے، جسے وُہ بھول گیا۔''

منکرین حدیث کے ''مفکرِ قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز کو ہم نے، امت مسلمہ کے حق میں، فی الواقعہ، ایک ایسے ہی سامری کے روپ میں پایا ہے۔ اُن کی آنکھوں پر، تہذیبِ مغرب کی رنگین عینک تھی، جس کی بنا پر، انہیں، محمد رسول اللہ والذین معہ کی تہذیب، اپنے اصل اور فطری رنگ میں دکھائی دینے کی بجائے ''عجمی سازش'' کے رنگ میں مصبوغ نظر آتی تھی اور تہذیب مغرب کی ہر چیز انہیں، کھری اور حقیقی نظر آتی تھی، کیونکہ دل کی آنکھوں پر، جو چشمہ نصب تھا، اس کا یہی تقاضا تھا۔ ایک زمانہ تھا، جب وہ تنہا قرآن کی بجائے، ''قرآن وسنت'' اور ''کتاب اللہ واسوہ حسنہ'' کا نام بھی لیتے رہے ہیں، اور ان دونوں کو سرچشمہ اسلام بھی قرار دیتے رہے ہیں، بلکہ اُن دنوں، وہ، فقط ''قرآن، قرآن'' کی رٹ لگانے والے، ''اہل قرآن'' کے خلاف مضامین و مقالات بھی لکھتے رہے ہیں، لیکن صرف اس وجہ سے کہ فقیہہِ مصلحت بیں کو اُن دنوں ایسا کرنا، ''نظریۂ ضرورت'' کا تقاضا دکھائی دیتا تھا، اور پھر بعد میں، جب اُن کے قارئین کا ایک حلقہ پیدا ہوگیا، تو وہ مصلحت و منافقت کا لبادہ ترک کرکے، رندِ بادہ خوار کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئے، اور جن افکار ونظریات کی، وہ، بربناءِ مصلحت، تردید کیا کرتے تھے، اُن کی تائید پر اُتر آئے، اور جن عقائد و تصورات کی تائید کیا کرتے تھے، ان کی مخالفت وابطال، اب، اُن کا فریضہ ٹھہرا۔

بنی اسرائیل کے چالاک اور مکار سامری نے مطالبۂ بت پرستی کیا، تو وقت کے پیغمبر کو،

ذریعہ اور آلہ کے طور پر، استعمال کرنے کی کوشش کی، اور حضرت موسیٰؑ ہی سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ہی ہماری اس خواہش کو پورا فرما دیجئے (اِجْعَل لَنَا اِلٰهًا .....) لیکن امت مسلمہ کا یہ سامری، چونکہ عہدِ رسالتمآب میں موجود نہ تھا، اس کے ہاتھ میں کتاب اللہ آئی، اُس نے اپنے قلبی معتقدات کی پاسداری کے لیے، کتاب اللہ کو بطور آلہ اختیار کیا، چنانچہ عجلِ اشتراکیت کی محبت، اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، اور کارل مارکس کی فکر، اُن کے حواس ومشاعر پر چھا گئی، تو اُنہیں قرآن مجید، ''داس کیپٹل'' دکھائی دیا۔ اشتراکیت، اسلام ہی کا جدید ایڈیشن نظر آئی، اور اس یہودی (کارل مارکس) کے ذہن کا تراشا ہوا معاشی نظام، ''قرآنی نظام ربوبیت'' محسوس ہوا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام سے تا ایں دم، جاری رہنے والی کشمکش، جسے قرآن ''حق و باطل کی کشمکش'' قرار دیتا ہے، اب ''نظام ربوبیت'' کے حامی ''غریبوں'' اور اس کے مخالف ''سرمایہ داروں'' کے درمیان، جنگ کے طور پر سامنے آئی، اور ''جدلی مادیت'' کا فلسفہ، کشمکشِ حق و باطل قرار پایا، اور کیمونسٹوں کے ''تاریخی وجوب'' کا نظریہ، پرویز صاحب کی نظر میں ''وقت کا تقاضا'' بن گیا۔

یوں پرویز صاحب نے، تہذیبِ مغرب کی فکری اسیری اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، جب مطالعۂ قرآن شروع کیا، تو قرآن کریم کی ہر چیز کو، تہذیبِ مغرب کے قطعی خلاف پایا، اب، چونکہ پرویز صاحب، قرآن سے ہدایت لینے کے متمنی نہیں تھے بلکہ الٹا اُسے ہدایت دینا چاہتے تھے، اس لیے، انہیں، اپنے قلبی معتقدات کی حمایت و پاسداری کے لیے، قرآن مجید کے ایک ایک لفظ سے زور آزمائی کرنا پڑی، جس کے نتیجہ میں، الفاظ کے معانی بدلے، آیات کے مفاہیم متغیر ہوئے، حقائق کی ''مرمت'' کی گئی، اور قرآن کریم کی تفسیر بدلی۔ اور پھر جس قرآن سے، قیامِ پاکستان سے قبل، ذاتی ملکیت کا ثبوت پیش کیا جاتا تھا، اب اُسی قرآن سے اس کی نفی پیش کی جانے لگی، اور وہ بھی، اس حد تک، کہ اب ''ذاتی ملکیت'' کفر وشرک قرار پا گئی۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ کہہ کر، قرآن کریم نے، اپنے معاشرہ میں، تفاضل فی الرزق کی جو حقیقت پیش کی تھی، وہ اب بدلے ہوئے مفہوم کے مطابق، ''استعدادِ

کسب واکتساب میں تفاضل' قرار پائی (نہ کہ رزق میں ایک دوسرے پر برتری)۔ صحابہؓ کا وہ معاشرہ، جس میں، تفاوت فی المال اور تفاضل فی الرزق، ایک پیش پا افتادہ حقیقت تھی، اب ایسا معاشرہ قرار پایا، جس میں صاحبِ ثروت اور آسودہ حال، صحابیؓ ''سرمایہ دار'' قرار پائے۔ یوں قرآن کی بنیاد پر، صحابہؓ کرام کے متعلق، ایک نیا تاثر پیدا ہوا، جس کی روشنی میں ''مفکر قرآن'' کو از سرنو تدوینِ تاریخ کا خیال سوجھا، اور پھر تاریخ تک ہی بات محدود نہ رہی، بلکہ تصوف، لغات اور احادیث تک کو ''مطابق قرآن'' بناڈالنا ضروری قرار پاگیا۔

سچ پوچھئے تو پوری اسلامی تاریخ نیز فقہ، احادیث، تصوف، لغت، سب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ [1]

قرآنی الفاظ کا اشتراکیت زدہ مفہوم:

''مفکر قرآن'' نے اشتراکیت کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوکر، قرآنی الفاظ کے ظروف میں، خودساختہ معانی کی جو غلاظت بھری ہے، اس کے مطابق، ترجمۂ قرآن، مفہومِ قرآن، اور تفسیر قرآن، سب کچھ بعید از حقیقت ہوچکا ہے، لیکن اِس ''چوری'' پر، اُن کی ''سینہ زوری'' کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ اعلان کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ کا بالکل وُہی مفہوم پیش کیا ہے، جو دورِ نزولِ قرآن کے عربوں میں رائج تھا، اور یہ کہ انہوں نے اس امر کی پوری کوشش کی کہ

یہ معلوم ہوجائے، کہ نزولِ قرآن یا اس سے قریب تر زمانہ میں، ان الفاظ سے بالعموم کیا مفہوم مراد لیا جاتا تھا۔ [2]

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ خود پرویز صاحب نے، قرآن کے عربی الفاظ میں عجمی مفاہیم، اور وہ بھی نزولِ قرآن کے چودہ صدیوں بعد کے مفاہیم، اس حد تک داخل کئے ہیں کہ اصل مفہوم آیت، مسخ ہوکر رہ گیا ہے، اور یہ دورِ حاضر میں، اتنی بڑی ''عجمی سازش'' ہے کہ اس کے مقابلہ میں، اُن دسائس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، جنہیں وہ، اسی نام سے پیش

---

[1] طلوع اسلام، ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۶

[2] طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۱ء صفحہ ۶۹

کرتے ہوئے، علماءِ سلف کو نشانہ بناتے رہے ہیں۔

''مفکر قرآن'' صاحب نے، تہذیبِ غالب سے ''ماڈرنزم'' کے جملہ عوامل و عناصر کو لے کر، اسلامی تعلیمات میں سمو دینے کے لیے، ایسا انوکھا اور غیر معمولی حربہ ایجاد کیا، جسے انہوں نے قرآنی مفردات کی خود ساختہ توضیح اور مصطلحاتِ قرآنیہ کی خانہ زاد تشریح میں، خوب استعمال کیا ہے۔ ان کی بہت سی توضیحات و تشریحات، انتہائی رکیک، دور خیز اور اختراعی و افترائی ہیں۔ اور لغات القرآن، اُن کی ایسی ہی لغوی موشگافیوں کا مجموعہ ہے۔

اللہ سے مراد، ان کے نزدیک، کائنات کی وہ بالا ترین ہستی نہیں ہے، جو اس وسیع کائنات اور عالمِ رنگ و بو کی خالق ہے، بلکہ اس سے مراد، کہیں تو ''اللہ کا نظام'' ہے، اور کہیں ''اللہ کا قانون''، اور کہیں ''مکافاتِ عمل'' مراد ہے، اور کہیں ''نظامِ ربوبیت۔'' جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:

(۱) ...... فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ ...... ہمارے اس نظام میں، جس کی تم اطاعت کرتے ہو، اتنی قوت موجود ہے، کہ وہ تمہیں، ان کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رکھ سکے۔ [۱]

(۲) ...... وَاِن يُّرِيْدُوا اَن يَّخدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللهُ ...... اگر دشمن (اپنے آپ کو مائل بہ صلح ظاہر کر کے) تمہیں دھوکہ دینے کا اِرادہ رکھتا ہو، تو (اے رسول!) تم گھبراؤ نہیں۔ تمہارے لیے خدا کا قانون کافی ہے۔ [۲]

(۳) ...... اِنَّ اللهَ عَلِيم بِذَاتِ الصُّدُورِ ...... خدا کا قانونِ مکافات، دل میں گزرنے والے خیالات تک کا بھی علم رکھتا ہے۔ [۳]

(۴) ...... اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ...... ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اسی راستہ کو اختیار کریں، اور خدا کے عالم گیر نظام ربوبیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ [۴]

اور رَبُّ الْعَالَمِيْنَ سے مراد، بھی ''تمام جہانوں کا مالک یا پروردگار'' نہیں، بلکہ اس کا معنٰی ''عالمگیر نظام ربوبیت'' ہے، چنانچہ، وہ، يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاس لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ کا

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۹ تا ۵۰ [۲] مفہوم القرآن، ص ۴۱۰ [۳] مفہوم القرآن، ص ۲۴۲ [۴] مفہوم القرآن ص ۳۰۳

تصوارت کے حامل، قرآنی الفاظ پر مشتمل، کتب قرار دیا ہے، اور دوسری جگہ، اِن ہی کتب کو، مستند کتبِ لغات کہا گیا ہے، تو، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

''زیرِنظر لغت کی ترتیب وتدوین میں، سب سے پہلے فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ عربی زبان کے کون سے لغت کو، بطور اساس و بنیاد سامنے رکھا جائے، مروجہ کتب لغات میں، تین کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہے، یعنی لسان العرب، تاج العروس، اور قاموس، (......) ان تینوں کے محاسن وخصوصیات کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہی طے پایا کہ تاج العروس کو بنیاد قرار دیا جائے۔'' [۱]

تاج العروس کے علاوہ، جن کتب کو، پرویز صاحب نے پیشِ نظر رکھا ہے، ان میں مندرجہ ذیل کتب لغات شامل ہیں۔

(۲) امام راغب اصفہانی (متوفی قریب ۵۰۲ھ) کی مشہور کتاب ''المفردات فی غریب القرآن'' ہے۔

(۳) تیسری اہم کتاب، ابن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) کی مقاییس اللغۃ ہے۔

(۴) اس کے بعد، جس کتاب سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، وہ پطرس بستانی کی محیط المحیط ہے۔

ان کے علاوہ، اکثر مقامات پر، حسب ذیل کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے:

(الف) فقہ اللغۃ (ب) اقرب الموارد (ج) منتھی الارب

(د) کتاب الاشتقاق (ر) العلم الخفاق فی علم الاشتقاق (س) الالفاظ المترادفۃ

(ش) لطائف اللغۃ (ص) کتاب القرطین (ط) البستان [۲]

دیکھ اپنی آنکھ کا غافل، ذرا شہتیر بھی:

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ جن کتبِ لغات کو، پرویز صاحب نے، اپنی ''لغات القرآن'' کی تدوین کے دوران، بطور اساسی کتب کے، اپنے سامنے رکھا ہے، اُن ہی کے مصنفین کے متعلق وہ یہ فرماتے ہیں:

''اس کے ساتھ، یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ جن حضرات نے یہ کتابیں مرتب کیں،

---

[۱] لغات القرآن، ج۱، پیش لفظ، ص۲۲ [۲] لغات القرآن، ج۱، پیش لفظ، ص۲۳، ۲۴

وہ (باستثناءِ معدودے چند) سب کے سب غیر عرب (یعنی عجمی) تھے، یہی کتابیں، عربی زبان کا اولین سرمایہ تھیں۔'' ۱؎

لیکن اس سے بڑھ کر عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ ان کتب کے مصنفین تو (باستثناءِ چند) عجمی تھے ہی، لیکن دورِ حاضر میں، مغربی تہذیب کے طلسم میں گرفتار ہو کر، لکھی جانے والی ''لغات القرآن'' کے مصنف بھی عجمی ہی ہیں۔ نام کے اعتبار سے بھی، تخلص کے اعتبار سے بھی، پیدائش کے اعتبارے سے بھی، شکل وصورت کے اعتبار سے بھی، ماحول کے اعتبار سے بھی، رہن سہن کے اعتبار سے بھی، اور مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری کے اعتبار سے بھی۔ لیکن خود سراپا عجمی ہو کر، دوسروں پر عجمیت کا الزام عائد کرتے ہوئے وہ خود اپنی عجمیت کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے، تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں، یہ تاثر ابھر آئے، کہ جو شخص، دوسروں پر، عجمیت کا عیب لگاتا ہے، وہ خود عجمی کیسے ہو سکتا ہے، یقیناً وہ (بٹالہ نامی) کسی خالص عربی قصبے ہی میں پیدا ہوا ہوگا، جو کسی عرب ملک ہی میں واقع ہوگا، اور اسکی مادری زبان بھی عربی ہی ہوگی، اور اس نے اپنی تمام عمر، یا زندگی کا غالب حصہ، قرآن فہمی کے لیے، لازماً، عرب کے بدوؤں ہی میں گزارا ہوگا، کیونکہ حضرت عمرؓ یہ کہا کرتے تھے:

''قرآن سمجھنا چاہتے ہو، تو صحرا کے بدوؤں میں، کچھ دن گزارو، کیونکہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، وہ، زبان، ان کے ہاں، اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔'' ۲؎

پھر ''مفکر قرآن'' کے سیرت وکردار کا یہ پہلو بھی، اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے کہ جو عیب، خود اُن میں پایا جاتا تھا، اُسے، وہ، دوسروں کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے، وہ، خود عجمی تھے، اور تہذیب مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا ہو کر، انہوں نے قرآنی الفاظ میں، (چودہ صدیوں بعد) عجمی تصوارت داخل کئے تھے، لیکن ٹھیک اسی بات کا الزام، وہ، دوسروں پر تھوپا کرتے تھے، چنانچہ وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ قرآنی مفردات میں عجمی تخیلات، کیونکر در آئے، یہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ دورِ ملوکیت میں ہوا۔

''قرآن کے الفاظ تو وہی تھے جو وقتِ نزولِ قرآن تھے، کیونکہ ان کی حفاظت

۱؎ لغات القرآن، ج ۱، پیش لفظ، ص ۸ ۲؎ لغات القرآن، ج ۱، پیش لفظ، ص ۱۴

حالانکہ اسی آیت کا ترجمہ، جبکہ وہ لیلائے اشتراکیت کے مجنوں نہیں بنے تھے، کبھی ان الفاظ میں بھی پیش کیا کرتے تھے:

"جو لوگ حقیقتِ حال پوچھنے والے ہیں، (اگر وہ سمجھیں، تو) اُن کے لیے یوسف اور ان کے بھائیوں کے معاملے میں، (موعظت وعبرت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔" [۱]

یہ صرف ایک آیت کا مفہوم ہے، جسے بطور نمونہ، مُشتے از خروارے پیش کیا گیا ہے، ورنہ جس طرح، ساون کے اندھے کو، ہر طرف، ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے، بالکل اسی طرح، عشقِ اشتراکیت کے اندھے کو بھی، ہر آیت، اشتراکیت زدہ ہی دکھائی دیتی ہے۔

محاورۂ عرب کی گردان اور عملی روش:

قصہ مختصر یہ کہ "مفکر قرآن" نے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ، اگرچہ، محاورۂ عرب کو پیشِ نظر رکھنے کی گردان جاری رکھی، لیکن عملاً انہوں نے، اسے اپنے سامنے رکھنے کی بجائے، تہذیبِ مغرب کے افکار و اطوار ہی کو مرکزِ توجہ بنائے رکھا، اور اس طرح، جو کچھ انہوں نے اپنے قلم سے پیش کیا، وہ، قرآن کے نام پر، دورِ حاضر کی غالب تہذیب کے اقدار و اعمال ہی ہیں۔ پھر وہ محاورۂ عرب کا التزام، بخلوص قلب چاہتے بھی، تو ایسا کر نہیں سکتے تھے، کیونکہ دورِ نزولِ قرآن کے مفاہیم ومعانی، بقول ان کے، مرورِ ایام کے ساتھ بدلتے چلے گئے، اور بعد میں جب کتبِ لغات کی تدوین و ترتیب عمل میں آئی، تو ان میں یہی بدلے ہوئے مفاہیم ومعانی درج ہوئے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

"جسے آج عربی لٹریچر کہا جاتا ہے، وہ بیشتر عباسیوں کے زمانے میں مرتب ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں کتبِ احادیث وسیر اور تاریخ و آثار مرتب ہوئیں۔ قرآن کریم کی تفسیریں لکھی گئیں۔ عربی ادب کی کتابیں تالیف ہوئیں۔ اس زبان کے صرف ونحو کے قواعد مدون ہوئے۔ لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں۔" [۲]

اس سے ذرا آگے چل کر، وہ، لکھتے ہیں:

---

[۱] معارف القرآن، ج ۳، ص ۱۱۶ — [۲] لغات القرآن، ج ۱، پیش لفظ، ص ۸

''تاریخ کا طالب علم، اس حقیقت سے واقف ہے کہ عباسیوں کے زمانے میں عجمی تصوراتِ حیات، ساری فضا میں پھیل چکے تھے، انہوں نے سلطنت، ان ہی کی مدد سے حاصل کی تھی، اس لیے اس دور کی سیاست پر بھی، ان ہی کا اثر غالب تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ جس گروہ کا سیاست پر اثر ہو، اس کا زندگی کے ہر شعبہ پر اثر چھا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان لوگوں کے قلم سے جو کچھ نکلا، اس کے الفاظ تو عربی تھے، لیکن ان الفاظ کے پیکروں میں تصورات عجمی تھے۔'' [1]

حرام ہے، جو کبھی، خود ''مفکر قرآن'' نے یا ان کے اندھے مقلدین نے، یہاں توقف کر کے کبھی یہ سوچا ہو کہ جب سارا عربی لٹریچر، جس میں کتبِ لغت بھی شامل ہیں، (نزولِ قرآن کے صدیوں بعد) اس دور میں تصنیف کی گئیں، جب الفاظِ قرآن کے اصل مفاہیم و معانی، گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکے تھے، اور قرآن کے عربی الفاظ میں عجمی مفاہیم داخل ہو چکے تھے، تو پھر عجمی تصوارت کی حامل، ان ہی کتبِ لغات پر، خود پرویز صاحب نے، اپنی ''لغات القرآن'' کی تصنیف کا انحصار کیوں کیا؟ اور انہیں بطور اساسی کتب کے، اپنے سامنے کیوں رکھا؟ اور پھر، قرآنی الفاظ کے پیکروں میں، عجمی تصوارت کی حامل، اِن ہی کتبِ لغات سے استفادہ کرنے میں کیا خوبی پائی جاتی ہے؟ کہ پرویز صاحب اور ان کے پیروکار بڑے فخر و انبساط کے ساتھ، اپنی لغات القرآن کے بارے میں، یہ کہا کرتے تھے (اور کہا کرتے ہیں) کہ ہم نے ہر لفظ کے معنٰی کی سند، مستند کتبِ لغات سے فراہم کی ہے۔

''لغات القرآن کے بارے میں پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ اس میں کسی لفظ کے معنٰی اپنی طرف سے نہیں دیئے، تمام معانی عربی زبان (بالخصوص قرآن کریم) کی مستند کتبِ لغات کی رو سے دیئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے ساتھ ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔'' [2]

اب رہی وہ کتبِ لغات، جن سے استفادہ کیا گیا ہے، اور جن کو، ایک جگہ، عجمی

---

[1] لغات القرآن، ج ۱، پیش لفظ، ص ۸ [2] طلوعِ اسلام، جولائی، ۱۹۷ء، ص ۷۷

کا ذمہ، خود خدا نے لیا ہوا ہے، لیکن ان کی روح بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے، اور جب روح سامنے نہ ہو تو ان الفاظ کے ساتھ، جو تصور وابستہ تھے آہستہ آہستہ ان کا مفہوم بھی بدل گیا، اور ایسے سانچوں میں ڈھل گیا جو مسلمانوں کی تاریخ کے دورِ ملوکیت کی یادگار ہیں۔'' [۱]

اور اب، دورِ حاضر میں، ماشاء اللہ ''ملوکیت'' کا خاتمہ ہو چکا ہے، ''جمہوریت'' کا دور دورہ ہے، کارل مارکس کی بدولت، دنیا کو وہ نظام مل چکا ہے، جو ''قرآنی نظام ربوبیت'' کے متماثل ہے، اور جسے چودہ صدیوں میں، کوئی مفسرِ قرآن، کوئی متکلمِ اسلام، کوئی ماہرِ حدیث، کوئی عالمِ تاریخ وسیر، اور کوئی فقیہہ و محدث نہ سمجھ سکا، اس کا اگر شعور وفہم، کسی نے پایا، تو حضرت کارل مارکس اور اس کے خلیفۂ خاص حضرت اینجلز تھے، جن سے پرویز صاحب کو علم ہوا کہ قرآن تو آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ ''عالمگیر نظام ربوبیت'' قائم کرے، چنانچہ ہندوستان نام کے خالص عرب ملک میں، بمقام بٹالہ، ایک خالص ''عربی مفکر قرآن'' پیدا ہوا، جس کی مادری زبان عربی تھی، اور جس پر نظام ملوکیت کی کوئی پرچھائیں تک نہ پڑی تھی، اور الفاظِ قرآن کی وہ روح، جو دورِ ملوکیت میں، قرآنی مفردات سے منفک ہو چکی تھی، وہ پرویز صاحب کی مرتب کردہ ''لغات القرآن'' میں لوٹ آئی۔

''مفکر قرآن'' کا مطالبہ:

''مفکر قرآن''، اگرچہ خود تہذیب حاضر کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا تھے، لیکن، وہ بڑی بلند آہنگی سے، قرآن کا نام لے کر، یہ اعلان کیا کرتے تھے:

''یاد رکھئے، کہ دین میں سند نہ تاریخ کے مشمولات ہیں، اور نہ مسلمانوں کے متواتر ومتوارث عقائد ومسالک۔ سند ہے خدا کی کتاب، یہی وجہ ہے کہ میں نے قرآنی نظام ربوبیت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ یہ دیکھئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے، وہ، قرآن کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔'' [۲]

---

[۱] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۹۴ء، جنوری ۱۹۶۵ء، ص ۹۳ [۲] نظامِ ربوبیت، ص ۱۹۲

میں نے ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے اس مطالبہ کو چیلنج جان کر قبول کر لیا ہے، اور ان کے ''نظامِ ربوبیت'' کا جائزہ، صرف اور صرف قرآن کریم کی روشنی میں لیا ہے، ہمارے اسلافِ صالحین کی روش بھی یہی تھی کہ جس کسی باطل طائفے کے افکار و نظریات کی تردید و تنقید، ان کے پیشِ نظر ہوتی، تو وہ یہ کام، اُن ہی کے مسلمہ اصولوں کی بنیاد پر کیا کرتے تھے، تاکہ مخالفین پر حجت قائم ہو سکے۔ مثال کے طور پر، جب یونانی فلسفہ کے حملہ سے فرزندانِ اسلام متاثر ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نصرت وحمایت اور حفاظت کے لیے، ایسے علماء کو پیدا فرمایا، جنہوں نے اس فلسفہ کو، خود اسی کے اصولوں کی بنیاد پر رد کیا۔ اس لیے میں بھی، اِسے قرین صواب و مصلحت سمجھتا ہوں کہ پرویز صاحب کے اپنے قائم کردہ اصول و معیار ہی کی بنیاد پر ......صرف اور صرف قرآن کریم ہی کی روشنی میں...... ''نظامِ ربوبیت'' کا جائزہ لوں۔ میں اپنے اس جائزہ میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں، اس کا فیصلہ، قارئین کرام ہی کر سکتے ہیں۔

''نظامِ ربوبیت'' کی اختراع میں بالخصوص، اور اپنے پورے فکر کی ابتداع میں بالعموم، پرویز صاحب نے، جن چیزوں کو ''قرآنی دلائل'' قرار دیا ہے، وہ، دراصل اشتراکی اور مغربی مفکرین کے افکار و نظریات کی چھوڑی ہوئی، وہ ہڈیاں ہیں، جنہیں جب وہ قرآن کے نام سے پیش کرتے ہیں، تو انہیں ''قرآنی دلائل'' کا نام دے دیتے ہیں۔

''نظامِ ربوبیت'' میں، جن مفکرینِ مغرب کے اقتباسات کو، پرویز صاحب نے اپنے وسعتِ مطالعہ کا رعب جمانے کے لیے، یا عام قارئین کو ان کے بھاری بھرناموں سے مرعوب کرنے کے لیے پیش کیا ہے، میں نے انہیں یکسر نظر انداز کر دیا ہے، کیونکہ خواہ یہ اقتباسات مخالفتِ قرآن میں ہوں یا تائیدِ قرآن میں، ہر اعتبار سے ناقابلِ التفات ہیں۔

پہلی صورت میں تو ایسا ہونا ظاہر ہی ہے۔ دوسری صورت میں بھی (جبکہ وہ تائیدِ قرآن میں ہوں) اس لیے ناقابلِ التفات ہیں کہ قرآن کریم بجائے خود اس امر سے بالاتر ہے کہ وہ کسی کافر سکالر کی تائید وحمایت کا محتاج ہو۔ لیکن پرویز صاحب، اپنے مغربی آقاؤں اور اشتراکیت کے صنّاعوں کے نظریات کو جب منسوب الیٰ القرآن کرتے ہیں تو اندازِ نگارش ایسا ہوتا ہے کہ عالمِ

کفر کی یہ شراب ''قرآنی صحافت'' کی نئی بوتلوں میں بند دکھائی دیتی ہے۔ ''مفکر قرآن'' کی ساری ٹیکنیک، شگفتہ تحریر کے روپ میں، طویل نویسی اور لفظی گورکھ دھندوں میں مضمر ہے۔ میری اس کتاب کا جو شخص بھی، بنظرِ غائر مطالعہ کرے گا، وہ یہ محسوس کرے گا کہ پرویز صاحب کی لفاظی، پیاز کے چھلکوں کی طرح اترتی چلی جاتی ہے، اور قرآن کی جن آیات کو، اپنی مطلب برآری کے لیے، انہوں نے مسخ و تحریف کا نشانہ بنایا ہے میں نے قرآنی حدود میں رہتے ہوئے دلائل کے ساتھ جائزہ لے کر، ان کی اصل حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بالحاظِ حجم، جناب پرویز صاحب کی کتاب ''نظامِ ربوبیت'' سے کم تر ہے لیکن بالحاظ دلائل برتر ہے۔

منکرینِ حدیث کے تمام گروہوں میں قدرِ مشترک...... ''نظامِ ربوبیت''

اب آخر میں یہ بات قارئینِ کرام کے ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ منکرینِ حدیث کے تمام گروہوں نے، قرآن کا معاشی نظام پیش کرنے میں، پرویز صاحب ہی کی تقلید کی ہے۔ ان سب کے دلائل و براہین، اور طرزِ استدلال ہو بہو وہی ہیں، جو پرویز صاحب کے اختیار کردہ ہیں۔ یہ تمام ٹولے، ایک دوسرے سے بعض امور میں اختلاف رکھتے ہوئے بھی، ''نظامِ ربوبیت'' پر متفق الخیال اور متحد الرائے ہیں، خواہ وہ لاہور میں، طلوع اسلام گلبرگ سے وابستہ ہوں، یا بلاغ القرآن سمن آباد سے۔ کراچی میں ادارہ فکرِ اسلامی سے تعلق رکھتے ہوں، یا کسی ''خیر خواہ بھائی'' سے۔ ان کی آواز، مجلہ صوت الحق کے ذریعہ لوگوں تک پہنچے یا کسی اور ذریعہ سے۔ چونکہ ان سب گروہوں کے مقتداء اور پیشوا، پرویز صاحب ہی ہیں جنہیں قدرت نے بڑی فیاضی سے قلمی صلاحیتوں سے نوازا ہے، اور وہ اپنے افکارِ باطلہ کو، جس خوبی سے پیش کر سکتے ہیں، دوسرے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کا معاشی نظام پیش کرنے میں، ان سب نے پرویز صاحب ہی کی اندھی تقلید کی ہے اور ہاتھی کے پاؤں میں سب نے اپنا پاؤں رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پرویز صاحب ہی کے دلائل (اور کتب) کو سامنے رکھ کر تردید و ابطال کا فریضہ انجام دیا ہے۔ کیونکہ ان کی تردید میں ان کے جملہ مقلدین و متبعین کا ابطال از خود شامل ہو جاتا ہے۔

باب اوّل

پرویز صاحب کا
''نظام ربوبیت'' اور مارکس کی اشتراکیت

''ہندو تھا، اور ہندو ہی رہا، لیکن بعض مصلحتوں کی بناء پر، اس نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ سب جاننے والے اس کی اس حرکت کا مذاق اڑاتے، اور اس سے کہتے کہ فقط نام کی تبدیلی سے رام داس، عبداللہ کیسے بن سکتا ہے، اور اس کا یہ فریب کب تک نبھ سکتا ہے، معلوم نہیں، اس تبدیلیٔ نام سے، رام داس نے اپنے آپ کو فریب دیا تھا، یا دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کی تھی، لیکن بات کچھ بھی ہو، تھی مبنی بر حماقت۔

لیکن اس قسم کی حرکت، کسی رام داس پر ہی موقوف نہیں، بڑے بڑے عالی دماغ مدبرین بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔'' [۱]

ان ہی ''عالی دماغ مدبرین'' میں ہمارے ''مفکر قرآن'' بھی شامل ہیں، جو اشتراکیت کو ''قرآنی نظام ربوبیت'' کا نام دے کر، اپنی مفکرانہ صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے ہیں۔ چنانچہ ''نظام ربوبیت'' کے نام سے، جو کچھ وہ پیش کرتے رہے ہیں، وہ دراصل اشتراکیت پر قرآنی ٹھپہ ہے، اور کبھی کبھی، خود، انہیں بھی اس امر کا احساس ہو جاتا تھا کہ ان کے پیش کردہ نظام ربوبیت پر یقیناً لوگوں کو اشتراکیت ہی کا گمان ہوگا۔ ایسی صورت میں، وہ بڑے جارحانہ انداز میں، پہلے تو ایسے افرا کو ''سطح بین لوگ'' قرار دیا کرتے تھے، اور پھر انہیں جہالت اور بے علمی کا یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ...... ''تم نہ تو قرآن ہی کو سمجھتے ہو، اور نہ

---

[۱] طلوع اسلام، جون ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲

اشتراکیت کو جانتے ہو، تم تو نرے جاہل ہو، بھلا علم کی ان باتوں سے تمہیں کیا سروکار؟''

''جو کچھ قرآن سے میں سمجھا ہوں، وہ یہی ہے کہ قرآن، کسی کے پاس فاضلہ دولت نہیں رہنے دیتا، اور وسائل پیداوار پر، خواہ وہ فطری ہوں یا مصنوعی، کسی کی ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا، خواہ ملکیت افراد کی ہو یا سٹیٹ کی۔ اس مقام پر اکثر سطح بین حضرات فوراً کہہ اٹھیں گے کہ...... یہ عجیب بات ہے کہ میں ایک طرف کمیونزم کو انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیتا ہوں، اور دوسری طرف، اسلام، جو وہی کچھ پیش کرتا ہے جسے اشتراکیت پیش کرتی ہے، نوع انسانی کے حق میں آبِ حیات تصور کرتا ہوں۔ بعض لوگ شاید اس سے بھی آگے بڑھیں اور کہیں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے، یہ اشتراکیت ہی ہے جس پر اسلام کا لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے، جیسا کہ آپ متنِ کتاب میں دیکھیں گے......اس قسم کی باتیں، ان لوگوں کی طرف سے پیش کی جاتی رہی ہیں جو نہ یہ جانتے ہیں کہ کمیونزم کیا ہے، اور نہ یہ کہ اسلام کیا ہے؟'' [1]

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، ماشاءاللہ، کمیونزم کو بھی جانتے ہیں اور اسلام کو بھی۔ کیونکہ وہ ایک مدت تک اس تحریک (کمیونزم) کا بڑی دقتِ نظر سے مطالعہ کرتے رہے ہیں، اس مطالعہ کا حاصل کیا ہے؟ خود اُن ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔

''اس مطالعہ کے بعد، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تحریک انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے، اس تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ اگر یہ نظام کہیں ساری دنیا پر مسلط ہو گیا، تو اس سے وہ کس عذاب الیم میں مبتلا ہو جائے گی۔'' [2]

''اگر محنت کش، نظام سرمایہ داری میں، اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا تو سوشلزم میں مجبور تر سمجھتا ہے، اور یہی چیز اس نظام کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ محنت کش

---

[1] نظام ربوبیت، تعارف، صفحہ ۲۳ [2] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۲

سے یہ کہنا کہ جو کچھ ہم تمہیں دیتے ہیں تمہیں اس پر کام کرنا ہوگا، طوعاً نہ کرو گے، تو کرھاً کام کروایا جائیگا اور تم اسے چھوڑ کر کہیں اور جا بھی نہیں سکتے، کیونکہ رزق کے تمام دروازوں پر، ہمارا ہی کنٹرول ہے، یہ ایک ایسا جہنم ہے جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔'' [۱]

سوشلزم کا نظام، نظام سرمایہ داری سے بھی زیادہ بدترین نتائج پیدا کرتا ہے، وہ اس طرح، کہ جب مختلف کارخانے (محنت گاہیں) مختلف مالکوں کے ہوں تو کم از کم مزدور کو یہ ذہنی اطمینان ضرور حاصل رہتا ہے کہ اگر اس کارخانہ میں حسب پسند کام اور اجرت نہ ملے گی تو کسی اور جگہ کام تلاش کرلوں گا، لیکن سوشلزم میں چونکہ تمام محنت گاہوں کا مالک ایک ہی ہوتا ہے، یعنی حکومت، اس لیے مزدور سے یہ ذہنی اطمینان بھی چھن جاتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو بے بس قیدی سمجھنے لگ جاتا ہے۔'' [۲]

''اس نظام (سوشلزم) میں محنت کش کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہوگئی ہے، پہلے اگر اس کی ایک مالک سے نہیں بنتی تھی، تو وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کی ملازمت اختیار کر لیتا تھا، اب چونکہ وسائلِ رزق پر کلی اجارہ داری، سٹیٹ کی ہوتی ہے، اس لیے وہ اس کا دروازہ چھوڑ کر، کہیں اور جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ملوکیت کی بدترین شکل ہے، یہی وہ جہنم ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ كُلَّمَا اَرَادُوا اَنْ يَّخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوا فِيْهَا (الحج:۲۲) جب وہ غم واندوہ کے اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے، اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے، تو انہیں پھر اس میں دھکیل دیا جائے گا۔'' [۳]

''پردہ اٹھا کر دیکھئے، تو اس کے پیکر میں سرمایہ داری ہی کی روح کارفرما نظر

---

[۱] نظام ربوبیت، صفحہ ۳۴۷ [۲] نظام ربوبیت، صفحہ ۳۴۶

[۳] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۱۱۷

آئے گی، فرق صرف اصطلاح کا ہوگا، نظام سرمایہ داری میں وسائل پیداوار، افراد کی ملکیت میں رہتے ہیں، سوشلزم میں یہ وسائل، افراد کے اس گروہ کے ہاتھ میں آجاتے ہیں، جو مملکت کے اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے، غریب محنت کش، ویسے کا ویسا ہی محتاج ومحکوم رہتا ہے، اسی حقیقت کے پیش نظر، اقبال نے کہا تھا کہ:

نظام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی[۱]

یہی بدترین نظام، قرآنی نظام کے مماثل بھی ہے:

اشتراکیت کے اس نظام کو، غم واندوہ کا عذاب''، ''جہنم کا نمونہ''، ''ملوکیت کی بدترین شکل'' اور نہ جانے کیا کیا کچھ قرار دینے کے بعد، یہ بھی فرماتے ہیں کہ

''جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مماثل ہے۔'' [۲]

''دوسری طرف کمیونزم ہے جسکا نظام تو قرآنی نظام کے مماثل ہے، لیکن اس کا فلسفۂ زندگی اسلامی فلسفہ کی نقیض ہے۔'' [۳]

''سوشلزم کا معاشی نظام، تو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے، لیکن سوشلزم کا فلسفہ، قرآنی فلسفۂ حیات سے، نہ صرف مختلف ہے، بلکہ اس کی ضد ہے۔'' [۴]

لیکن یہی نظام، آیۂ رحمت بھی ہے!

اشتراکی نظام معیشت پر قرآنی مماثلت کا لیبل چسپاں کر دینے کے بعد، ''مفکر قرآن'' یہ اعلان بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''غم واندوہ کا یہ عذاب''، ''جہنم کا یہ نمونہ''، اور ''ملوکیت کی بدترین شکل'' کا حامل کمیونزم، انسانیت کے لیے آیۂ رحمت بھی ہے۔

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۱، صفحہ ۱۱۷
[۲] نظام ربوبیت، صفحہ ۳۵۸
[۳] نظام ربوبیت، صفحہ ۴۰۶
[۴] طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۷

''اس وقت، کمیونزم کی طرف سے، دنیا کے سامنے، اس کا معاشی نظام پیش کیا جا رہا ہے، اس کا فلسفہ نہیں۔ اس نظام کے متعلق بدلائل وشواہد بتایا جا رہا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں، انسانیت کے لیے آیۂ رحمت ہے، اور یہ واقعہ بھی ہے۔'' [1]

سبحان اللہ! کیا کہنے مفکر قرآن کی اس تضاد بیانی کے، کہ، انسانیت کے لیے کمیونزم کا معاشی نظام، ''آیۂ رحمت'' بھی ہے، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ...... ''یہ تحریک، انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے، اس تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ اگر یہ نظام کہیں ساری دنیا پر مسلط ہو گیا، تو اس سے وہ، کس عذاب الیم میں مبتلا ہو جائے گی'' ......

''مفکر قرآن'' کی تضاد گوئی کے سلسلہ میں، یہ ستم ظریفی بھی قابل داد ہے کہ ایک ہی کتاب...... نظام ربوبیت...... کے دو مختلف مقامات پر، وہ کمیونزم کے متعلق، متضاد اور متناقض آراء پیش کرتے ہیں، ''غم واندوہ کا عذاب'' بھی، اور ''آیۂ رحمت'' بھی۔

بدترین نظام - اشتراکیت یا سرمایہ داری؟

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے بڑی دقت نظر سے کمیونزم کا مطالعہ کیا ہے، سوال یہ ہے کہ کیپٹلزم اور کمیونزم میں سے کونسا نظام، بدتر نظام ہے؟ وہ فرماتے ہیں:

''اس نظام کے متعلق بدلائل وشواہد بتایا جا رہا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں آیۂ رحمت ہے اور یہ واقعہ بھی ہے۔'' [2]

یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی نسبت، کمیونزم، نہ صرف یہ کہ بہتر ہے بلکہ آیۂ رحمت بھی ہے، لیکن اس کے برعکس، ''مفکر قرآن'' کے یہ فرمودات بھی ملاحظہ فرمایئے:

''سوشلزم، نظام سرمایہ داری سے بھی بدتر نتائج پیدا کرتا ہے۔'' [3]

''سوشلزم، نظام سرمایہ داری سے بھی بدتر قرار دیا جاتا ہے۔'' [4]

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۳۹۸
[2] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۸
[3] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۱
[4] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۰

اور کبھی، کیپٹلزم اور کمیونزم، دونوں کے متعلق ''مفکر قرآن'' یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

''روس کی ڈکٹیٹر شپ اور اشتراکیت ہو، یا یورپ کی جمہوریت اور نظام سرمایہ داری، دونوں باطل اور اسلام کے لیے یکساں خطرہ کا موجب ہیں، یہ دونوں درحقیقت، مغرب کے اس مادی تصور حیات کی شاخیں ہیں جسے اقبال کی اصطلاح میں ''تہذیبِ فرنگ'' کہا جاتا ہے، اور جو اسلام کے یکسر نقیض ہے، اس لیے ان دونوں میں سے ایک کو اسلام کے لیے خطرہ، اور دوسرے کو اسلام کے لیے آیۂ رحمت سمجھنا، حقیقت سے چشم پوشی ہے۔'' [۱]

لیجیے، پہلے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت میں سے، اشتراکیت، آیۂ رحمت تھی، مگر اس اقتباس کی رو سے، دونوں میں سے کوئی نظام بھی ''آیۂ رحمت'' نہ رہا، بلکہ اب دونوں ہی قزاق قرار پا گئے۔

''مشرق و مغرب کے سرمایہ دار ہوں یا کمیونزم اور سوشلزم کے علمبردار، قرآن کریم کی رو سے دونوں قزاق ہیں کہ دونوں کا پیشہ سفاکی ہے۔'' [۲]

ان متضاد آراء پر ہم حیران ہیں کہ:

کس کا یقیں کیجیے ، کس کا یقیں نہ کیجیے
لائے ہیں بزم ناز سے لوگ ، خبر الگ الگ

تضاد گو شخص کی ذہنی کیفیت:

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص، ایسا تصور اپنا لیتا ہے جو خلافِ حق ہو، مگر اپنے باطل تصور کو باطل نہ کہنے پر بھی مجبور ہو، اور حقیقت کا اعتراف بھی، اس سے بن نہ پڑتا ہو، تو وہ حق و باطل کے درمیان یوں معلق رہتا ہے کہ کبھی ایک طرف جھکتا ہے اور کبھی دوسری طرف پلٹتا ہے، اور پھر وہ مختلف اور متضاد سمتوں میں اپنے جھکاؤ کے دوران، اس خوش فہمی، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں، اس خود فریبی یا فریب دہی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کا قدم، راہِ راست پر ہی ہے، اور پھر جب وہ اس راہِ راست کا داعی بننے کا ڈھونگ بھی رچائے ہوئے ہو، تو پھر اسے

---

[۱] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲ [۲] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۹

ہر گام پر ذہنی بازی (Mental Gymnasium) کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، طرح طرح کی سخنسازیوں سے کام چلانا پڑتا ہے، قدم قدم پر ضمیر سے لڑ بھڑ کر، کبھی کوئی بات کہنی پڑتی ہے اور کبھی کوئی۔ اس طرح اس کی پوری زندگی تضادات و تناقضات کا پلندہ بن کر رہ جاتی ہے، ٹھیک یہی معاملہ ''مفکر قرآن'' کا بھی ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ، کہیں کچھ، کہیں کچھ، یہاں کچھ، وہاں کچھ، اور ''مفکر قرآن'' کے اندھے مقلد یہ کہتے نہیں تھکتے کہ:

''پرویز صاحب کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ، نہ کبھی پرانی ہوتی ہیں، اور نہ ہی ان میں کبھی تضاد واقع ہوتا ہے۔'' [۱]

وہ ''مفکر قرآن'' جس کا پورا لٹریچر، تضادات سے اٹا پڑا ہے، کس قدر خوش قسمت ہے کہ اسے عقیدت مندوں کا ایسا ٹولہ میسر ہو گیا، جو اس کے تضادات سے آنکھیں بند کر کے، یہ راگ الاپتا رہتا ہے کہ:

''طلوع اسلام کا قوم پر، جو سب سے بڑا احسان ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دیا ہے۔'' [۲]

نظام معیشت اور فلسفہ معیشت:

نظام زندگی اور فلسفۂ زندگی یا نظام معیشت اور فلسفۂ معیشت پر ''مفکر قرآن'' کی تحریریں، تضادات کی ایک اور جولانگاہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کے تجویز کردہ معاشی نظام سے مماثل ہے۔'' [۳]

''دوسری طرف کمیونزم ہے جس کا معاشی نظام، قرآنی نظام کے مماثل ہے، لیکن فلسفۂ حیات، قرآنی فلسفۂ زندگی کی نقیض ہے۔'' [۴]

سوال یہ ہے کہ اشتراکیت کا معاشی نظام، یقیناً، اشتراکیت ہی کے فلسفۂ زندگی پر

---

[۱] طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۳ء، صفحہ ۲۶
[۲] طلوع اسلام، جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۱۸
[۳] نظام ربوبیت، صفحہ ۳۵۸
[۴] نظام ربوبیت، صفحہ ۴۰۶

استوار ہے، کیا اس نظام حیات کو اس کے فلسفۂ حیات سے منقطع کیا جا سکتا ہے؟ ''مفکر قرآن'' صاحب، جواباً فرماتے ہیں کہ

''جس طرح قرآن، اپنے نظام کو فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی، اپنے معاشی نظام کو، اپنے فلسفۂ زندگی سے جُدا نہیں کرتی۔ کمیونسٹ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات، اور اس پر متفرع معاشی نظام کو، ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔'' [1]

''مفکر قرآن'' کی یہ عبارت، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ نہ تو قرآن، اپنے فلسفۂ حیات اور اپنے معاشی نظام میں انقطاع کا روادار ہے، اور نہ ہی کمیونزم اپنے فلسفۂ زندگی اور معاشی نظام میں افتراق کی قائل ہے، دونوں نظامہائے حیات میں سے، کسی میں بھی فلسفۂ زندگی کو، اس کے نظم معیشت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام اور اشتراکیت، ہر دو نظامہائے حیات میں فلسفۂ فکر اور نظامِ عمل، لاینفک ہیں......لیکن......اس کھلے اعترافِ حقیقت کے بعد بھی، ہمارے ''مفکر قرآن'' چاہتے یہ تھے کہ چین کے اقتصادی نظام کو، اس کے فلسفۂ زندگی سے جدا کر کے ''قرآنی بنیاد'' پر کھڑا کر دیں۔

''چین کا معاشی نظام بالشوزم ہے، اگر ہم اس نظام کو وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کر لیں، تو یہ نظام، ہمارے دینی تقاضا کو پورا کر دیتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کو، اپنے نظام کے لیے محکم بنیاد نہیں ملی۔'' [2]

سوال یہ ہے کہ بالشوزم اور کمیونزم کا معاشی نظام، اگر اپنے فلسفۂ حیات کے ساتھ مل کر، ایک ناقابل تقسیم وحدت قرار پاتا ہے، تو آپ صرف، اس کے معاشی نظام کو، اس کے فلسفۂ زندگی سے جدا کر کے، قرآنی بنیادوں پر استوار کیسے کر سکتے ہیں؟ کیونکہ......''جس طرح قرآن، اپنے نظام کو فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی، اپنے معاشی نظام کو، اپنے فلسفۂ زندگی سے جدا نہیں کرتی''......

---

[1] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۶۶ [2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۵ء، صفحہ ۷۵

پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کی عمارت کا نقشہ، مقصد، رخ، ڈیزائن وغیرہ، سب کچھ، پہلے ہی اشتراکی نقطۂ نظر سے طے شدہ ہے، اب اگر آپ، اس عمارت کی بنیاد میں واقع، فکر و فلسفہ کی اینٹوں کو، ایک ایک کر کے نکال کر، اس کی جگہ، اسلامی فلسفۂ حیات کی اینٹیں رکھ دیں، تو یہ عمارت، جو پہلے ہی غیر اسلامی بنیادوں پر ایستادہ ہو چکی ہے، اب اسلامی عمارت میں کیسے تبدیل ہو جائے گی؟ کیا اس کی بنیادوں میں، اب رکھی جانے والی اینٹوں سے، عمارت کا رخ، نقشہ، مقصد اور ڈیزائن بھی بدل جائے گا؟ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' تھے کہ اشتراکیت کے ساتھ، ساری عمر، عقائد اسلام (یا بقولِ طلوع اسلام، وحی کی مستقل اقدار) کا ضمیمہ نتھی کر کے، اسے مشرف بہ اسلام کرنے پر تُلے رہتے تھے، کوئی ذی شعور مسلمان، اس کے لیے تیار نہ ہوگا کہ وہ ...... اشتراکیت + خدا = اسلام...... جیسی مساوات کی آڑ میں کفر و اسلام کا ملغوبہ تیار کرے۔

جب ایک مرتبہ کوئی شخص، اصل پٹڑی سے اکھڑ جاتا ہے تو وہ راہِ راست سے بعید سے بعید تر ہوتا چلا جاتا ہے، اور وہ اپنی راست روی کے زعم میں ایسا عذرِ گناہ پیش کرتا ہے جو بجائے خود گناہ سے بھی بدتر ہوتا ہے، ٹھیک یہی حالت، ہمارے ''مفکر قرآن'' کی تھی، وہ اشتراکیت اور اسلام، ہر دو میں، ان کے فلسفۂ حیات اور ان کے معاشی نظام میں ائتلاف و تلازم کے قائل تھے، لیکن پھر وہ اشتراکیت کی زلفِ گرہ گیر میں ایسے اسیر ہوئے، کہ حریم اسلام میں، اشتراکیت کے بچھڑے کو داخل کرنے کے لیے، سامری سے بھی چار قدم آگے نکل گئے، اور کمیونزم کے فلسفۂ حیات سے، اس کے معاشی نظام کو جدا کر کے، قرآنی اقدار پر استوار کرنے میں جت گئے، اور بات یہاں تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ وہ اساسِ اسلام پر کلہاڑا چلا کر، اور اس کی عمارتِ معیشت کو بنیادوں سے اکھاڑ کر، اشتراکیت کے حضور، بطور نذرانہ پیش کرنے پر اُتر آئے اور یہ دعویٰ کر دیا کہ اشتراکیت نے تو معاشی نظام لیا ہی اسلام سے ہے۔

''قرآن کا معاشی نظام اور کمیونزم کا معاشی نظام، ایک ہی ہے یا ان دونوں

میں مماثلت ہے، تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ دنیا کی کسی قوم نے اسلام کے معاشی نظام کو اپنایا ہے، قرآن کریم نے یہ نظام چودہ سو سال پہلے دیا تھا اور کمیونزم کا نظام بیسویں صدی کی پیداوار ہے، اس لیے یہی کہا جائے گا کہ کمیونزم نے یہ نظام، اسلام سے لیا ہے، نہ کہ اسلام، اس نظام کو کمیونزم سے مستعار لے رہا ہے۔'' [1]

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن، اپنے نظام حیات کو فلسفۂ زندگی سے الگ نہیں کرتا، تو کمیونزم نے ''قرآنی نظام معیشت'' کی عمارت کو، اسلام کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں سے اکھاڑ کر الگ کسطرح کرلیا؟ پھر کیا یہ اشتراکی، ایسے ہی نادان، بے سمجھ اور مغفل تھے کہ انہیں اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ جس معاشی عمارت کو وہ قبول کر رہے ہیں، وہ تو پہلے ہی، اپنے نظریۂ حیات کی روشنی میں، اپنے رُخ، نقشہ، مقصد اور ڈیزائن کے لحاظ سے ایک مخصوص عمارت ہے، جو ایک خاص فکر و فلسفہ اور نظام عمل ہی کی بنیاد پر، برقرار رہ سکتی ہے، اس عمارت کو، کسی دوسرے فلسفۂ زندگی پر استوار کیا ہی نہیں جا سکتا بالخصوص، جبکہ یہ دوسرا فلسفۂ زندگی، پہلے فلسفۂ حیات کی نقیض واقع ہو۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اشتراکیت میں، نہ صرف یہ کہ فلسفہ وفکر کے اعتبار سے بونِ بعید واقع ہے بلکہ عملی نظام حیات میں بھی بُعد المشرقین ہے۔ اشتراکیت کا اپنا فلسفہ ہے اور اسی فلسفہ پر مبنی، اس کا اپنا معاشی نظام ہے، جو بنیاد سے لے کر عمارت کی انتہائی منزل تک میں، دوسروں سے ممتاز و متمیز ہے، اشتراکیت کی یہ پوری عمارت، از اول تا آخر، مارکس ہی کے فلسفۂ حیات، اور اُسی ہی کے فلسفہ پر، متفرع معاشی نظام پر مشتمل ہے، اس معاشی نظام کو، مارکسی فلسفۂ حیات سے جدا کر کے، اسلامی فلسفہ پر قائم کیا ہی نہیں جا سکتا، اور نہ ہی اسلام کے نظام معیشت کو، اسلامی فلسفۂ حیات کی اساس سے منفک کر کے، اسے کمیونزم کے فلسفۂ حیات پر استوار کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۸

''جس طرح اسلام کے معاشی نظام کو، اس کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کمیونزم (یا سوشلزم) کے معاشی نظام کو اس کے نظریۂ زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا، جس طرح مسلمان ہونے کے لیے سب سے پہلے، اسلام کے فلسفۂ حیات پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح کمیونسٹ ہونے کے لیے، کمیونزم کے نظریۂ زندگی کا ماننا لاینفک ہے، اور جس طرح کوئی شخص، محض اسلام کے نظام کو صحیح سمجھ کر مسلمان نہیں ہوسکتا، اسی طرح کوئی شخص، محض کمیونزم کے معاشی نظام کو تسلیم کرنے سے کمیونسٹ نہیں کہلا سکتا، اسلام اور کمیونزم، دونوں میں، ان کے معاشی نظام کو، ان کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

''جیسا کہ معلوم ہے، کمیونزم کا بانی کارل مارکس تھا، وہ محض ایک ماہر معاشیات نہیں تھا بلکہ اس کا شمار فلاسفرز کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا، اور پھر اسی فلسفہ کی بنیادوں پر، ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے، لہٰذا کمیونزم اور سوشلزم سے مراد ہے کارل مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔''[1]

عمارتِ اسلام کی بنیاد جس فکر پر قائم ہے وہ وحی کی عطا کردہ ہے، اور اس پر کردار و عمل کی جو منزلیں تعمیر ہوئی ہیں، ان کا نقشہ، رخ اور مقصد بھی وحی ہی نے متعین کیا ہے، اس کے برعکس، کمیونزم کی بنیاد، مارکس کے پیش کردہ فلسفہ پر ہے، اور اس پر متفرع نظام بھی، مارکس ہی کا تشکیل کردہ ہے، دونوں میں فکر و عمل کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو اشتراکیت کے بانی ہی نے، اسلامی فلسفۂ حیات سے، اسلام کا معاشی نظام جدا کر کے، اُسے اپنے فلسفۂ زندگی پر قائم کیا ہے (جیسا کہ ''مفکر قرآن'' کا گمان ہے اور وہ

---

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۰ء، صفحہ ۴۳

اس پر خوش ہو رہے ہیں کہ کسی قوم نے ، اسلام کے معاشی نظام کو اپنایا ہے)، اور نہ ہی کمیونزم کے معاشی نظام کو(جو فکر مارکس کا ساختہ و پرداختہ ہے) لے کر اسے اساسِ اسلام پر استوار کیا جا سکتا ہے(جیسا کہ ''مفکر قرآن'' کی خواہش رہی ہے)۔ دونوں نظامِ حیات ، جن مخالف بلکہ متضاد فلسفۂ حیات پر استوار ہیں، انہیں اس سے جدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک نظام ، خالق کائنات کا تشکیل کردہ ہے جبکہ دوسرا نظام کارل مارکس جیسے یہودی کا اختراع شدہ ہے، اس لیے خدائی اور انسانی نظام میں سے، ہر ایک کو، اس کی فکری بنیادوں سے جدا کر کے، اسے کسی دوسرے نظام معیشت کے ساتھ، استوار کرنا، کفر و اسلام کا ملغوبہ تیار کرنا ہے۔ اشتراکی نظام معیشت کو، حریم اسلامی میں داخل کرنا، بتوں کو داخلِ کعبہ کرنے کے مترادف ہے، جس طرح بت ، کعبے میں داخل ہو کر بھی ، پتھر کے پتھر ہی رہتے ہیں، خدا نہیں بن جاتے ، بالکل اسی طرح، اشتراکی نظام معیشت کی بنیادوں سے، اشتراکی فلسفہ کی اینٹوں کو نکال کر، ان میں اسلامی عقائد کی اینٹیں جما دینے سے، کمیونزم مشرف بہ اسلام نہیں ہو جاتی، لہٰذا ''رام داس'' جو اصلاً ہندو تھا، وہ ہندو ہی رہے گا، محض نام کی تبدیلی سے، ''رام داس'' سے وہ عبداللہ نہیں بن سکتا۔ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' تھے کہ یہ راگ الاپتے نہیں تھکتے تھے کہ...... ''اسلام اور اشتراکیت کا نظام معیشت ، باہم متماثل ہیں، اس لیے کارل مارکس کی تشکیل کردہ اشتراکیت سے، اُس کا معاشی نظام لے کر، اگر قرآنی اقدار پر استوار کر لیا جائے، تو یہ ''پیوندکاری'' ہمارے دینی تقاضا کو پورا کر دے گی'' ......

؎ بسوخت عقل زحیرت ایں چہ بوالعجبی است

''مفکر قرآن'' کے تضاد کا ایک اور گوشہ:

پرویز صاحب، اپنا ایک فلسفہ بعنوان...... ''کائناتی رفتار'' ...... بایں الفاظ پیش کرتے ہیں، یاد رہے کہ ان کا یہ فلسفہ، ان کے مخصوص حلقے میں، ان کی فلسفیانہ بلند پروازی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

''قرآن میں ہے کہ ابدی اصول اور مستقل اقدار، انسان کی راہنمائی کے لیے

، منجانب اللہ عطا ہوئے ہیں ، ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ راستے کے موانعات کو ہٹاتے ہوئے ، آگے بڑھیں ، اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں ، سورہ فاطر میں ہے: اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ (۳۵/۱۰) ان نظریات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کو اٹھتے ہوئے ، عروج و ارتقاء کی اس منزل تک پہنچ جائیں جسے اُن کے لیے متعین کیا گیا ہے، ان نظریات کو، قرآن نے الحق کہہ کر پکارا ہے ، اور ان موانعات کو، جو اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ باطل سے تعبیر کرتا ہے، اور اس کشمکشِ حق و باطل کے متعلق کہتا ہے کہ بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ فَیَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) الحق ، باطل پر اپنا نشانہ لگاتا رہتا ہے تا آنکہ باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ،قرآن ، کہتا ہے کہ اس طرح باطل کی شکست اور حق کی فتح......یا یوں کہئے کہ......ان نظریات کے، اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کی رفتار، بڑی سست ہوتی ہے، یَعۡرُجُ اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (۳۲/۵) ان کی اسی رفتار کا ایک ایک دن، تمہارے حساب وشمار کی رو سے، ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے، اسے آپ انسانی تاریخ کی رفتار کہہ لیجیے، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی کوئی جماعت، اِن نظریات کو، اپنی زندگی میں عملاً رائج کر لے، تو پھر ان کے نتائج ، انسانی حساب وشمار کے مطابق، دنوں میں مرتب ہو جاتے ہیں، چنانچہ جہاں اس نے یہ کہا ہے کہ اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ (ان نظریات میں، از خود، ابھرنے کی صلاحیت موجود ہے) ، اس کے بعد کہا ہے کہ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ (۳۵/۱۰) انسانی اعمال صالحہ کی قوت، انہیں نہایت تیزی سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ [1]

---

[1] طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۲ تا صفحہ ۲۳

حق و باطل کی اس کشمکش میں، کاروانِ تاریخ آگے بڑھتا ہوا، اسلام کے صدر اول میں داخل ہوتا ہے، تو پرویز صاحب، اسے یوں بیان فرماتے ہیں۔

''انسان، تنہا عقل کی رو سے، زندگی کے طول طویل راستوں پر، تنہا چلا آ رہا تھا، اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، ٹھوکریں کھاتا، ہڈیاں تڑواتا۔ کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، قندیل وحی نے، ان راستوں کو روشن کر دیا، عرب میں بسنے والی قوم نے، اس کے عطا کردہ نظریاتِ حیات کو اپنایا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی، اس کے بعد، اس قوم نے وحی کی رہنمائی کو چھوڑ دیا، اور کاروانِ انسانیت پر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہِ حیات پر گامزن ہو گیا، اب اس کی رفتار پھر سست ہو گئی، رفتار تو بیشک سست ہو گئی، لیکن اس کا ہر قدم اٹھتا اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جسطرف اسے وحی کی روشنی لے جا رہی تھی۔''[1]

عہد اسلام کے بعد، تقریباً تیرہ صدیوں تک کائناتی رفتار سست رہی، پھر بقول پرویز صاحب، یکا یک اضافہ ہو گیا، کیوں؟ کیا عہد رسالتماب کا اسلام پھر لوٹ آیا؟ یا خلافت راشدہ کا دورِ ''الحق'' واپس آ گیا؟ یا ختم نبوت کا ''عبوری دور'' ختم ہونے کے بعد، کوئی نیا پیغمبر، از سر نو ''مستقل اقدار'' کی وحی لیکر آ گیا؟ نہیں، بالکل نہیں، بلکہ کارل مارکس نامی یہودی کی فلسفیانہ فکر پر متفرع نظام اشراکیت کا ''الحق'' روس اور چین میں جلوہ افروز ہو گیا، اور اس طرح کاروانِ انسانیت کی شاہراہِ حیات پر، سست روی میں یکا یک تیزی پیدا ہو گئی۔

''یہ ٹھیک ہے کہ پہلے روس اور اس کے بعد چین کی ان انقلابی جماعتوں نے، کائناتی قانون کی تائید کے لیے ہاتھ اٹھا کر، اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے۔''[2]

کائناتی قانون کی رفتار میں، یہ تیزی، اس روسی نظام کی بدولت ہوئی ہے، جسکے متعلق، ''مفکر قرآن'' نے بڑی دقّتِ نظر کے ساتھ، مطالعہ کرنے کے بعد، یہ فرمایا ہے کہ

---

[1] طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۴ [2] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۶۴

''یہ تحریک، انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے، اس تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ اگر یہ نظام، کہیں ساری دنیا پر مسلّط ہو گیا، تو اس سے وہ کس عذاب الیم میں مبتلا ہو جائے گی۔'' [1]

ایک اہم سوال:

قطع نظر اس کے، کہ قرآن کے متفرق مقامات پر واقع آیات کے ٹکڑوں کو جوڑ جاڑ کر، ''مفکر قرآن'' نے ''کائناتی رفتار'' کے جس فلسفہ کو گھڑا ہے، وہ میزانِ صحت میں کوئی وزن رکھتا بھی ہے یا نہیں، یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ:

''اگر ایک نظام، اپنے ظاہری ڈھانچے کے اعتبار سے درست ہو مگر اس کی روح قطعی باطل ہو، تو کیا ظاہری ڈھانچے کی یہ درستگی، اپنی رگ رگ میں رچی بسی روحِ باطل کے باوجود، کائناتی رفتار میں اضافہ کر دے گی؟ بالفاظِ دیگر، ایک ہے فلسفۂ حیات اور دوسرا ہے اس پر قائم ہونے والا نظام۔ پہلی چیز بنیاد ہے اور دوسری اُس پر قائم ہونے والی عمارت ہے۔ اشتراکیت میں پہلی چیز باطل ہے، اور دوسری چیز یعنی اس پر متفرع معاشی نظام (بقول پرویز) حق ہے، سوال یہ ہے کہ کائناتی رفتار کو تیز کرنے والی چیز، خالص اور بے آمیز حق ہے؟ یا حق و باطل کا وہ مخلوطہ، جسکے متعلق ''مفکر قرآن'' مرتے دم تک یہ رٹ لگاتے رہے کہ...... ''دوسری طرف، کمیونزم ہے جس کا نظام، تو قرآنی نظام کے مماثل ہے، لیکن اس کا فلسفۂ حیات، قرآنی فلسفۂ زندگی کی نقیض ہے'' ......

ہمارے نزدیک، تو نہ صرف، اشتراکیت کا فلسفۂ حیات، بلکہ اس پر متفرع معاشی نظام بھی، اسلام اور قرآنی تعلیمات سے مکمل منافات رکھتا ہے، لیکن، بالفرض محال، اگر اشتراکی نظام معیشت کو، مطابق قرآن مان بھی لیا جائے، تو کیا جس فلسفۂ حیات پر، یہ استوار ہے، اس کی موجودگی میں، یہ نظام، انسانیت کے لیے سود مند ہو سکتا ہے؟ اعمال کا ڈھانچہ،

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۲

اگر درست بھی ہو، تو کیا اس میں موجود، روحِ باطل ، اعمال کی ظاہری شکلوں کو، واقعتاً ، اعمالِ صالحہ رہنے دے گی؟ رسمِ اذان میں، اگر روحِ بلالی، مفقود بھی ہو تو کیا تب بھی، یہ اُس اذان کی قائم مقام اور مماثل ہوسکتی ہے جس سے شبستانِ ظلمت کا وجود لرز اٹھے؟

ہم تو ساری عمر یہی سنتے رہے ہیں کہ اگر اعمال صالحہ میں سے روحِ ایمان نکل جائے، تو یہ اعمال، بیکار محض ہوتے ہیں، ان میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

رگوں میں ، وہ لہو باقی نہیں ہے　　　وہ دل ، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج؟　　　یہ سب باقی ہیں ، تو باقی نہیں ہے

لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں ، اور ایک قدم آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ...... ''اگر کوئی نظامِ عمل ، اپنی اصلی روح سے محروم بھی ہو، بلکہ اس میں روحِ باطل سرایت بھی کیے ہوئے ہو، تو پھر بھی وہ کائناتی رفتار میں اضافے کا موجب بن جاتا ہے، دیکھتے نہیں ہو کہ کارل مارکس کے مخترعہ فلسفۂ حیات پر متفرع، انسانی ہاتھوں کا تراشا ہوا اقتصادی نظام، جب روس اور چین میں جلوہ افروز ہوا، تو شاہراہِ حیات پر، کاروانِ انسانیت کی سست روی، یکدم تیز گامی میں بدل گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' مغرب کی ذہنی اسیری اور فکری غلامی میں بری طرح مبتلا رہے ہیں، وہ معیشت کا پورا نظام، قرآن کے نام پر، اشتراکیت سے درآمد کرتے ہیں، اور اس کا نام رکھتے ہیں ''نظامِ ربوبیت۔'' مغربی معاشرت کے جملہ عناصر ، مثلاً مخلوط سوسائٹی کا تصور، مخلوط تعلیم کا رواج، ترکِ حجاب، مرد و زن کی مطلق اور کامل مساوات، تعدد ازواج کو معیوب قرار دینا، عورت کا چراغ خانہ بن کر رہنے کی بجائے، اسے شمع محفل بننے پر اکسانا، نیز، اُسے درونِ خانہ فرائض نسواں کی بجائے، بیرونِ خانہ مردانہ مشاغل میں منہمک کرنا، وغیرہ، تہذیب مغرب سے لیتے ہیں، اور اسے ''قرآنی معاشرت'' کا نام دیتے ہیں، مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا ہو کر، جب وہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں ، تو انہیں ، اس بات کی فکر نہیں ہوتی ، کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ

اہل مغرب، اس بارے میں کیا کہیں گے، چنانچہ قرآن کو چھیل چھال کر، جب وہ مطابق مغرب کر ڈالتے ہیں، تو مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ''خدا کی کتاب، اب، دورحاضر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہوگئی ہے، اب یہ تاریک دور کی کتاب نہیں رہی۔'' وہ فکری سرمایہ تو تہذیب مغرب سے لیتے ہیں، لیکن اسے پیش کرنے کے لیے، وہ مغرب کی اصطلاحوں کی بجائے، اپنی خود ساختہ اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں، اشتراکی حضرات، جس چیز کو تاریخی وجوب (Historical Necessity) کی قوت کہتے ہیں، اسے ''مفکر قرآن''، زمانے کے تقاضے کہتے ہیں، روسی، جسے سوشلزم یا کمیونزم کہتے ہیں، وہ، اسے ''نظامِ ربوبیت'' کا نام دیتے ہیں، اشتراکیت کے علمبردار، جسے ''مادی جدلیت'' کہتے ہیں، وہ، جب ''مفکر قرآن'' کے ہاں پہنچتی ہے تو ''حق و باطل کی کشمکش'' کا خوش آیند لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔

غلام ذہن کا کرشمہ:

''مفکر قرآن'' کا وہ اقتباس، پہلے گزر چکا ہے، جس میں انہوں نے اشتراکیت کے فلسفۂ زندگی اور اس کے معاشی نظام کو، کارل مارکس کی اختراع قرار دیا تھا (ملاحظہ ہو، طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۰ء، صفحہ ۴۳)۔ اس کے بعد، اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ کارل مارکس ہو یا اینجلز، ماؤزے تنگ ہو، یا لینن، ان سب کا پیش کردہ معاشی نظام، اگرچہ، بقول پرویز، قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے، مگر ان کا فلسفۂ حیات، قرآنی فلسفۂ زندگی کا نقیض ہے، آخر فلسفۂ زندگی اور نظامِ عمل میں یہ بنیادی اختلاف کیوں واقع ہوا؟ ''مفکر قرآن'' نے کارل مارکس کے متعلق، اس حقیقت کو بایں الفاظ واضح کیا ہے۔

> ''مارکس کے سینے میں قلب حساس تھا جو مظلوم و مقہور انسانوں کی حرماں نصیبی پر......جن پر بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں نے رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے......خون کے آنسو روتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح، ان کے دکھ دور ہو جائیں، وحی کی حقیقی روشنی (قرآنی تعلیم) اس کے سامنے نہیں تھی، اس کے

سامنے عیسائیت تھی، جو لفظاً انسانیت کے دکھوں پر آنسو بہانے کی مدعی ہونے کے باوجود، عملاً اس نقشہ کو قائم رکھنے کا موجب تھی جس سے تمام دکھ وجود میں آتے ہیں، جب آپ خدا پرستی کے لیے دنیا کو تیاگ دینے اور اسے قابل نفرت سمجھنے کو اولین شرط قرار دیں، اور مظلوموں کے دکھ دور کرنے کے لیے، عدل کی بجائے رحم کی بھیک مانگیں، تو مستبد قوتیں دندناتی پھریں گی، انہیں ظلم و ستم سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا، مارکس نے اس حقیقتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان چیرہ دستیوں کا بنیادی سبب، مذہب کا تصور ہے، اس لیے اُس نے مذہب کو انسانیت کا اولین دشمن قرار دیا، اگر اس کے سامنے مذہب کی بجائے دین (قرآنی کریم) ہوتا، تو وہ کبھی اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔'' [1]

یہ اقتباس، اس امر کو واضح کرتا ہے کہ کارل مارکس کے سامنے قرآن نہیں تھا، اسی طرح، روس میں، لینن کے سامنے بھی سچے خدا کا تصور نہ تھا، جس سے وہ بھی اسی صورتحال سے دوچار ہوکر، اسی ردعمل کا شکار ہوا جسے کارل مارکس کے متعلق، اقتباسِ بالا میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔

''روس میں بھی اسی عیسائیت کا دور دورہ تھا، اس لیے لینن بھی خدا کے متعلق، اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا تصور، مفاد پرستوں کا پیدا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ جب خدا پر ایمان نہ رہے تو انسانی ذات، وحی، حیاتِ آخرت پر ایمان، خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔'' [2]

مارکس اور لینن کی طرح، چین کے ماؤزے تنگ کے سامنے بھی قرآن اور دین نہ تھا، لہٰذا اسکا ردعمل بھی وہی تھا جو اقتباساتِ بالا سے ظاہر کیا گیا ہے۔

''چین میں مذہب کے سلسلہ میں، حالات اس سے بھی بدتر تھے، وہاں ایک چھوڑ، تین تین مذاہب مروج تھے، اور تینوں کے تینوں توہم پرستی کے مظاہر۔

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۴۰۳ [2] نظام ربوبیت، صفحہ ۴۰۳ + طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۶۳

کنفیوشس ازم کی تعلیم خالصتاً اسلاف پرستی تھی جس میں جمود و تقلید سب سے بڑی نیکی ، اور تغیر و اصلاح کا تصور ، سب سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا تھا (بعینہ اس طرح ، جس طرح مذہبی پیشوائیت ، تقلید کو عین دین بنا کر پیش کرتی اور ہر تغیر اور جدّت کو جہنم کے عذاب کا مستوجب قرار دیتی ہے) ، طاؤازم ، گیان دھیان میں مست رہ کر دنیا تیاگ دینے کی تعلیم دیتا تھا ، بدھ مت ، اس سے بھی چار قدم آگے تھا ، اس میں منتہاءِ زندگی ، نروان حاصل کرنا ہے جس سے مراد ، آپنے آپ کو قاطبۃً فنا کر دینا ہوتا ہے ، ماؤزے تنگ کے سامنے ، یہ مذاہب تھے ، اس لیے اس کا ردعمل بھی ظاہر ہے ، اس نے فکری طور پر ، ہیگل بلکہ کارل مارکس سے بھی اختلاف کیا ، لیکن مذہب کے خلاف ، اس کی شدت ، ان سے بھی زیادہ بڑھ گئی ۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا ، اتنا بڑا انقلابی ذہن ، جمود و تعطل کے اس جذام کو کیسے گوارا کر لیتا ؟ لیکن چونکہ دین ، اس کے بھی سامنے نہیں تھا اس لیے اس نے بھی اپنے فلسفہ کی بنیاد ، اپنے قیاسات ہی پر رکھی ، وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا'' [1]

ایک اہم استفسار:

یہ اقتباسات اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ مارکس ، لینن اور ماؤ ، تینوں کے فلسفہ ہائے حیات ، اگرچہ قرآن کے مطابق نہ تھے ، مگر ان کے نظامہائے معیشت ، بقولِ پرویز ، مطابق قرآن تھے ، اب سوال یہ ہے کہ

دین (قرآن کریم) نہ مارکس کے سامنے تھا ، نہ ہی لینن کے ، اور نہ ہی ماؤ کے سامنے تھا ، لیکن پھر بھی اِن تینوں نے ، مطابقِ قرآن ''نظامِ معیشت'' تشکیل دے دیا ، حیرت بالائے حیرت اور ستم بالائے ستم ، یہ کہ ، جن کے سامنے ، قرآن ، ہمیشہ رہا ، وہ خود ، اس کی بناء پر کوئی معاشی نظام پیش نہ کر پائے ، بلکہ انہیں بھی ، اگر ، اس ''مطابقِ قرآن'' نظام کا علم ہوا

[1] نظام ربوبیت ، صفحہ ۳۰۴ + طلوع اسلام ، جنوری ۱۹۶۷ء ، صفحہ ۶۳

بھی، تو اس وقت، جبکہ روس میں لینن اور چین میں ماؤزے تنگ کے ہاتھوں، یہ نظام قائم ہو چکا تھا۔ آخر یہ کیوں؟

چھوڑیئے علماءِ امت کو، کہ وہ بیچارے تو عجمی اسلام کا شکار ہو کر ''جمود و تعطل کے جذام'' میں مبتلا ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ ''مفکر قرآن'' کو آہوں اور سسکیوں کے ساتھ، کفِ حسرت ملتے ہوئے بارہا یہ کہنا پڑا ہے کہ

''میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ:

نہ کہیں لذت کردار، نہ افکار عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ:

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق [1]

لیکن خود ہمیں تعجب پر تعجب ہے، اچنبھے پر اچنبھا ہے...... اس امر پر کہ خود ''مفکر قرآن'' صاحب، جنہیں ''اپنے دیدۂ تر کی بے خوابیوں'' اور اپنے ''دل کی پوشیدہ بے تابیوں''، اور اپنے ''نالۂ نیم شب کے نیاز'' اور اپنی ''خلوت و انجمن کے گداز'' پر ہمیشہ ناز رہا، اور جن کے متعلق یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا کہ تہجد کے وقت، گرد آلود غلافِ قرآن کو صاف کیا کرتے تھے، اور جن کے سامنے شب و روز قرآن کھلا رہتا تھا، وہ خود بھی، اپنی عمر کے ایام شباب میں بھی، جبکہ ذہنی صلاحتیں اور فکری استعدادات، اپنے عروج پر ہوتی ہیں، قرآن کے اس نظام سے غافل ہی رہے جسے حضرت کارل مارکس، اور اس کے خلیفۂ اول حضرت اینجلز، اور ان کے روسی معتقد حضرت لینن وغیرہم نے، بغیر قرآن کے، محض اپنی عقل کے زور سے پالیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس قرآن کا کیا فائدہ، جس کے بغیر بھی ماؤزے تنگ وغیرہ نے ''قرآنی نظام معیشت'' پالیا اور ہمارے ''مفکر قرآن'' قرآن کریم سے، اشتراکیت کے مماثل ''نظام معیشت'' کو اس وقت تک نہ پا سکے جب تک روس اور چین میں عملاً نظام قائم

---

[1] سلیم کے نام، جلد ا، صفحہ ۵۱

نہیں ہو گیا۔ یہ بات ہمیں اس لیے کہنی پڑ رہی ہے کہ ''مفکر قرآن'' ایک مدت تک، خود طلوع اسلام میں ذاتی ملکیت کو از روئے قرآن ثابت کرتے رہے ہیں، اور اشتراکیت کو سر تا پا خلافِ اسلام قرار دیتے رہے ہیں۔ (حوالے آگے آ رہے ہیں)۔

لیکن قیام پاکستان کے بعد، وہ نخچیرِ اشتراکیت ہوئے، تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دل و دماغ کی تبدیلی کے ساتھ ہی، ان کے زمین و آسمان بھی بدل جاتے ہیں، اب عجلِ اشتراکیت کی محبت، ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے، پھر قرآنی آیات کے تراجم بدلتے ہیں، تفسیر آیات میں تغیر واقع ہوتا ہے، قرآنی مفردات میں، اشتراکی مفاہیم داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک ایسی لغات القرآن معرض وجود میں آ جاتی ہے ، جسکے معانی، عجمی تو درکنار، خود کوئی عرب بھی نہ سمجھ سکے، ایسی صورت میں ، قصور لغات القرآن کا نہیں، جس میں خود ساختہ معانی گھسیڑ دیئے گئے ہیں، بلکہ قصور، اس عرب کا ہے جو عرب ہو کر بھی، اس کے معانی سے جاہل ہے۔

کارل مارکس (معاذ اللہ) نبیؐ سے بھی بڑھ کر:

سب سے بڑی حیرت اور ستم ظریفی، تو یہ ہے کہ جس نبی پر قرآن نازل ہوا، وہ بیچارا خود بھی، اس ''نظام ربوبیت'' کو نہ جان پایا جسکا علم بارہ صدیوں بعد، ''حضرت'' مارکس اور اس کے ''خلیفہ اول بلافصل، حضرت'' اینجلز کو ہو گیا تھا، کیونکہ عہدِ نبوت اور خلافت راشدہ میں، ذاتی ملکیت کا اصول بھی رائج تھا، لوگوں کے پاس فاضلہ دولت بھی پائی جاتی تھی، جس میں سے وہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی، انفاق فی سبیل اللہ کیا کرتے تھے، صحابہؓ میں مال و دولت کے اعتبار سے تفاضل بھی موجود تھا، زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کے بعد بھی، اگر دولت بچ جاتی تو وہ صاحب مال کی وفات پر، ورثاء میں تقسیم ہو جاتی تھی اور یہ سب کچھ شخصی ملکیت کے اصول ہی کی بناء پر تھا۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ، منصبِ نبوت اور مرتبۂ رسالت پر فائز ہو کر بھی، نیز خداداد عقل و بصیرت سے (جو عام عقل بشر سے بالاتر چیز

ہے) مالا مال ہو کر بھی، قرآن کریم کے ''نظام ربوبیت'' سے بے خبر اور نا واقف ہی رہے...... لیکن...... مارکس، اینجلز، لینن اور ماؤزے تنگ وغیرھم، بغیر قرآنی تعلیم کے ''نظام ربوبیت'' کو محض عام بشری عقل سے پا گئے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ نبیؐ مرسل ہے جس کے پاس منزّل من اللہ کتاب ہے، مگر وہ ''نظامِ ربوبیت'' سے بے خبر رہتا ہے، اور دوسری طرف، غیر نبی ہی نہیں بلکہ سکہ بند ملحد یہودی ہے جو قرآن سے کوسوں دور ہے وہ ''نظام ربوبیت'' کو اپنی عقل و دانش سے پا لیتا ہے، پھر بتایئے کہ دونوں میں سے اعقل، اعلم، افہم اور افقہ کون ہے؟ محمد ﷺ قرآن کے ساتھ؟ یا کارل مارکس، بغیر قرآن کے؟

کون مسلمان ہے، جو یہ کہتے ہوئے توہین رسالت کا ارتکاب کرے کہ علم و عقل، فہم و تفقہ اور شعور و تدبر کے لحاظ سے، کارل مارکس کو حضرت محمد ﷺ پر فوقیت حاصل ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' کے استدلال کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے، وہ اپنی تحریر کے بہاؤ میں، قارئین کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں، جہاں وہ خود، اس نتیجہ کو لاشعوری طور پر قبول کر لیتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ شعوری طور پر اسے اپنی زبان پر لائیں، پھر اس کے ساتھ ساتھ، ''مفکر قرآن'' اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر، اسم رسالتماب کے ساتھ، اپنی عقیدت کا ڈرامہ رچاتے ہیں تا کہ اُن کے اندھے مقلدین، اہانتِ رسول کے اس پہلو کی تردید کرتے ہوئے، یہ کہہ سکیں کہ

> ''جن احباب کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ حضور اکرمؐ کا اسم گرامی ان کے لب پر آیا، یا ان کے لیے فردوس گوش بنا ہو، اور ان کی آنکھ کے آبگینے سے آنسو نہ چھلک پڑے ہوں۔'' [1]

ایمان بالرسول کے دعویٰ کے ساتھ، اطاعتِ رسول سے کنارہ کش ہوتے ہوئے،

---

[1] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۶ء، صفحہ ۹

محض اسمِ رسول پر آنسو بہانا، اگر اخلاصِ قلب کی دلیل ہوتے، تو قرآن کریم، برادرانِ یوسف کا یہ عیب بیان نہ کرتا کہ جاء وابا ھم عشاء یبکون حالانکہ ان کا حال یہ تھا کہ جاء و اعلے قمیصہِ بدم کَذب. اگر مگرمچھ کے ان آنسوؤں کی کوئی قدر و قیمت ہوتی تو حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ کریمی ان کو موتی سمجھ کر قبول کر لیتی۔



باب دوم

ذاتی ملکیت پر صاحبِ تفسیر مطالب الفرقان کا موقف

پرویز صاحب کا ''قرآنی نظام معیشت''، ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا، وہ اس نظام کو ''نظام ربوبیت'' کا نام دیتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل، ان کے ذہن میں ''نظام ربوبیت'' کا تصور تک نہ تھا، اسے قیام پاکستان کے بعد، انہوں نے قرآن مجید سے کشید کیا ہے، جولائی ۱۹۳۹ء کے شمارہ طلوعِ اسلام میں...... ''سوشلزم اور اسلام''...... کے زیرِعنوان، انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس پر برہانِ قاطع ہے کہ اُس وقت، وہ، اسلام میں نجی ملکیت کے قائل تھے (بشرطیکہ ان کی قلمی تحریر، ان کے دل کی آواز ہو)، پاکستان بننے کے بعد بھی، اس نام نہاد ''نظام ربوبیت'' سے، ان کا ذہن برسوں بیگانہ رہا۔ میرے علم کی حد تک ۱۹۵۰ء میں، یا اس کے لگ بھگ، انہوں نے پرائیویٹ پراپرٹی کی نفی کی، پھر اس کے بعد، وہ، مسلسل، ذاتی ملکیت کا انکار کرتے چلے گئے، کیونکہ اس وقت تک اشتراکی فکر و نظام، ان کے قلب و ذہن پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا، غالباً اکتوبر ۱۹۵۲ء کے شمارہ میں، پہلی مرتبہ......طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد...... کے عنوان سے ایک کالم کا اضافہ کیا گیا، جس میں ''ربوبیتِ عامہ'' یعنی ''تمام نوع انسانی کی پرورش'' جیسی اصطلاحات اختیار کی گئیں۔ اس کے بعد، پھر ان کے ذہنِ رسا نے، قرآن سے قطرہ قطرہ ''نظام ربوبیت'' کو کشید کیا، اور جنوری ۱۹۵۵ء کا شمارہ طلوع اسلام، وہ آخری ماہوار شمارہ ہے جسکی پیشانی پر...... ''اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ''...... کے الفاظ ثبت تھے، اس کے بعد، پہلا پرچہ ہفتہ وار طلوع اسلام، ۵ فروری ۱۹۵۵ء کو، جو چھپا تو اس کی پیشانی پر...... ''قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر'' ...... کے الفاظ شائع کیے گئے تھے، اور کتاب، ''نظام ربوبیت'' کا پہلا ایڈیشن بھی ۱۹۵۵ء ہی میں منظر عام پر آیا، اس کے بعد طلوع اسلام کی خصوصیت ہی یہ قرار

دی گئی کہ وہ ''نظام ربوبیت کا علمبردار'' ہے، وفاتِ پرویز کے وقت، بلکہ اس کے بعد بھی، یہی خصوصیت، سرورق پر ثبت ہوتی رہی۔

کمیونزم، سوشلزم یا بالشوزم وغیرہ سے اقتصادی نظام کا چربہ لیکر، جب اسے ''نظام ربوبیت'' کا نام دیا گیا، تو ظاہر ہے کہ اس کا مرکزی نکتہ، ذاتی ملکیت کی نفی ہی ہو سکتا تھا جیسا کہ اشتراکیت میں ہے، چنانچہ اس نکتہ پر بڑا زور دیا گیا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، لکھتے بولتے، الغرض، ہر حالت میں، ذاتی ملکیت کی نفی، ان کا وظیفۂ حیات ٹھہرا، اپنی کتب میں، رسائل میں، تحریروں میں، تقریروں میں، بار بار، بتکرارِ بسیار، اس بات پر زور دیا گیا کہ قرآن کسی شخص کو ذاتی ملکیت رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، جملہ وسائل و ذرائع، خواہ وہ قدرتی ہوں یا مصنوعی، انہیں شخصی ملکیت میں رکھنے کا کوئی جواز، از روئے قرآن نہیں ہے، چنانچہ اس تصور کو دسیوں مرتبہ نہیں، بیسوں مرتبہ بھی نہیں بلکہ سینکڑوں دفعہ دہرایا گیا جیسا کہ درج ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:

۱...... ''قرآن کے معاشی نظام میں، نہ کسی کے پاس فاضلہ مال و دولت یا جائیدادیں ہوں گی، اور نہ ان کی (Disposal) کے متعلق سوالات پیدا ہوں گے، اگر کسی کا کوئی ترکہ ہو گا، تو وہ ان اشیاء مستعملہ تک محدود رہو گا جنہیں حکومت نے ذاتی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دے رکھی ہو گی۔'' [۱]

۲...... ''اس نظام میں ذاتی ملکیت کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ العفو (ضروریات سے فاضل) بطور امانت، فرد متعلقہ کی تحویل میں رہ سکتا ہے۔'' [۲]

۳...... ''حقیقت یہ ہے کہ (اور اس کا اظہار بطور تحدیثِ نعمت کیا جاتا ہے کہ) یہ آواز، اٹھی ہی طلوع اسلام کی طرف سے، کہ قرآن میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں، اور نظام قرآنی کا مقصود، تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔'' [۳]

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۴   [۲] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۰ء، صفحہ ۱۴

[۳] طلوع اسلام، اگست ۱۹۵۴ء، صفحہ ۳۷

۴ ...... ''قرآن کی رو سے زمین، انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ ہے، اس لیے اس پر بطور جائیداد، انفرادی ملکیت، قطعاً جائز نہیں۔'' ۱

۵ ...... ''قرآن جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے، اس کی رو سے دولت کا اکتناز یا وسائلِ پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔'' ۲

۶ ...... ''قرآن کی رو سے زمین، رزق کا سرچشمہ ہے، اور (ہوا، پانی، روشنی کی طرح) رزق (سامانِ زیست) کے سرچشموں پر کسی کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ۳

۷ ...... ''زمین پر ذاتی ملکیت، جائز نہیں۔'' ۴

۸ ...... ''زمین (ارض) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی، یہ ذریعۂ پیداوار ہے۔'' ۵

۹ ...... ''جس طرح ہوا اور روشنی جیسی چیزیں، کسی کی ذاتی ملکیت قرار نہیں پاسکتی ہیں، ہر انسان کو اس سے متمتع ہونے کا حق پہنچتا ہے، اسی طرح، قرآن کی رو سے، زمین پر انفرادی ملکیت کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' ۶

۱۰ ...... ''قرآنی نظام کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت جائز نہیں۔'' ۷

۱۱ ...... ''قرآنی نظام ربوبیت کے مطابق، تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے، اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، حکومت، ذرائع پیداوار کو، اپنی تحویل میں رکھتی ہے، ان پر ملکیت، افراد کی ہوتی ہے، نہ مملکت کی۔'' ۸

۱۲ ...... ''قرآنی نظام ربوبیت میں، رزق کے سرچشموں پر، کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ افراد کی، نہ مملکت کی۔'' ۹

---

۱ طلوع اسلام، ۱۲ نومبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵

۲ طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۶ء، صفحہ ۹

۳ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۵۳

۴ طلوع اسلام، اگست ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۸

۵ طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۵

۶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۶

۷ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷

۸ طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۹ء، صفحہ ۶

۹ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۹

۱۳......''اسلامی مملکت میں، نہ وسائل رزق کسی کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ فاضلہ دولت۔ مملکت کے پاس یہ چیزیں بطور امانت رہتی ہیں۔'' ؎۱

۱۴......''قرآن کریم کی رو سے تو اس کا جواب واضح ہے کہ زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت ہی نہیں ہوسکتی۔'' ؎۲

۱۵......''قرآن کی رو سے رزق کے سرچشموں پر، کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔'' ؎۳

۱۶......''زمین، ذریعۂ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا، پانی، روشنی کی طرح) نوع انسانی کی پرورش کے لیے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے، اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ؎۴

۱۷......''قرآن آیا اور اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا، کہ رزق کے معاملہ میں کوئی انسان، کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَاِیَّاکُمۡ (۶/۱۵۲)، ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں، ان کے بھی، اور ان کی اولاد کے بھی، ہم ایسا نظام معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے، انسانوں کی ملکیت میں رہنے کی بجائے، تمام افراد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں۔'' ؎۵

۱۸......''وسائل و ذرائع میں، بنیادی حیثیت، زمین کو حاصل ہے (اشیاء خورد و نوش کے علاوہ، جملہ مصنوعات کے لیے خام مصالحہ یہیں سے ملتا ہے) اس کے متعلق قرآن نے کہہ دیا کہ اس پر انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ؎۶

۱۹......''وَمَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ (۱۶/۵۳)، یاد رکھو! یہ تمام اسباب و ذرائع،

؎۱ طلوع اسلام، مئی جون ۱۹۶۰ء، صفحہ ۷۸
؎۲ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۶
؎۳ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۳ء، صفحہ ۱۴
؎۴ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۴ء، صفحہ ۵۰
؎۵ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۵ء، صفحہ ۲۹
؎۶ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۶ء، صفحہ ۱۷

انعاماتِ خداوندی ہیں، تمہارے پیدا کردہ نہیں ہیں، اس لیے ان کا ماحصل، تمہاری واحد ملکیت نہیں ہوسکتا۔'' [۱]

۲۰ ...... '' ظاہر ہے کہ جب ذرائع پیداوار، انفرادی ملکیت میں رہنے کی بجائے، نظام خداوندی کی تحویل میں رہیں گے، تو معاشرہ میں سرمایہ داری کا تصور تک پیدا نہ ہوگا۔'' [۲]

۲۱ ...... '' قرآن کریم کی رو سے، ذرائع رزق پر، کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ سب نظام معاشرہ کے کنٹرول میں رہیں گے، ملکیت، اس پر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔'' [۳]

۲۲ ...... '' قرآنی معاشرہ میں، تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، بہم پہنچانے کی ذمہ داری، معاشرہ پر ہوتی ہے، اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار، معاشرہ کی تحویل میں رہیں، نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں، جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔'' [۴]

۲۳ ...... '' قرآن کریم کے معاشی نظام کا منتہاءِ نگاہ، رب العالمینی ہے، یعنی تمام افراد انسانیہ کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے اور ان کی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے کی ذمہ داری۔ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، اس نے معاشی نظام کی اصولی راہنمائی دی ہے، جس میں ذرائع پیداوار، انفرادی ملکیت میں رہنے کی بجائے، ملت کی اجتماعی تحویل میں آجاتے ہیں۔'' [۵]

۲۴ ...... '' قرآن کریم میں، جس چیز کی نسبت، خدا کی طرف کی گئی ہے (یعنی یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی ہے)، اس سے مراد یہی ہے کہ وہ عام انسانیت کے لیے کھلی ہے، اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی ...... اسی طرح جب اس نے اَرۡضُ اللّٰہ کہا، تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' [۶]

---

[۱] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۰
[۲] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۸
[۳] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۷
[۴] طلوع اسلام، جون ۱۹۶۶ء، صفحہ ۴۶
[۵] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۱
[۶] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۵

۲۵ ...... ''ہوا، پانی، روشنی، حرارت اور زمین، جس میں غذا کا ذخیرہ جمع رہتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ چیزیں (ذرائع زیست) تمام ذی حیات کے لیے، سامانِ زندگی کے طور پر دی گئی تھیں، نہ کہ کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کے لیے جائیدادیں کھڑی کرنے کے لیے۔ انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں، ان اشیاء میں سے، کسی شے پر ''ملکیت'' کا تصور ہی نہ تھا، ان کی زبان میں ''ملکیت'' کا لفظ ہی نہیں ملتا۔'' ۱

۲۶ ...... ''قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کا فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کا اس قسم کا انتظام کرے جس سے یہ چند افراد کی ملکیت بننے کی بجائے، تمام افرادِ انسانیہ (بلکہ ہر متنفس) کو سامانِ زیست بہم پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔'' ۲

۲۷ ...... ''اس نظام کی رو سے، وسائل پیداوار، انفرادی ملکیت میں رہنے کی بجائے، امت کی تحویل میں رہتے ہیں۔'' ۳

۲۸ ...... ''ذرائع رزق، ہر ضرورت مند کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے، ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔'' ۴

۲۹ ...... ''رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ زمین ہے، اور قرآن کی رو سے زمین پر، جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ انسانوں کی پرورش کے لیے عطا ہوئی ہے، انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۵

۳۰ ...... ''سرمایہ پرستی کے قارونی استبداد کو، اس نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار (ارضی) کو تمام نوع انسانی کی پرورش کے لیے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ انہیں ذاتی ملکیت سمجھ کر، ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے، جہاں تک دولت کا تعلق ہے، ضرورت سے زائد دولت کسی کے پاس نہیں رہنی چاہیے۔'' ۶

---

۱ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۶ء، صفحہ ۵۱
۲ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۶ء، صفحہ ۵۲
۳ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۶ء، صفحہ ۵۷
۴ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۵
۵ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۲
۶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۰

۳۱......'' اسلامی نظام میں رزق کے سرچشمے ، اور وسائل پیداوار ، انفرادی ملکیت کی بجائے ،حکومت کی تحویل میں رہتے ہیں۔'' ۱

۳۲......'' نہ صرف یہ کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار کو ذاتی ملکیت نہیں بنایا جا سکتا بلکہ یہ بھی کہ جو کچھ کسی کے پاس ، اس کی جائز ضروریات سے زائد ہو، اسے بھی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کھلا رکھا جائے۔'' ۲

۳۳......'' قرآن کے معاشی نظام میں، کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus money) رہ ہی نہیں سکتی۔'' ۳

۳۴......'' ان (اور ان جیسی بے شمار) آیات میں (لَکُمْ یا لِلْاَنَامِ وغیرہ میں) لام ، انتفاع کے لیے ہے، تملیک کے لیے نہیں ، لہٰذا ارض پر کسی کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ۴

۳۵......'' زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' ۵

۳۶ ......'' یہ ہے وہ تصور، جو قرآن نے پیش کیا ہے کہ ارض (یعنی وسائلِ پیداوار) پر کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی، یہ تمام نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ ہیں، اور انہیں اس مقصد کے لیے کام میں لانا چاہیے۔'' ۶

۳۷......'' اشتراکیت کے خدا فراموش فلسفۂ حیات پر مبنی نظام معیشت سے بچانے کے لیے (کم از کم) پاکستان میں ،قرآنی نظام حیات متشکل کر دیا جائے ،جس کا ایک گوشہ یہ ہے کہ وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' ۷

۳۸......'' یہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ افراد مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرے، اور اس کے لیے ذرائع پیداوار کو مملکت کی تحویل میں ہونا چاہیے۔'' ۸

---

۱ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۸ء، صفحہ ۲۷
۲ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۸ء، صفحہ ۴۶
۳ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۸ء، صفحہ ۶۳
۴ + ۵ طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۴
۶ طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۷
۷ طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۲۱
۸ طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۴۷، ۴۸

۳۹...... ''ربوبیت عامہ کے عظیم مقصد کے حصول کے لیے، قرآن کی رُو سے یہ ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے، افراد کی ملکیت کی بجائے، قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں، تا کہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے، اور اس طرح کوئی، کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے، اس کو قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔'' [۱]

۴۰...... '' مغرب کے نظام سرمایہ داری کو ختم کر کے، اس کی جگہ، قرآن کا معاشی نظام قائم کیا جائے، اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی فرد معاشرہ، اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے، اور نہ ہی کسی کے پاس، اپنی ضروریات سے زائد دولت رہتی ہے، یہ انتظام، اسی صورت میں ممکن ہے کہ ملک کے ذرائع پیداوار، انفرادی ملکیت میں رہنے کی بجائے، ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔'' [۲]

۴۱...... '' حکومت، اس اہم ذمہ داری سے، اسی صورت میں عہدہ برآ ہوسکتی ہے کہ ذرائع پیداوار (خواہ وہ قدرتی ہوں یا مصنوعی، بالفاظ دیگر، زمین اور کارخانے)، افراد کی ملکیت کی بجائے، ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔'' [۳]

۴۲...... '' دین کے اجتماعی نظام میں، (i) ہر فرد مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا، مملکت کا فریضہ ہوتا ہے'

(ii) اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار، انفرادی ملکیت کی بجائے، امت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔'' [۴]

۴۳...... '' قرآن نے، جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ابدی ضابطۂ حیات ہے، ایک ایسا معاشی نظام دیا ہے جس میں نہ وسائل پیداوار، افراد کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں، اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت کے انبار لگے رہتے ہیں۔'' [۵]

---

[۱] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۸ء، صفحہ ۷۷
[۲] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۹
[۳] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۳
[۴] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۴
[۵] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲

۴۴......'' یہاں قلب و نگاہ کی تبدیلی سے ، قرآن کا وہ معاشی نظام نافذ کیا جائے جس میں عام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ، اوران کی مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے، جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ، ذرائع پیداوار، مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں ، اور فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہنے پاتی ۔'' [۱]

۴۵......'' اصول یہ ہوگا کہ جن ضروریات کو معاشرہ از خود پورا نہیں کرتا، اس حد تک افراد، اپنے پاس رکھ کر، باقی سب دولت ، معاشرہ کی تحویل میں دیدیں گے، اس طرح فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے گی ، اب ظاہر ہے کہ:

(i) ذرائع پیداوار کسی کی ملکیت میں نہیں رہیں گے۔

(ii) فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی۔'' [۲]

۴۶......'' ہمارا مقصد پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کا احیاء اور فروغ ہے جس کا معاشی نظام یہ ہے کہ:

(i) ملک کا کوئی فرد، اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے

(ii) ذرائع پیداوار (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا انڈسٹری کی صورت میں) انفرادی ملکیت کی بجائے ، ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں

(iii) فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔'' [۳]

۴۷......'' قرآن میں پیش کردہ اصول کی اس تفسیر کی رو سے ، زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی باقی نہ رہا، اور جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہی ، تو کاشکاروں کو بٹائی یا ٹھیکہ پر زمین دینے کا تصور ہی باطل قرار پا گیا۔'' [۴]

۴۸......'' اس نظام کے اصولی گوشے حسب ذیل ہیں:

---

[۱] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۸ — [۲] طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۹

[۳] طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۸ — [۴] طلوع اسلام، جون ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۴

(الف) تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔

(ب) اس مقصد کے حصول کے لیے، مملکت، وسائل پیداوار (زمین کارخانے وغیرہ)، افراد کی ملکیت میں رکھنے کی بجائے، امت کی مشترکہ تحویل میں دے سکتی ہے، اس سے فاضلہ دولت جو نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے، کسی کے پاس نہیں رہنے پاتی۔" [1]

۴۹...... "قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" [2]

۵۰...... "اسلامی معاشرہ میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" [3]

۵۱...... "اس قُلِ الْعَفْوَ کے فیصلہ نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے طے کر کے رکھ دیا، اس سے کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی، جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی تو معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں اور تباہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔" [4]

۵۲...... "اس کا علاج صرف ایک ہے، اور وہ ہے ملک کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلی یعنی ایسا نظام قائم کرنا، جسکی رو سے مملکت کے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا، حکومت کی ایسی ذمہ داری قرار پا جائے جسے پورا نہ کرنے کی صورت میں، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے، اور اس کے بعد ذاتی املاک کی یکسر مخالفت، یعنی اشیاءِ مستعملہ کے علاوہ، کسی قسم کی جائیداد بنانے کی قطعاً اجازت نہ ہو۔" [5]

۵۳...... "دین کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص، کسی دوسرے شخص کا محکوم رہے نہ محتاج۔ انسانوں کی محتاجی تو یوں ختم ہو جاتی ہے کہ اس میں اطاعت، خدا کے احکام و اصولات کی ہوتی ہے محتاجی کے ختم کرنے کے لیے وہ ایسا معاشی نظام قائم کرتا ہے

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۹
[2] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۴
[3] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۰
[4] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۴
[5] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۸

کہ جس میں ذرائع رزق، کسی فرد، گروہ، یا ارباب حکومت کی ملکیت میں رہنے کی بجائے مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں تا کہ افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں۔" [1]

۵۴......"یاد رہے کہ خدا نے جس چیز کو"اللہ کی" کہہ کر پکارا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ شے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، اسے نوع انسانی کے لیے کھلا رہنا چاہیے۔" [2]

۵۵......" زمین کے متعلق قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا کہ یہ سواء للسائلین (۴۱/۱۰) رہے گی، یعنی تمام ضرورت مندوں کے لیے، یکساں طور پر کھلی...... جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہے گی، تو ظاہر ہے کہ صنعت (Industry) جس کا مدار، زمین سے پیدا ہونے والی خام اشیاء پر ہے، کس طرح افراد کی ملکیت قرار پا سکے گی۔" [3]

۵۶......" قرآنی معاشرہ میں، رزق کے سرچشمے، کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہتے، یہ سب ضرورت مندوں کے لیے کھلے رہتے ہیں سَوَاءً للسائلین (۴۱/۱۰)" [4]

۵۷......" یاد رکھو! لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۲/۲۸۴)، ارض وسما میں، جو کچھ ہے، سب خدا کی ملکیت ہے، اس لیے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔" [5]

۵۸......" زمین کو خدا نے تمام مخلوق کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔" [6]

۵۹......" یہ تمام مشکلات، اس وقت تک پیدا ہوتی رہیں گی، جب تک قرآن کریم کا معاشی نظام رائج نہیں ہوگا اس نظام میں، نہ زمین اور دیگر ذرائع و وسائل پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے، اور نہ ہی کسی کے پاس، فاضلہ روپیہ ہوتا ہے، کہ وہ جائیدادیں کھڑی کرے یا اسے کاروبار میں منافع پر لگائے۔" [7]

---

[1] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۰ء صفحہ ۳۲ — [2] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳

[3] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۰ — [4] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۶

[5] + [6] طلوع اسلام، جون ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۳ — [7] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۲

۶۰ ......" قرآن کریم نے ان تمام مشکلات کا ایک ہی حل بتایا ہے، یعنی پرائیویٹ پراپرٹی (Private property) کا خاتمہ۔ اس کے تجویز کردہ معاشی نظام کی رو سے، افراد مملکت کی ضروریات کا مہیا کرنا، مملکت کے ذمہ ہوتا ہے، اور افراد میں سے کسی کے پاس، زائد از ضرورت روپیہ نہیں رہتا، اس لیے اس میں ذاتی جائیداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ زمین کی شکل میں، نہ جائیداد کی شکل میں، نہ کارخانوں کی شکل میں۔ یہ ہے اسلام کے معاشی نظام کا ماحصل۔" [1]

۶۱ ......" اس نظام کی رو سے آپ دیکھئے کہ:

(i) نہ تو زمین، کسی کی انفرادی ملکیت میں رہتی ہے، اور

(ii) نہ ہی فالتو روپیہ (Surplus Money) کسی کے قبضہ میں رہتا ہے۔" [2]

۶۲ ......" معاشیات میں ایک اہم اصول، انفرادی ملکیتوں کا آتا ہے، ذرا غور وفکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کی زمین پر ذاتی ملکیت قائم کرنا، صریح دھاندلی ہے۔" [3]

۶۳ ......" رشوت یا اس قسم کی دیگر خرابیاں، درحقیقت، علاماتِ مرض ہیں، علتِ مرض نہیں، علتِ مرض وہ غلط معاشی نظام ہے، جو اس وقت ہمارے ہاں ہی نہیں، بلکہ کم وبیش ساری دنیا میں رائج ہے، قرآن کریم علاماتِ مرض کا نہیں سوچتا، علتِ مرض کی بیخ کنی کی تدبیر بتاتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ ان تمام خرابیوں کی علت اور جڑ، ذاتی ملکیت (پرائیویٹ پراپرٹی) کا وجود ہے، جس نظام میں پرائیویٹ پراپرٹی کی اجازت ہوگی، اس میں یہ امراض لازماً پیدا ہوں گی، ان کا استیصال صرف وہ نظام کر سکے گا، جس میں نہ کسی کے پاس، زائد از ضرورت دولت ہو، نہ پرائیویٹ پراپرٹی کا امکان یا اجازت، لیکن اس کے لیے شرط اول یہ ہے کہ ان افراد کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہو، قرآن کریم اس قسم کا معاشی نظام

---

[1] طلوع اسلام، اگست ۱۹۷۱ء، صفحہ ۸
[2] طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۴۰
[3] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳۹

تجویز کرتا ہے۔'' [۱]

۶۴...... '' ہمارے ملک کی معیشت، زرعی ہے، اور ہم بتکرار و اصرار، اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے، زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' [۲]

۶۵...... '' رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ، زمین ہے، اور قرآن کی رو سے، زمین پر...... جو خدا کی طرف سے بلا معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لیے عطا ہوئی ہے...... انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' [۳]

۶۶...... '' قرآن کریم کی رو سے، زمین کے ایک انچ پر بھی، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' [۴]

۶۷...... '' قرآنی نظام ربوبیت کے مطابق، تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی ذمہ داری، حکومت کے سر ہوتی ہے، اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، حکومت ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے، ان پر ملکیت، نہ افراد کی ہوتی ہے، اور نہ مملکت کی۔ ذرائع پیداوار میں صرف زمین ہی شامل نہیں ہوتی، دور حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔'' [۵]

۶۸...... '' قرآن کی رو سے، زمین پر ذاتی ملکیت، نہ فرد کی ہوسکتی ہے، نہ خاندان کی، یا کسی اور اجتماعی گروپ کی، حتّٰی کہ ملکیت، اس پر، حکومت کی بھی نہیں ہوسکتی۔'' [۶]

۶۹...... '' زمین بھی خدا کی، اور بندے بھی خدا کے، اس لیے خدا کی زمین، خدا کے بندوں کے لیے کھلی رہنی چاہیے، اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' [۷]

۷۰...... '' ان اصولوں میں سر فہرست، یہ اصول ہے کہ ذرائع پیداوار پر، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی...... قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے، اس لیے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' [۸]

۱۔ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۷۱ء، صفحہ ۷ تا ۸
۲۔ طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۲ء، صفحہ ۱۲
۳۔ طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۲ء، صفحہ ۳۸
۴۔ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۲ء، صفحہ ۱۲
۵۔ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۱
۶۔ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۲ء، صفحہ ۳۶
۷۔ طلوع اسلام، جون ۱۹۷۲ء، صفحہ ۳۹
۸۔ طلوع اسلام، اگست ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۰

۷۱...... "قرآن کریم نے نَاقَةُ اللّٰهِ اور اَرْضُ اللّٰهِ کہہ کر کیسے حسین اور بلیغ انداز میں، اس حقیقت کو واشگاف کر دیا کہ ذرائع رزق، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔" ۱

۷۲...... "قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاضلہ دولت (ضرورت سے زائد دولت) کو کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔" ۲

۷۳...... "یہ ہے اسلامی نظام کا اصولی تصور، ظاہر ہے کہ اس نظام میں، نہ ذرائع پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت ہوں گے، نہ وہاں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہوگا۔" ۳

۷۴...... "زمین خدا کی ہے، اور مخلوق بھی خدا کی، خدا کی زمین، خدا کی مخلوق کے لیے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیے، کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس پر لکیریں کھینچ کر یہ کہہ دے کہ یہ رقبہ میرا ہے، اس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا، خدا کی ملکیت کو اپنی ملکیت قرار دے لینا، خدا کا شریک بن جانا ہے۔" ۴

۷۵...... "قرآن کے معاشی نظام کی رو سے بٹائی (یا پٹہ) کا ختم کر دینا بیشک ضروری ہے بلکہ اس کے منتہٰی کی طرف جانے کے لیے، قدمِ اول کی حیثیت رکھتا ہے، منتہٰی اس کا یہ ہے کہ اسلامی نظام مملکت، تمام افراد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری، اپنے سر پر لے، اور پھر اراضی کی کاشت کے لیے، جس نظام کو بہتر خیال کرے، اسے اختیار کر لے، زمین کی ملکیت کا سوال ہی غیر قرآنی ہے، خواہ وہ ملکیت کاشتکار کی ہو، یا زمیندار کی۔" ۵

۷۶...... "جس چیز کو خدا اپنی کہتا ہے، اس کے معنٰی یہ ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔" ۶

۷۷...... "کفران نعمت کے معنٰی میں یہ عقیدہ ہے کہ وسائل پیداوار (ارض) پر انسان کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے، اور رزق پیدا کرنے کی صلاحیتیں بھی اس کی اپنی ہیں، اس

---

۱ طلوع اسلام، اگست ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۰ — ۲ طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۳ء، صفحہ ۵۵

۳ طلوع اسلام، جون ۱۹۷۳ء، صفحہ ۵۸ — ۴ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۴ء، صفحہ ۲۸

۵ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۴ء، صفحہ ۵۲ — ۶ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۴۶

لیے اس کی رو سے حاصل کردہ دولت بھی، صرف اس کی ملکیت ہے۔'' ۱؎

۷۸......'' قرآن کی رو سے ہر وہ شے حرام ہے، جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، اس سے ظاہر ہے کہ جب وسائل رزق کو غیر اللہ کی طرف منسوب ہی نہیں بلکہ انہیں ان کی ملکیت قرار دے دیا جائے، تو وہ رزق، رزق حلال کیسے قرار پائے گا'' ۲؎

۷۹......'' اگر تم سچ مچ پاکستانی معاشرہ میں، مساواتِ محمدی لانا چاہتے ہو، تو بلا توقف ''العفو'' کو صورتِ عمل میں لاؤ، کسی کے پاس، قرآنی پیمانوں کے مطابق، جائز ضرورت سے زائد دولت نہ رہنے دو۔'' ۳؎

۸۰......'' نظام سرمایہ داری کی بنیاد، فاضلہ دولت (Surplus money) ہے، یعنی جب کسی کے پاس، ضرورت سے زائد روپیہ ہوگا، تو اس سرمایہ کے استعمال کا سوال پیدا ہوگا، قرآن کا معاشی نظام فاضلہ دولت کے امکان ہی کو ختم کر دیتا ہے۔'' ۴؎

۸۱......'' قرآنی نظام کی ایک شق یہ بھی تھی کہ زمین، تمام نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ ہے، اس لیے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں ہے، خواہ یہ ملکیت، عام افراد کی ہو، خواہ صاحب اقتدار طبقہ کی، جسے عہد حاضر میں مملکت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔'' ۵؎

۸۲......'' جو قوم، خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق کو، انسانوں کی ذاتی ملکیت قرار دے دے، وہ کبھی تباہی اور بربادی سے نہیں بچ سکتی، اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہمیشہ، ہلاکت ہوگا۔'' ۶؎

۸۳......'' جس معاشی نظام میں، ذرائع پیداوار، یعنی زمین اور اس کے متعلقات، پر ذاتی ملکیت جائز قرار دی جائے، اور اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لیے کھلی نہ رہنے دی جائے، اس نظام اور اس کی حامل قوم کو، دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔'' ۷؎

۱؎ + ۲؎ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۵ — ۳؎ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۸
۴؎ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۶ء، صفحہ ۷ — ۵؎ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۴۹
۶؎ طلوع اسلام، اکتوبر نومبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۱۱ — ۷؎ طلوع اسلام، اکتوبر نومبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۲۵

۸۴...... ''ظاہر ہے کہ تمام سامانِ زیست، تمہیں خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملا ہے، اس پر ملکیت، خدا ہی کی ہے، تمہیں صرف، اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، لہٰذا، تم ایسا نہ کرنا، کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو، اگر تم نے ایسا کیا، تو یہ جانتے بوجھتے، خدا کے ساتھ، خدا کھڑا کر دینے کے مترادف ہوگا۔'' [۱]

۸۵...... ''قرآن کریم کی رو سے، زمین پر ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔'' [۲]

۸۶...... ''قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کہا تھا کہ یَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیں؟ قُلِ العَفْوَ (۲/۲۱۹)، ان سے کہہ دو کہ جس قدر، تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔'' [۳]

۸۷...... ''قرآنی نظام معیشت میں:

(الف) ہر شخص، اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے۔

(ب) اسلامی مملکت، اس کی اور اس کے لواحقین کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتی ہے، اسے، اس کی محنت کا معاوضہ سمجھ لیجیے۔

(ج) اس طرح، کسی کے پاس، نہ فاضلہ دولت رہتی ہے، نہ اس کے استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے۔'' [۴]

۸۸...... ''قرآن کریم کی رو سے، زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' [۵]

۸۹...... ''قرآن کریم کی رو سے، زمین (یا وسائل پیداوار) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔'' [۶]

۹۰...... ''قرآن نے آ کر یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ ذرائع پیداوار پر، افراد کی ملکیت

۱۔ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۵۲
۲۔ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۶
۳۔ طلوع اسلام، مئی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۱
۴۔ طلوع اسلام، مئی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۶۲
۵۔ طلوع اسلام، جون ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱۶
۶۔ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۴۴

ہو سکتی ہے، نہ کسی انسان کے پاس، اس کی ضروریات سے زائد (فاضلہ) دولت رہ سکتی ہے۔'' [1]

۹۱......''زمین کے متعلق خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خدا کی ملکیت ہے، اس لیے کسی فرد یا افراد کے گروہ کو، اس کا حق نہیں ہے کہ اسے اپنی ملکیت میں لے لے۔'' [2]

۹۲......''سورۃ البقرہ میں ہے وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ (۲/۲۱۹) اے رسول! تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لیے دیں؟ قُلِ الْعَفْوَ کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے، وہ سب کا سب۔ اس طرح قرآن کریم نے فاضلہ دولت (Surplus money) کا وجود ختم کر دیا، جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔'' [3]

۹۳......''سامانِ نشوونما کا بنیادی ذریعہ زمین ہے، ظاہر ہے کہ جب افراد معاشرہ کو، سامانِ نشوونما فراہم کرنا، اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوگا، تو زمین بھی اُسی کی تحویل میں رہے گی، اس نظام کی رو سے، زمین پر، ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' [4]

۹۴......''اس نظام میں، نہ کسی کے پاس، فاضلہ دولت رہتی ہے، اور نہ ہی کوئی روٹی کے لیے، کسی کا محتاج ہوتا ہے۔'' [5]

۹۵......''اسلام کے معاشی نظام کی عمارت، معاہدۂ بیع و شراء پر استوار ہوتی ہے، جس سے نجی ملکیت کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔'' [6]

۹۶......''چونکہ اس نظام میں (قرآنی نظام میں)، نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus money) ہوتی ہے، نہ زمینوں کے مربعے۔ اس لیے اس میں نہ (Taxes) کے مسائل پیدا ہوتے ہیں، نہ ربوٰ کے، نہ زمینوں کے جھگڑے اٹھتے ہیں، نہ جائیدادوں کے۔'' [7]

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۵
[2] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۵
[3] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۶
[4] طلوع اسلام، مئی ۱۹۷۹ء، صفحہ ۹
[5] طلوع اسلام، جون ۱۹۷۹ء، صفحہ ۶۲
[6] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳۸
[7] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳۰

۹۷...... ''قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی۔'' [۱]

۹۸...... ''قرآن کریم کی رو سے زمین (یا وسائل پیداوار) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔'' [۲]

۹۹...... ''قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں۔'' [۳]

۱۰۰...... ''رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ زمین ہے، اور قرآن کی رو سے، زمین پر...... جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لیے عطا ہوئی ہے...... انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' [۴]

تِلْكَ مِأَةٌ كَامِلَةٌ

آخر ذاتی ملکیت کی نفی پر یہ اصرارِ بسیار کیوں؟

یہ صرف ایک صد حوالے ہیں، جو زمین، مال و دولت، اور ذرائع پیداوار (خواہ وہ فطری ہوں یا مصنوعی) پر ہر کسی کی نجی، انفرادی یا اجتماعی ملکیت کی نفی پیش کرتے ہیں، اور یہ حوالے بھی، سرسری طور پر، صرف مجلہ طلوع اسلام کی فائل سے لیے گئے ہیں، اگر ان کے ساتھ، ان حوالوں کو بھی جمع کر لیا جائے، جو پرویز صاحب کی جملہ کتب، ان کے مقالات و مضامین، اور کتابچوں وغیرہ میں موجود ہیں، تو بلاشبہ، ان کی تعداد، اگر ہزاروں میں نہیں، تو کئی سینکڑوں تک ضرور پہنچ جائے گی، سوال یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے سینکڑوں مرتبہ، اسے دہرا دہرا کر، کیوں بتکرارِ بسیار پیش کیا ہے؟ صرف اور صرف اس لیے...... کہ:

''نازیوں کے گوئبلز کا مقولہ تھا، کہ...... ''جھوٹ کو اگر سو دفعہ دہرایا جائے، تو وہ سچ بن جاتا ہے'' ...... دنیا، اس کے اس مقولے پر ہنستی رہی، لیکن دور رس نگاہوں نے، اسے قیمتی متاع سمجھ کر، احتیاط سے رکھ لیا، تاکہ بوقت ضرورت اس سے کام لیا جا سکے۔'' [۵]

---

[۱] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۲۶
[۲] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۲
[۳] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۵
[۴] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۰ء، صفحہ ۳۰
[۵] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۶۹

اب ظاہر ہے کہ ''مفکر قرآن'' سے بڑھ کر ''دور رس نگاہ'' کس کی ہوگی، انہوں نے اسے قیمتی متاع سمجھ کر، خوب احتیاط سے رکھ لیا، اور بوقت ضرورت، اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اور سو دفعہ نہیں بلکہ کئی سو دفعہ، اس بات کو دہرایا کہ

''قرآن کے معاشی نظام میں، کسی کے پاس فالتو دولت رہ ہی نہیں سکتی۔'' ۱

''قرآن کے معاشی نظام کی رو سے، زمین، تمام مخلوق کے لیے ذریعہ پرورش ہے، اس لیے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ۲

''قرآن جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے، اس کی رو سے دولت کا اکتناز یا وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔'' ۳

نجی اور ذاتی ملکیت کے حق میں اقتباساتِ پرویز:

حالانکہ طلوع اسلام کی فائل میں...... خود پرویز صاحب کے قلم سے...... درج ذیل اقتباسات بھی موجود ہیں، جو مال و دولت کی شخصی ملکیت کا جواز، از روئے قرآن، پیش کرتے ہیں، چنانچہ وہ اپنے ایک مقالہ...... سوشلزم اور اسلام...... میں لکھتے ہیں کہ:

ا...... ''اشتراکیت، ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام، ہر شخص کی کمائی کو، اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔ زمانہ ظہور اسلام میں جائیداد و املاک، عموماً مویشیوں کی شکل میں تھی، ان کے متعلق فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَوا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا انعامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ

(۳۶/۷۰)

''کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لیے، اپنے دستِ قدرت سے مویشی پیدا کیے جن کے یہ لوگ مالک ہیں۔''

جب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں، انسان کی ملکیت ہوسکتی ہیں، تو انسان کی اپنی

---

۱ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۸ء، صفحہ ۶۳   ۲ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۸۰ء، صفحہ ۶۰

۳ طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۶ء، صفحہ ۹

کمائی اور مصنوعات، تو یقیناً اس کی ملکیت ہوں گی، ارشاد ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

(۴/۲۲)

''جو مرد کماتے ہیں، اس میں مردوں کا حصہ ہے اور جو عورتیں کماتی ہیں اس میں عورتوں کا حصہ ہے۔''[۱]

۲...... ''قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے، مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور نصب العینِ حیات ہی یہ ہے کہ وہ، اللہ کے راستے میں ہر وقت، ہر ایثار کے لیے تیار رہے، چنانچہ قرآن کریم کے پہلے ورق میں، انسانوں کی ان امتیازی خصوصیات کا ذکر ہے جن سے وہ صحیح اسلامی سوسائٹی کے افراد بن سکتے ہیں، یہ خصوصیتیں تین ہیں:

(i) اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ — ایمان بالغیب

(ii) وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ — عبادت بدنی (نماز)

(iii) مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ — انفاق فی سبیل اللہ

اور اصل نیکی کے متعلق فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مما تُحِبُّوْنَ (۳/۹۲)

''تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے، یہاں تک کہ اپنی محبوب شے کو خرچ نہ کر دو۔''

یہ ظاہر ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ذاتی ملکیت تسلیم کی جائے ورنہ جو چیز اپنی ملکیت ہی نہیں، اس میں سے انفاق کیسا؟ قرآن کریم نے فرمایا وَمِمَّا رَزَقْنَا هُمْ يُنْفِقُوْن ''جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، گویا جو اللہ نے دیا ہے وہ انفرادی ملکیت ہے۔

وَاٰتُوْهُمْ مِنْ مَّالِ الَّذِيْٓ اٰتَاكُمْ (۲۴/۳۳)

''اس مال میں سے ان (غلاموں) کو بھی دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے''

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۷ تا ۵۸ + تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۳ تا ۳۰۴

وَاَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ (۲/۲۶۷)

''اپنی کمائی میں سے عمدہ چیز کو خرچ کیا کرو۔''

مَا كَسَبْتُمْ سے مطلب ہی ہے کہ جو کچھ تم کماتے ہو، وہ تمہاری ملکیت ہے۔''[۱]

۳...... ''اسلام نے بھی ایک ٹیکس (زکوٰۃ) مقرر کیا ہے جو بہر حال وصول کیا جاتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (۹/۱۰۳)

''ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے، کہ اس سے یہ ظاہر و باطن میں پاک ہو جائیں اور پھر ان کے لیے دعا کیجیے۔''

لیکن اس کے ساتھ ہی، اس نے خیرات کا بھی حکم دیا ہے جس میں جبر و کراہ کو دخل نہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ دیجئے کہ جتنا آسان ہو۔''

اس کے علاوہ، جہاں دنیاوی قوانین سے، محض قومی افادیت اور ملکی مفاد مقصود ہوتے ہیں، وہاں اسلامی انفاق میں، ان مفادات کے ساتھ تزکیۂ قلوب و نفوس بھی پیشِ نظر ہے، ایک طرف، قوم کے محتاج مفلوک الحال افراد کی دستگیری مقصود ہے، تو دوسری طرف معطی کے قلوب کو حُبِّ مال کی خباثت سے پاک، اور اس کی جگہ، ایثار و قربانی کے جذبہ کی پرورش کرنا بھی مطلوب ہے، یہ دوسرا مقصد، اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ انسان، ارادہ و اختیار کے باوجود، اپنی پاک کمائی اور جائز ملکیت میں سے بہ خوشی خرچ کرے۔''[۲]

۴...... ''اشتراکیت کے اصول نفی املاک سے، اسلام کا معاشی، تمدنی، عمرانی ہر

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۰ + تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۶

[۲] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۱ + تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۷

قسم کا نظام منہدم ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا(۱۷/۲۶)

''قرابتدار کو اس کا حق دیتے رہنا اور محتاج اور مسافر کو بھی، اور مال کو بے موقع فضول خرچی میں نہ اڑانا۔''

ظاہر ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی، اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کوئی چیز کسی کی ملکیت میں ہو، اگر ہر چیز غیر کی ملکیت ہو، اور کمانے والے کو صرف اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے، تو وہ دوسروں کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے۔''[۱]

۵ ......'' قرآن کریم، انسان کو اس کی محنت کے ماحصل کا مالک قرار دیتا ہے، لیکن اس کی اجازت کسی کو نہیں دیتا کہ دولت کے انبار، ایک جگہ جمع کر کے رکھ لیے جائیں، کیونکہ ''دولت'' کے معنٰی ہی ''گردش کرنے'' کے ہیں، جب وہ گردش (Circulation) سے رک جائے، تو دولت نہیں رہتی، نوع انسانی کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔''[۲]

''مفکر قرآن'' کے تضادات:

''مفکر قرآن'' کے قلم سے نکلے ہوئے، مشتے نمونہ از خروارے، ماضی کے ان اقتباسات کو دیکھئے، جن میں ذاتی ملکیت، نجی املاک اور پرائیویٹ پراپرٹی کا جواز، از روئے قرآن، پیش کیا گیا ہے، اور پھر بعد کے ان سینکڑوں اقتباسات کو بھی دیکھئے، جن میں نجی ملکیت کی نفی پر......اور وہ بھی قرآن ہی کی رو سے......زور دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی، ''مفکر قرآن'' کی اس تحدی کو بھی ملاحظہ فرمایئے جس میں بڑی بلند آہنگی سے یہ کہا گیا ہے کہ:

''میں نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا، ۱۹۸۰ء میں بھی وہی کہتا ہوں، کیونکہ یہ قرآنی حقائق پر مبنی ہے، اور قرآنی حقائق ابدی اور غیر متبدل ہیں، قرآن کو

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۸ + تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۴

[۲] طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۳۸

سند اور حجت ماننے والے کے لیے، یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے، اور کل کچھ اور، قرآن کا متبع نہ مداہنت کر سکتا ہے اور نہ کسی سے مفاہمت۔"[1]

طلوع اسلام، ہر بار وہی کہتا ہے، جو اسے قرآن بتاتا ہے۔"[2]

گویا متحدہ ہندوستان میں "مفکر قرآن" کو قرآن نے یہ بتایا تھا کہ ذاتی ملکیت اور پرائیویٹ پراپرٹی رکھنا جائز ہے، اور تقسیم ملک کے بعد، خود قرآن ہی نے، اپنے پہلے فتوے کی تردید کرتے ہوئے، انہیں یہ بتایا کہ ذاتی اور نجی ملکیت کا تصور بالکل خلاف قرآن ہے، رہی "مفکر قرآن" کی سمجھ بوجھ، اور ان کا فہم و تفقہ، تو وہ گویا سبّوح قدّوس اور معصوم عن الخطا ہیں، اس لیے لامحالہ، قرآن ہی، انہیں مختلف اوقات میں، مختلف باتیں بتانے کا عادی ہو چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "مفکر قرآن" صاحب، پہلے اپنے دل و دماغ میں، کچھ تصورات و افکار، جاگزیں کر لیا کرتے تھے، اور پھر مطلب جویانہ ذہنیت کے ساتھ، ان کی تائید و حمایت میں، قرآن سے "دلائل" کشید کیا کرتے تھے، اس قسم کی ذہنیت کو آخر قرآن کریم سے کیا کچھ نہیں مل سکتا، خود ان ہی کا قول ہے۔

"جب کوئی شخص، قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے، تو اسے، اس سے، اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی۔"[3]

اس طرح "مفکر قرآن" کو، جب اپنی تغیر پذیر مصلحتوں کے تحت، قرآن سے حسب خواہش، کبھی "ذاتی ملکیت کا جواز"، اور کبھی "اس کی نفی کا ثبوت" مل جاتا، تو وہ، قرآن پاک کو اس کی شاعری کی داد دیتے ہوئے، بڑے اطمینان اور مسرّت سے، یہ اعلان فرمایا کرتے تھے، کہ:

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اُجِیبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) "میں

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۸۳ء، صفحہ ۵۲ [2] طلوع اسلام، مئی ۱۹۵۴ء، صفحہ ۲۰

[3] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۳

ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے"۔ حضراتِ انبیاءِ کرام کو بارگاہِ خداوندی سے ان کی پکار کا جواب کس طرح ملتا تھا، یہ تو ہم نہیں جانتے (نہ ہی کوئی غیر از نبی جان سکتا ہے) لیکن میں اتنا اپنے تجربہ کی بناء پر، علیٰ وجہ البصیرت کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ انسانی زندگی کے کسی انفرادی یا اجتماعی مسئلہ (Problem) کے متعلق کلام اللہ (قرآن مجید) کے بابِ عالی پر دستک دیجئے، وہاں سے آپ کو جواب ملے گا، اور نہایت اطمینان بخش جواب۔"[1]

ملکیت مال و دولت ہی نہیں، بلکہ ہر مسئلہ کے متعلق، ہر دور میں، "مفکرِ قرآن" صاحب کو، قرآن کریم سے اسی طرح "نہایت اطمینان بخش جواب" ملتے رہے، بغیر اس بات کی پرواہ کرتے ہوئے، کہ ان جوابات میں کس قدر اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔

ذرا غور فرمایئے، کہ قیامِ پاکستان سے قبل بھی اور بعد بھی، ایک ہی قرآن، ایک ہی متن الفاظ پر مشتمل تھا، لیکن افقِ پاکستان پر "طلوعِ اسلام" ہوا، تو ذاتی ملکیت کا وہی تصور، باطل اور شرک قرار پا گیا، جو برصغیر کی تقسیم سے قبل، از روئے قرآن، نہ صرف حق تھا، بلکہ ناگزیر بھی تھا، کیونکہ ذاتی ملکیت کے بغیر، "اسلام کا معاشی، تمدنی اور عمرانی، ہر قسم کا نظام منہدم ہو جاتا ہے۔"

"مفکرِ قرآن" کا ایک سطحی اور بیجا دعویٰ:

بعض اوقات، "مفکرِ قرآن" صاحب، ایسا بیجا اور سطحی نوعیت کا دعویٰ کر ڈالتے ہیں کہ قرآن کا سرسری مطالعہ کرنے والا شخص بھی ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے، اور سوچنے لگتا ہے کہ آیا یہ بات، اس "مفکرِ قرآن" ہی کے قلم سے نکلی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہر وقت قرآن اس کے سامنے کھلا رہتا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ:

"خدا کے عطا کردہ مال کو، وہ "اموال الناس" یا "اموالکم" (تمہارا مال)

---

[1] طلوعِ اسلام، اکتوبر نومبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۲۶ تا ۲۷

کہہ کر پکارتا ہے، زمین کو اس نے کبھی بھی ''ارض الناس'' نہیں کہا۔''[۱]

اگر ''مفکر قرآن'' کے دماغ پر، اپنے خود ساختہ موقف کے اثبات کی دھن سوار نہ ہوتی، اور انہوں نے قرآن کو کھولے رکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھا بھی ہوتا، تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جس طرح، اللہ تعالیٰ نے ''مال اللہ'' کہنے کے باوجود، اَمْوَالکُم کے الفاظ سے، زر دولت کو لوگوں کی طرف نسبت دی ہے بالکل اسی طرح، اُس نے ''ارض اللہ'' کہنے کے ساتھ ساتھ، اَرْضَکُمْ اور اَرْضَھُمْ کے الفاظ سے، زمین کو بھی، لوگوں کی طرف منسوب اور مضاف کیا ہے، اور خود ''مفکر قرآن'' کے ترجمہ کی رُو سے بھی، یہ نسبت اور اضافت، ملکیت اور پراپرٹی کو واضح کرتی ہے، صرف ایک آیت مع ترجمۂ پرویز صاحب ملاحظہ فرمایئے۔

وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَدِیَارَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ وَاَرْضًا تَطَؤُھَا (۳۳/)

''اور ہم نے تمہیں ان کی زمینوں، ان کے گھروں اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا، اور (ایسی) زمین کا بھی (مالک بنا دیا) جس پر تم نے ابھی قدم (تک) نہیں رکھا۔'' [۲]

پرویز صاحب کے ذہنی تغیرات کے ادوارِ ثلاثہ:

معاشی افکار کے لحاظ سے، ذہنِ پرویز، تغیر و تبدل کے تین مراحل میں سے گزرا ہے، ذاتی ملکیت کے جواز و عدم جواز کے لحاظ سے ادوار ثلاثہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) قرآن، فرد یا اجتماع، ہر ایک کے لیے ذاتی ملکیت کا اثبات و جواز پیش کرتا ہے۔

(۲) انفرادی ملکیت کی نفی، لیکن اجتماعی ملکیت کا جواز۔

(۳) انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ملکیت کی نفی اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ یہ کفر و شرک ہے۔

---

[۱] طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۶

[۲] معراج انسانیت، صفحہ ۲۶۶

پہلا دور:

جہاں تک پہلے مرحلے کا تعلق ہے، طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء کے اقتباسات، جو پہلے گزر چکے ہیں، اس پر شاہد عدل ہیں، جو سوشلزم کے مقابلہ میں، اسلام میں شخصی اور ذاتی ملکیت کے جواز پر دال ہیں، اس لیے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، کچھ اقتباسات، آگے بھی آ رہے ہیں۔

دوسرا دور:

دوسرے دور (یا دوسرے مرحلے) میں ''مفکرِ قرآن'' نے انفرادی ملکیت کا باطل اور ناجائز ہونا تو قرآن سے کشید کر لیا، لیکن اجتماعی ملکیت کے تصور کو علیٰ حالہٖ (جواز پر) برقرار رکھا، چنانچہ اس دور کے اقتباسات میں، انفرادی ملکیت کی نفی کے پہلو بہ پہلو، اجتماعی ملکیت کے جواز کا ذکر بھی ملتا ہے، درج ذیل اقتباسات، اس امر کو واضح کر دیتے ہیں۔

۱...... ''جہاں تک سلیم! میری قرآنی بصیرت میری رہنمائی کرتی ہے، میں دیکھتا ہوں کہ قرآن، زمین پر انفرادی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا، زمین کو وہ ملت اسلامیہ (نظامِ حکومتِ قرآنیہ) کی ملکیت قرار دیتا ہے، جو اسے ہر شخص کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرتی ہے۔'' [۱]

۲...... ''ہم مسلمانانِ پاکستان اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا دستور، قرآن کی ابدی صداقتوں پر مبنی ہوگا (i) ...... (ii) ...... (iii) تمام وسائل پیداوار، مملکت کی ملکیت قرار پائیں گے، اور فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں انسانیت کی نشو و نما کے لیے، کام میں لانے کا فریضہ، مملکت پر عائد ہوگا۔'' [۲]

۳...... ''جو اموال، انفرادی تحویل میں ہوں، ان پر افراد وکالتی حیثیت سے تصرف کا حق رکھتے ہیں، ورنہ وہ سب جماعت کی ملکیت ہوتے ہیں۔'' [۳]

---

۱ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۴۹ء، صفحہ ۴۹ ۔ ۲ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۰ء، صفحہ ۳۹

۳ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۵۶

۴...... ''زمین تو زمین، اسلام کسی قسم کی چیز میں بھی، انفرادی ملکیت کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا، وہ انتفاع اور استفادہ کے لیے، افراد کی تحویل میں، وکالتی حیثیت سے اموال دے دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا، مگر ملکیت، بہرحال، جماعت ہی کی رہتی ہے، زمین بھی اصولی طور پر اس سے خارج نہیں ہے، لیکن خصوصی طور پر، زمین کے متعلق بھی، ہمیں اس قسم کے اشارات ملتے ہیں، جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ زمینیں، جو افراد کی تحویل میں تھیں، وہ مرکز ملت ہی کی ملکیت، متصور ہوتی تھیں، نہ کہ افراد کی۔'' [۱]

۵...... ''یہ امور صاف غمازی کر رہے ہیں کہ حضرت عثمان کے عہد تک، زمینیں، خود مملکت کی ملکیت ہوا کرتی تھیں، افراد کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔'' [۲]

آپ کا جی چاہے تو ان اقتباسات کو، سابقہ عبارات کے ساتھ متناقض اور متصادم سمجھ لیجیے، اور جی چاہے، تو یہ سمجھ لیجیے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، روشنی سے تاریکیوں کی طرف (مِنَ النُّورِ اِلَی الظُّلُمَاتِ)، اپنے فکری سفر میں، درکہ بدرکہ، اور رفتہ رفتہ جہالت کی دلدل میں پھنستے اور گہرے ڈوبتے چلے گئے ہیں، حتّٰی کہ:

تیسرا دور:

تیسرے دور میں وہ مملکت، یا مرکز ملت، یا جماعت یا نظامِ حکومتِ قرآنیہ کے حق ملکیت سے بھی منحرف ہو گئے، اور انفرادی یا اجتماعی، کسی نوع کی ملکیت کے بھی قائل نہ رہے، اور لطف کی بات یہ کہ ہر بدلتا ہوا موقف، ''قرآن کی روشنی'' ہی میں اختیار کیا گیا، اور آخری دور میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ

''قرآنی نظام حیات کی ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ زمین تمام نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ ہے، اس لیے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں ہے، خواہ یہ ملکیت عام افراد کی ہو، خواہ صاحب اقتدار طبقہ کی، جسے عہد حاضر میں مملکت کی اصطلاح

---

[۱] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۳ [۲] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۶

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔'' [1]

اس کے بعد، ''مفکر قرآن'' نے یہ کہنے کی بجائے کہ ''زمین مملکت کی ملکیت میں رہے گی''۔ یہ کہنا شروع کر دیا کہ ''وہ مملکت کی تحویل میں رہے گی''، اس طرح وہ مطمئن اور شادمان ہو گئے کہ خدا کی کتاب، ''ماشاء اللہ'' ''ہر دور کے تقاضے پورے کرنے'' کے قابل ہے، اور نئی نسل کو بھی، یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ ہر بدلتے ہوئے دور میں، اسے قرآن کی ''تعبیر نو'' کا حق مل گیا ہے۔

خارزارِ تضادات کا ایک اور گوشہ - حقِ ملکیت یا حقِ انتفاع؟

''مفکر قرآن'' کے خارزار تضادات کا ایک گوشہ، وہ بھی ہے، جو حق ملکیت یا تصور ملکیت کے مفہوم سے تعلق رکھتا ہے، وہ ملکیت کی تعریف، بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

> ''سوال یہ ہے کہ ملکیت کسے کہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد، تصرف اور انتفاع کی ملکیت ہی ہے، اگر کسی مال میں، انتفاع اور تصرف کا حق نہیں، تو وہ اس کا مالک نہیں کہلاتا۔'' [2]

عائلی کمیشن کے سوالنامہ میں مذکور، ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے، پرویز صاحب نے لکھا تھا کہ:

> ''مرنے والے کا حق ملکیت، اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد، جن لوگوں تک اس کا ترکہ قانوناً پہنچتا ہے، وہ اس پر حق ملکیت رکھتے ہیں۔'' [3]

ان دونوں اقتباسات سے واضح ہے کہ ملکیت سے مراد ''تصرف کا اختیار، اور فائدہ اٹھانے کا حق'' ہے جو مرنے کے بعد، ورثۂ میت کو منتقل ہو جاتا ہے، لیکن ایک دوسرے مقام پر ''مفکر قرآن'' صاحب، قرآنی لفظ اَلْمَتَاع کی آڑ میں ''ملکیت کی نفی'' کرتے

---

[1] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۴۹ [2] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۵۳

[3] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۶ء، صفحہ ۲۰ تا ۲۱

ہیں حالانکہ دونوں کے مفاہیم میں ''فائدہ اٹھانے کا حق'' موجود ہے، ملاحظہ فرمایئے،

المتاع کی تشریح:

> ''المتاع، اس چیز کو کہتے ہیں جس سے تھوڑے وقت کے لیے فائدہ حاصل کیا جائے، (تمتع کے معنٰی فائدہ حاصل کرنے Utility کے ہیں، ملکیت کے نہیں) ،اس سے بھی قرآن کریم نے، اپنے پیش کردہ معاشی نظام کی طرف اشارہ کر دیا یعنی یہ بتا دیا کہ دنیا میں سامان رزق، فائدہ حاصل کرنے کے لیے ہے ملکیت میں لینے کے لیے نہیں۔'' [1]

سوال یہ ہے کہ جب اَلْمَتَاع اور تَمَتُّع کا مفہوم بھی ''دنیا کی عارضی زندگی میں کسی چیز سے فائدہ اٹھانا'' ہے، اور ملکیت کا تصور بھی ''حق انتفاع'' سے عبارت ہے، تو پھر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، حق تمتع، حق ملکیت، اور حق انتفاع، ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ٹھہرے، پھر آخر یہ کیا کہ ایک مقام پر ''حق انتفاع'' کو ملکیت کا نام دے کر جائز ٹھہراتے ہیں، اور وہ یہاں تک کہ...... ''اگر کسی کو مال میں، انتفاع اور تصرف کا حق نہیں، تو وہ اس کا مالک نہیں کہلاتا'' ...... اور یہی حق انتفاع، میت کے بعد، اس کے وارثوں کو منتقل ہو جاتا ہے، اور پھر دوسرے مقام پر، اسی ''حقِ انتفاع'' کو، وہ اَلْمَتَاع اور تَمَتُّع کا نام دیتے ہیں، تو ملکیت کی نفی کر ڈالتے ہیں، اور یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ...... ''تمتع کا معنٰی ''فائدہ حاصل کرنے (Utility) کے ہیں، ملکیت کے نہیں۔'' آخر یہ کیا؟

تضاد ہی تضاد:

''مفکر قرآن'' صاحب کے جملہ تضادات کا کُلّی احاطہ تو ممکن نہیں ہے کہ:

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

البتہ، اسی حق ملکیت اور حق انتفاع کے ضمن میں یہ تضاد بھی ملاحظہ فرمایئے جو عائلی کمیشن کی طرف سے ایک سوال کے جواب سے تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۲، صفحہ ۱۲۸

سوال :...... کیا ایسا قانون بنانا جائز ہوگا کہ ایک مسلمان ، کسی جائیداد کو، کسی کے نام ، اس شرط پر منتقل کردے کہ جسے منتقل کی گئی ہے ، اس کی وفات کے بعد، وہ جائیداد، منتقل کرنے والے یا اس کے ورثاء کی طرف عود کر آئے گی؟

جواب:...... قرآن کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق انتفاع نہیں بلکہ حق ملکیت ہی، دوسروں کی طرف منتقل کیا جائے ، لہٰذا اس قسم کا قانون ، قرآنی منشاء کے خلاف ہوگا۔'' [1]

یہ جواب واضح کرتا ہے کہ حق انتفاع اور حق ملکیت دو متغائر چیزیں ہیں چنانچہ میّت کی طرف سے جس حق کا منتقل کیا جانا، منشاء قرآنی ہے وہ حق انتفاع نہیں بلکہ حق ملکیت ہے۔ یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

اولاً یہ کہ، قرآنی منشاء کی رو سے حق ملکیت اور حق انتفاع میں تغایر اور تباین واضح ہے، جبکہ گذشتہ ایک اقتباس میں حق تصرف اور حق انتفاع ہی کو حقِ ملکیت قرار دیا گیا ہے، تکرار کی کوفت کے باوجود، اس اقتباس کو دوبارہ پیش کیا جارہا ہے:

''سوال یہ ہے کہ ملکیت کسے کہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد، تصرف اور انتفاع کی ملکیت ہی ہے، اگر کسی کو مال میں انتفاع اور تصرف کا حق نہیں تو وہ اس کا مالک نہیں کہلاتا۔'' [2]

عائلی کمیشن کے سوال کے جواب میں ، حق انتفاع کی نفی کر کے صرف حق ملکیت ہی کے ورثائے میت کی طرف منتقل ہونے کا اثبات کر کے، دونوں میں تفاوت ظاہر کیا گیا ہے، جبکہ مفہوم ملکیت کی توضیح والے اقتباس میں، دونوں کو ایک ہی قرار دیا گیا ہے، کیا یہ کھلا ہوا تضاد نہیں ہے؟

ثانیاً یہ کہ ، از روئے قرآن ، میت کا حق ، اس کے ورثاء کو منتقل ہوجاتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ حق ملکیت کا مأخذ، خود قرآن ہے، جیسا کہ پرویز صاحب کے ان اقتباسات سے بھی واضح ہے جو (طلوع اسلام ، جولائی ۱۹۳۹ء کے شمارہ میں سے) پہلے

---

[1] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۶ء، صفحہ ۲۰ [2] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۵۳

پیش کیے جا چکے ہیں، لیکن ''مفکرِ قرآن'' کی آنکھوں پر، جب اشتراکیت کی عینک چڑھ گئی، تو حقِ ملکیت کا مأخذ ہی بدل گیا۔

''حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی ذاتی ملکیت کا تصور، اس دور کا پیدا کردہ ہے، جب مسلمانوں میں ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری آ چکی تھی۔'' [1]

''مفکرِ قرآن'' کی اس ''تحقیقِ انیق'' پر غور فرمایئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ حقِ ملکیت (جو موت کے باعث، میت سے اس کے وارثوں کو منتقل ہو جاتا ہے) قرآن کا عطا کردہ ہے؟ یا دورِ استبداد اور زمانہ سرمایہ کاری کا پیدا کردہ ہے؟

☆......☆......☆

---

[1] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۶۹

باب سوم

ملکیتِ اراضی اور قرآنِ مجید

ملکیت اراضیٰ کے متعلق، صاحبِ تفسیر مطالب الفرقان کا موقف یہ ہے کہ

''ارض، پیداوار کا بنیادی ذریعہ ہے اور اس کے متعلق قرآن کریم نے باصرار و تکرار کہہ دیا ہے کہ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی، نہ کسی فرد کی، نہ افراد کے کسی گروہ کی۔'' [۱]

............''زمین پر کسی شخص کی انفرادی ملکیت قائم نہیں ہوسکتی''...... یہ وہ بات ہے جسے پرویز صاحب نے اپنی متعدد تصانیف میں بتکرار و اصرار دہرایا ہے، ملکیتِ زمین کے مسئلہ میں مابہ النزاع چیز یہ نہیں کہ اس کا اصل مالک خدائے قدوس ہے یا انسان؟ (ہر مسلمان، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ زمین کیا، کائنات کی ہر چیز، حتّٰی کہ خود، انسان بھی، اور اس کی ہر چیز بھی، اللہ ہی کی ملکیت ہے)، اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ آیا اللہ کے حکم کے تحت خدائی قانون کی رو سے، اللہ کی عطا و عنایت سے بھی کوئی شخص، زمین کا مالک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ جناب پرویز صاحب کے نزدیک وسائل پیداوار، خواہ وہ بصورت زمین ہوں یا بصورت زر و دولت، فطری ہوں یا مصنوعی، کسی شخص کی ملکیت نہیں ہوسکتے۔

''قرآن کریم، کسی کے پاس فاضلہ دولت رہنے نہیں دیتا، اور وسائل پیداوار پر (خواہ وہ فطری ہوں یا مصنوعی) کسی کی ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔'' [۲]

اسی بنیاد پر، پرویز صاحب، ذاتی ملکیت کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ قرآنی

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۲۹۶ [۲] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۳

الفاظ لَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا کا مفہوم ہی یہ بیان کرتے ہیں کہ:

کسی کو زمین کا مالک سمجھنا، اسے خدا کا شریک بنانا ہے (۲/۲۲) ...... زمین کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہ سمجھنا (یعنی کسی انسان کو زمین کے رقبے کا مالک قرار دینا) کفر ہے شرک ہے لَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (۲/۲۲؛ ۲۳/۸۴؛ ۱۰،۹/۴۱) سوائے مسلمانو! دیکھنا تم خدا کے شریک اور ہمسر نہ کھڑے کر دینا۔''[1]

''مفکر قرآن'' کے قلب و ذہن اور حواس و مشاعر پر ذاتی ملکیت کی نفی کی ایسی دُھن سوار تھی، کہ انہیں اس بات کا ہوش ہی نہیں رہا کہ لَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا کا خطاب مسلمانوں سے نہیں، بلکہ جملہ عامۃ الناس سے ہے، سلسلہ کلام کا آغاز ہی یَاأَیُّهَا النَّاسُ کے خطاب سے ہو رہا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' اسے مسلمانوں سے وابستہ کرتے ہوئے، یوں ترجمہ کرتے ہیں کہ...... ''سوائے مسلمانو! دیکھنا، تم خدا کے شریک اور ہمسر نہ کھڑے کر دینا......''

الارض للّٰہ اور الحکم للّٰہ:

اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ کا یہ مفہوم، تو ایک متفق علیہ حقیقت ہے کہ زمین بلکہ پوری کائنات کا اصلاً مالک، اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر یہ کہ وہ کسی کو، اس کی آزمائش کے لیے، عارضی طور پر بھی، زمین کے کسی حصے کا مالک نہیں بنا سکتا (یا نہیں بناتا) ہے، خلافِ حقیقت ہے۔ جس طرح قرآن کریم نے اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ کہہ کر، ملکیتِ زمین کو، اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے، بالکل اُسی طرح وہ اَرْضُنَا، اَرْضُکُمْ اور اَمْوَالُکُمْ کے الفاظ سے مال و دولت اور زمین کی ملکیت کو، افراد کی طرف بھی منسوب کرتا ہے، اور جب کوئی شخص، خدا کی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے، اُسی کے قوانین کے مطابق، زمین پر تصرف کرتا ہے، اور خدا ہی کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر ایسا کرتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے ملکیتِ زمین سے بے دخل کیا

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۸۰، ۲۸۱

جائے۔ اب دیکھئے! قرآن نے جس طرح اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کہا ہے، بالکل اسی طرح اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ (۱۲/) کے ساتھ ساتھ، یہ کہتے ہوئے بھی کہ وَلَا یُشْرِكُ فِی حُکْمِہٖ اَحَداً (۱۸/۲۶)، قرآن برملا یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جملہ انبیاء کو اَلْحُکْمُ دیا ہے، اُولٰئِكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنَاھُمُ الْکِتَابَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ (۶/۹۰) پس جس طرح فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ کی حقیقتِ قطعیہ کے بعد، خدائے قدوس کا کسی کو، اپنے اَلْحُکْم سے سرفراز فرمانا، لَہُ الْحُکْمُ کے منافی نہیں ہے بالکل اُسی طرح اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کے ارشادِ خداوندی کے بعد اَرْضَکُمْ، اَرْضَھُم، اور اَمْوَالُھُمْ وغیرہ کے الفاظ میں مذکور، ملکیتِ مال و دولت کو، افراد کی طرف، منسوب کرنا بھی، خلافِ قرآن نہیں ہے۔

الارض للّٰہ کی وضاحت، ایک اور مثال سے:

قرآن کریم سے اس قسم کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے، قرآنِ کریم، استفہامِ انکاری کے اسلوب بیان میں، یہ واضح کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حَکَم نہیں ہے، اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِی حَکَماً (۶/۱۱۵) ''پھر کیا میں، اللہ کے سوا کوئی دوسرا حکم تلاش کرلوں۔'' اس کے بعد، قرآن، خود، ایک معاملہ میں یہ حکم دیتا ہے۔

فَابْعَثُوا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِنْ اَھْلِھَا . (انساء: ۳۵)

''(میاں بیوی کے باہمی نزاع کی صورت میں) ایک حَکَم شوہر کے خاندان سے، اور ایک حَکَم بیوی کے خاندان میں سے مقرر کرلو۔''

اب قرآن، خود ہی یہ کہہ کر، کہ...... ''اللہ کے سوا کوئی حَکَم نہیں ہے، اہل ایمان کو، ایک ازدواجی معاملے میں حَکَم بنانے کا حکم دیتا ہے، تو اسکا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ خدا ہی کے فرمان کے تحت، کسی کو حَکَم بنانا، اس امر کے منافی نہیں ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی حَکَم نہیں ہے۔'' بالکل یہی حال، ملکیتِ زمین کا ہے کہ خدا کے اذن و حکم کے تحت، کسی شخص کا مالک زمین بن جانا، اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کی حقیقت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ قرآن، اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کے اعلان کے ساتھ یہ بھی، برملا کہتا ہے کہ:

هُوَ الَّذِی خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ:۲۹)

''وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کی ہیں۔''

بہر حال، کوئی شخص، زمین کی شخصی اور انفرادی ملکیت کے بارے میں، پہلے سے اشترا کی نقطۂ نظر کو قبول نہ کر چکا ہو تو اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کے الفاظ سے، وہ مفہوم، کشید نہیں کیا جا سکتا، جو کیا جا رہا ہے۔

ذرائع آمدنی کی ملکیت اور قرآن مجید:

دور نزول قرآن میں، لوگوں کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ، جانوروں اور مویشیوں کی تجارت اور خرید و فروخت بھی تھی، بلکہ بار برداری کے لیے بھی، اور دیگر مقاصد کے لیے بھی، بار بردار جانور کرایہ پر بھی چلتے تھے، قرآن کریم کی رو سے یہ جانور اور مویشی بھی، اصلاً، اللہ ہی کی ملکیت ہیں، لیکن قرآن، انہیں، افرادِ انسانی کی بھی ملکیت قرار دیتا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِکُوْنَ

(یٰس: ۷۲)

''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں میں سے، ان کے لیے مویشی پیدا کیے ہیں، جن کے یہ لوگ مالک ہیں۔''

جس طرح، آج کے دور میں ٹرک، ٹرالی، ٹریکٹر، ٹرالے، مال گاڑیاں، ہوائی جہاز، وسائل نقل و حمل اور ذرائع پیداوار ہیں بالکل اسی طرح، دور نزول قرآن میں، مویشی، ذرائع آمدن تھے، ان پر شخصی ملکیت کو قرآن نے فَهُمْ لَهَا مَالِکُوْنَ کہہ کر واضح کر دیا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' کے ایک فکری ہم نوا، آیت کی یہ تاویل کرتے ہیں۔

''فَهُمْ لَهَا مَالِکُوْنَ کہہ کر، قرآن نے، افراد کی مالکانہ حیثیت کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ ان پر تعریض کی ہے کہ وہ ان مویشیوں کے مالک بن بیٹھے ہیں، جن کو خود، انہوں نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔'' [1]

---

[1] خلاصہ عبارت از فقہ القرآن، جلد ۱، صفحہ ۲۶۶ تا ۲۶۷

لیکن یہ تاویل درست نہیں ہے کیونکہ قرآن نے یہاں لوگوں کو، اللہ کی نعمتوں کی طرف متوجہ کیا ہے، مویشیوں کو پیدا کر کے، انہیں، بنی نوع انسان کے لیے مطیع و منقاد کرتے ہوئے، ان کی ملکیت میں سونپ دینا، خدا کا وہ احسان، انعام اور فضل و رحمت ہے جس پر انسان کو متوجہ الی اللہ کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی آیت، بنی نوعِ انسان کے حق میں، تعریض کا پہلو رکھتی ہے یا تحدیثِ نعمت کا؟ خود پرویز صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

''سورہ یٰسین میں فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ کے بعد ذَلَّلْنٰهَا (۳۶/۷۲) نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مالک وہ ہے جسکے تابع، دوسرا ہو جائے۔'' [1]

یہاں بنی نوع انسان کے سامنے، جانوروں کو اس طرح تابع قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان کی ملکیت قرار پاتے ہیں، ایک اور مقام پر، پرویز صاحب، نے، آیت کے الفاظ مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ سے، اپنا خوب صورت استدلال، بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

''جب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں، انسان کی ملکیت ہو سکتی ہیں، تو انسان کی اپنی کمائی اور مصنوعات، تو یقیناً اس کی ملکیت ہوں گی۔'' [2]

ماملکت ایمانکم:

علاوہ ازیں، قرآن پاک نے غلاموں، لونڈیوں اور دیگر اشیاء کے لیے، مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ''جنکے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، حضور اکرم ﷺ کے متعلق، قرآن کریم نے مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ''جس کا مالک تمہارا داہنا ہاتھ ہوا'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، یہ الفاظ بجائے خود شخصی ملکیت کی کھلی دلیل ہیں، اسلام نے اس معاملے میں صرف یہ اصلاح فرمائی ہے کہ انسان پر، انسانی جان کے حق ملکیت کو تدریجاً ساقط کر دیا ہے، اس کے علاوہ باقی اشیاء پر، جن میں پیداوار کے جملہ ذرائع و وسائل بھی شامل ہیں، ذاتی ملکیت کے اصول کو برقرار رکھا ہے، واضح رہے کہ کلمہ ''مَا'' اصلاً بے جان

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۵۵۷ [2] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۸

اشیاء ہی کے لیے آتا ہے (بجز چند مستثنیات کے) اور کلمہ ''مَن'' جاندار اشیاء کے لیے مستعمل ہے، اس لیے اب مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے الفاظ میں، انسانی جان کی ملکیت کے تدریجی خاتمے کے بعد، دیگر بے جان اشیاء کی ملکیت کا حق، بہرطور، مسلّم ہے، چونکہ شخصی ملکیت کی یہ بحث آگے بھی آ رہی ہے، اس لیے یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اشیاءِ مستعملہ اور ذرائع پیداوار:

البتہ ایک چیز کی وضاحت ضروری ہے، اور یہ وضاحت ''مفکر قرآن'' کے اس خود ساختہ نظریہ سے متعلق ہے جسکے تحت، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ

''اگر کسی کا کوئی ترکہ ہوگا تو وہ ان اشیاء مستعملہ تک محدود ہوگا جنہیں حکومت نے ذاتی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دے رکھی ہوگی۔''[۱]

میں نے پرویز صاحب کا جملہ لٹریچر پڑھ ڈالا ہے اِلَّا مَاشاء الله ! مجھے کسی مقام پر بھی، ان کے اس فرق و تفاوت کی کوئی قرآنی دلیل نہیں مل پائی، جو انہون نے ''اشیاء مستعملہ'' اور ''ذرائع پیداوار'' میں کیا ہے، اور پھر اس کی بنیاد پر، وہ، اول الذکر کی ذاتی ملکیت کے قائل ہیں اور ثانی الذکر کی شخصی ملکیت کے منکر ہیں، قرآن سے اگر ذاتی ملکیت کا اثبات ہوتا ہے، تو یہ اثبات دونوں قسم کی اشیاء پر مشتمل ہے، اور اگر بقول پرویز صاحب، قرآن، ذاتی ملکیت کی نفی کرتا ہے، تو یہ نفی بھی، ان دنوں قسم کی اشیاء کو محیط ہے، شخصی ملکیت کے بطلان پر قرآن سے دلیل کشید کرنا، اور پھر دلیل میں سے ایک قسم کی اشیاء کو خارج کرنا، اور دوسری نوعیت کی اشیاء کو داخل کرنا، قطعی طور پر غیر قرآنی طرز عمل ہے، جو قرآن کا نام لیکر اختیار کیا جاتا ہے۔

زمین کی شخصی ملکیت کا وجود، صدرِ اسلام میں:

بہرحال، زمین کی شخصی ملکیت کی نفی پر، قرآن میں سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے، پھر عملاً، قرآن کی بنیاد پر، جو معاشرہ، عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں متشکل ہو چکا تھا، اس

---

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد۳، صفحہ ۱۸۴

میں ایسے بیشمار واقعات موجود ہیں جو زمین کی شخصی ملکیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں مگر میں ان بیشمار واقعات کو، صرف اس لیے پیش نہیں کرسکتا کہ پرویز صاحب، اوران کے مقلدین یہ کہہ دیں گے کہ یہ سب تاریخی واقعات ہیں، اور

''دین میں سند، نہ تاریخ کے مشمولات ہیں ، اور نہ مسلمانوں کے متواتر و متوارث عقائد ومسالک، سند ہے خدا کی کتاب۔'' [1]

اس لیے میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ ان بیشمار واقعات سے صرف نظر کرلوں، تاہم مجھے ان واقعات کو پیش کرنے کا پورا پورا حق ہے، جو پرویز صاحب کی ''قرآنی بصیرت'' کی کسوٹی پر پورے اتر کر، ان کی کتب میں، استشہاداً (نہ کہ تردیداً) جگہ پا چکے ہیں۔

عہد نبوی میں شخصی ملکیت زمین:

غزوہ خیبر میں اہل ایمان کو فتح نصیب ہوئی، یہود نے صلح کی درخواست کی، جس کے نتیجہ میں:

''یہودیوں کی زمین، ان سے لے لی گئی، اس زمین کا نصف بیت المال میں، تمام ضروریات کے لیے رکھ لیا گیا، باقی نصف مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی، پیدل کو ایک حصہ اور سوار کو دو۔ امیر وقت، امام امت، سالارِ جیش (سپہ سالارِ فوج) حضور اکرم ﷺ کو بھی، عام مجاہدین کے برابر، ایک ہی حصہ ملا۔'' [2]

پرویز صاحب کا یہ اقتباس، اس امر کو شک وشبہ سے بالاتر کر دیتا ہے کہ غزوہ خیبر کے بعد تک، اراضی و اموال میں، ذاتی ملکیت کا اصول رائج تھا، اس بناء پر خیبر کی اراضی کا نصف، مجاہدین میں تقسیم کیا گیا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زمین کی شخصی ملکیت:

حضرت نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی بنیاد پر جو معاشی نظام رائج فرمایا تھا، اس میں

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۱۹۲

[2] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۶۵

افراد کی شخصی ملکیت کا اصول رائج و متداول تھا، یہاں تک کہ خلیفہ اول، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اپنی ملکیت میں بھی کچھ اراضی موجود تھی، جسے آپ کی وصیت کے مطابق فروخت کیا گیا، اور اس معاوضہ کے عوض، جو آپ نے کارِ خلافت انجام دیتے ہوئے بیت المال سے وصول کیا، اس قطعۂ اراضی کی قیمت، داخلِ بیت المال کر دی گئی، خود پرویز صاحب کو بھی اس حقیقت کا اقرار کرتے ہی بنی۔

''خلافت سے پہلے، آپ تجارت کرتے تھے، اور اچھے خوشحال تھے، خلافت کی ذمہ داریوں نے آپ کا سارا وقت لے لیا، تو آپ نے حضرت عمرؓ کی تجویز اور دیگر صحابہ کے مشورہ سے، بیت المال کا وظیفہ لینا قبول کر لیا، لیکن وہ اتنا ہی تھا کہ جس میں آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا غریبانہ انداز میں گزارا ہو سکے، جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا، تو آپ کو یہ خیال بار بار ستا رہا تھا کہ معلوم نہیں، میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے جسقدر لیا ہے، اس کے مطابق، ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں، اس اضطراب کو مبدل بہ سکون کرنے کے لیے، انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے کہا کہ ایک مختصر سا قطعۂ زمین، ان کے پاس ہے، اسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم، انہوں نے بیت المال سے لی ہے، اسے واپس کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور وہ حساب کو یہیں بے باق کر کے خدا کے سامنے گئے۔''[۱]

خلافت راشدہ میں، حضرت ابوبکرؓ صدیق کی ذاتی ملکیت کا یہ واقعہ، جس میں ان کی وصیت کے مطابق، اسے فروخت کر ڈالنے کا بھی ذکر ہے، اسلامی نظامِ معیشت میں زمین کی شخصی ملکیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے جس کا کوئی حق پرست شخص انکار نہیں کر سکتا، پرویز صاحب کا، افراد کی نجی ملکیت کی نفی کرنا، محض اس لیے ہے کہ وہ بدل و جان اشتراکیت پر ایمان لا چکے ہیں، اور پھر اس پیشگی ایمان کے باعث، انہوں نے تحریف کی راہ سے، اسے مشرف بہ

---

[۱] شاہکار رسالت، صفحہ ۳۵۹

اسلام کرنے کی کوشش کی، لیکن بہر حال حقیقت یہی ہے جو بالآخر، ان کے قلم سے ٹپک پڑی، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر اسلام نے شخصی ملکیت کونا جائز قرار دیا ہوتا، تو حضرت ابوبکرؓ کی اپنی ملکیت میں کوئی اراضی رہتی؟ حضرت ابوبکرؓ صدیق وہ شخص ہیں، جو حضور کے محبوب ترین ساتھی ہیں اور سب سے زیادہ انہیں ہی صحبت نبوی کی سعادت حاصل ہوئی ہے، پھر وہ مجمع عام میں اپنی زمین کو فروخت کر ڈالنے کی وصیت کرتے ہیں اور کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ جب اسلام میں شخصی ملکیت کا وجود ہی ثابت نہیں تو آپ کے ہاں یہ اراضی کیسی؟

عہد فاروقی میں زمین کی شخصی ملکیت:

عہد فاروقی میں بھی، لوگوں کو زمین کی شخصی ملکیت کا حق حاصل تھا، اس کی دلیل وہ واقعہ ہے جسے پرویز صاحب نے بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

"رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال، اس کی رضا مندی کے بغیر نہیں لیا جا سکتا، لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں، ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی، صرف اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی، فلاں شخص کی زمین میں سے گزرے اور وہ اس کے لیے رضا مند نہیں حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس کے راستہ میں بالکل مزاحم نہ ہو۔" [۱]

یہ واقعہ، اس حقیقت کو آفتاب نیمروز کی طرح واضح کر دیتا ہے کہ نہ صرف دور نبوت میں بلکہ دور خلفاءِ راشدین میں بھی، افراد معاشرہ کو اراضی کی ذاتی ملکیت کا حق حاصل تھا، اور اس کا نظام معیشت، اسی اصل و اساس پر قائم تھا، اگر اسلام نے افراد کو یہ حق نہ دیا ہوتا اور اراضی، ملکیتِ ریاست ہوتی، اور اس پر کام کرنے والے کی حیثیت محض سرکاری مزارع کی ہوتی، تو پانی کی نالی نکالنے کا یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا، آپ خود سوچئے کہ اگر کسی لینڈ لارڈ کی دو سو مربع اراضی ہو، اور اس پر دو سو مزارع کام کر رہے ہوں، تو اس مزارع کو آقائے زمین کی خواہش کی مزاحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر زمین واقعی

---

[۱] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۴۰

کاشتکار کی ذاتی ملکیت میں ہو، تو بلاشبہ وہ مزاحم ہوسکتا ہے، مگر جب زمین سرے سے اس کی ہے ہی نہیں، اور کوئی دوسرا شخص اس کا مالک ہے، اور مالک ہی کی حیثیت سے، کوئی کھال کیا، نہر بھی کھودنا چاہے، تو مزارع کسطرح مانع و مزاحم ہوسکتا ہے؟ عہد فاروقی کے اس واقعہ میں، ایک شخص کا، دوسرے شخص کو، اپنی زمین سے، پانی کا راستہ دینے میں مزاحم ہونا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود اپنی اراضی کا مالک تھا اس لیے وہ کسی دوسرے شخص کو، بذریعہ کھال، پانی فراہم کرنے کے لیے، اپنی ذاتی زمین کے نقصان کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھا، البتہ حضرت عمرؓ کے فیصلے سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اجتماعی مصالح کے پیش نظر، ذاتی ملکیت کے اصول کو قربان کیے بغیر، مالک زمین کو، اگر کچھ ایثار سے کام لینا پڑے تو اسے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

عراقی زمینوں کے علاوہ دیگر اراضی کی افراد میں تقسیم:

زمین کے افراد کی شخصی ملکیت میں رہنے کا ثبوت، اس امر سے بھی ملتا ہے کہ عہد نبوی اور دور صدیقی میں، ہر قسم کا مال غنیمت (جس میں اراضی بھی شامل تھی) افراد معاشرہ یا مجاہدین میں تقسیم کیا گیا، عہد فاروقی میں مخصوص وجہ سے، عراقی زمین کی تقسیم، عمل میں نہیں آئی، لیکن اس کے علاوہ، ہر قسم کی زمین عام اصول اسلام کے مطابق، تقسیم ہو کر، افراد کی نجی ملکیتوں میں موجود رہی، پرویز صاحب، رقمطراز ہیں:

> ''رسول اللہ اور خلافت صدیقی میں، قانون یہ تھا کہ مال غنیمت، مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، فتح عراق کے وقت، مال غنیمت میں کثیر مزروعہ زمینیں بھی ملیں، سابقہ قاعدہ کے مطابق مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے، لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ان زمینوں کی پیداوار پر ساری امت اور آنے والی نسلوں کا دارومدار ہے، اس لیے انہیں انفرادی ملکیت میں نہیں دیا جا سکتا، یہ مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔''[1]

---

[1] شاہکار رسالت، صفحہ ۲۷۹

عہد فاروقی میں صرف عراقی زمینوں کا تقسیم نہ کیا جانا، اور باقی ممالک کی اراضی و غنائم کا افراد میں تقسیم کیا جانا، خود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلام، نجی ملکیت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کی معیشت، نجی ملکیت ہی کے اصول پر استوار ہے، عہد نبوی، دور صدیقی اور خلافت فاروقی میں، شخصی ملکیت کے اصول کی کارفرمائی کو دیکھتے ہوئے، جب ہم ''مفکر قرآن'' کے اس فتوے کو دیکھتے ہیں جس میں وہ ذاتی ملکیت کو کفر اور شرک قرار دیتے ہیں، تو عہد نبوی، اور خلافت راشدہ کا پورا معاشرہ (معاذ اللہ) کفر و شرک میں ہی ڈوبا ہوا نظر آتا ہے، اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ، یہ کفر و شرک کا زہر، خود رسول اللہ ﷺ اور ان کے پاکباز صحابہؓ ہی کے ہاتھوں تقسیم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ (معاذ اللہ)

ایک طرف مال و دولت اور اراضی کی ذاتی ملکیت میں ہونے کے یہ واضح دلائل اور روشن براہین موجود ہیں، اور دوسری طرف، جب ہم ان استدلالات پر نظر ڈالتے ہیں جو طلوع اسلام نے بالعموم اور پرویز صاحب نے بالخصوص، سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ اور وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ کے قرآنی الفاظ سے کشید کیے ہیں، تو وہ ہمیں بیرونی نظریات کو، قرآن کریم میں گھسیڑنے کی بھونڈی کوششیں دکھائی دیتے ہیں۔

سواءً للسائلین:

ارضی ملکیت کی نفی کا مفہوم کشید کرنے کے لیے، ''مفکر قرآن'' نے آیت (۴۱/۱۰) کو بھی نشانۂ مشق بنایا ہے، چنانچہ وہ، اس آیت میں واقع الفاظ.....سواءً للسائلین..... سے وہ تصور اخذ کرتے ہیں جسے اشتراکیت پر طنز کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ نے ''مساواتِ شکم'' کے الفاظ سے تعبیر کیا تھا، ''مفکر قرآن'' نے اسی تصور پر ''نظام ربوبیت'' کو ایستادہ کر ڈالا، مولانا مودودیؒ نے اس پر تنقید کرتے ہوئے یہ لکھا کہ

> ''موجودہ زمانے میں، جن لوگوں نے مارکسی تصور اشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن ''قرآنی نظام ربوبیت'' کے نام سے نکالا ہے، وہ سواء للسائلین کا ترجمہ ''سب مانگنے والوں کے لیے برابر'' کرتے ہیں، اور اس پر استدلال کی

عمارت یوں اٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لیے برابر خوراک رکھی ہے، لہٰذا آیت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے، ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے، کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں، وہ مساوات قائم نہیں ہو سکتی، جس کا یہ ''قرآنی قانون'' تقاضا کرتا ہے، لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں، یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، صرف انسان ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنہیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہے، کیا واقعی ان سب کے درمیان، یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان، خدا نے سامانِ پرورش میں مساوات رکھی ہے؟ کیا فطرت کے اس پورے نظام میں، کسی جگہ، آپ کو غذا کے مساوی راشن کی تقسیم کا انتظام نظر آتا ہے؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں، جہاں انسانی ریاست نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ریاست، براہ راست تقسیم رزق کا انتظام کر رہی ہے، اللہ میاں، خود اپنے اس ''قرآنی قانون'' کی خلاف ورزی، بلکہ معاذ اللہ بے انصافی کر رہے ہیں، پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ سائلین میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں، جنہیں انسان پالتا ہے، مثلاً بھیڑ بکری گائے بھینس گھوڑے گدھے خچر اور اونٹ وغیرہ۔ اگر ''قرآنی قانون'' یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے، اور اس قانون کو نافذ کرنے کے لیے، نظام ربوبیت چلانے والی، ایک ریاست مطلوب ہے، تو کیا وہ ریاست انسان اور حیوانات کے درمیان بھی معاشی مساوات قائم کرے گی؟'' [1]

''مفکر قرآن'' نے مولانا مودودیؒ کا یہ اقتباس درج کرتے ہوئے، اس پر

[1] تفہیم القرآن، جلد۴، صفحہ۴۴۳ تا صفحہ۴۴۴

پہلے تو ''مضحکہ خیز تفسیر'' کا عنوان جمایا، اور پھر تردید کرتے ہوئے، یوں گوہر افشانی فرمائی۔

''اس تفسیر پر، اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جائے کہ خدا اپنی کتاب عظیم کو، اس قسم کے مفسروں سے محفوظ رکھے، جنہوں نے اسلام کو اضحوکہ (Laughing Stock) بنا دیا ہے، مجھے تو ڈر ہے کہ کل کو اگر ان حضرات سے کہا گیا کہ اسلامی نظامِ عدل کی رُو سے، قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں، تو یہ مفسر، یہ مراد نہ لے لیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں، ہر مجرم کو ایک جیسی سزا ملے گی، اس قسم کے ہیں وہ مفسر، جن کے متعلق، اقبال نے اپنا سر پیٹ کر کہا تھا کہ:

زمن بر صوفی و ملّاں سلامے   کہ پیغام خدارا گفتند مارا
ولے شاں تاویل در حیرت انداخت   خدا و جبرائیل و مصطفےٰ را [۱]

اس کے بعد سواء للسائلین کے الفاظ میں جو مساوات مذکور ہے، اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

قرآنی نظام میں مساوات سے مراد، کمیت (Quantity) کی یکسانیت نہیں، اس سے مراد کیفیت (Quality) کی یکسانیت ہے۔'' [۲]

اس سے مراد کمیت (Quantity) کی یکسانیت ہے یا کیفیت (Quality) کی؟ یہ امر تو بعد میں دیکھا جائے گا، فی الحال تو آپ یہ دیکھئے کہ مولانا مودودیؒ کی شستہ اور شگفتہ تحریر و تنقید پر، ''مفکر قرآن'' نے جو سوقیانہ تبصرہ فرمایا ہے، وہ ان کے ''قرآنی اخلاق'' کو طشت از بام کر دیتا ہے، کیا کسی کی تردید کے لیے، یہ بھی ضروری ہے کہ انسان، ذاتیات پر اتر آئے؟ منکرینِ حدیث کے بالعموم، اور ''مفکر قرآن'' کے بالخصوص، ایسے ہی اوچھے انداز بیان، اور سوقیانہ اسلوب صحافت پر، مودودیؒ صاحب نے، ایک مرتبہ، تبصرہ کرتے

---

[۱] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۶   [۲] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۷

ہوئے یہ لکھا تھا کہ:

''یہ منکرین حدیث، جہل مرکب میں مبتلا ہیں، جس چیز کو نہیں جانتے ، اسے جاننے والوں سے پوچھنے کی بجائے ، عالم بن کر فیصلے صادر کرتے ہیں، اور پھر انہیں شائع کر کے، عوام کو گمراہ کرنا شروع کر دیتے ہیں، ان کی گمراہ کن تحریریں ، ہماری نظر سے گزرتی رہتی ہیں، اور ان کا کوئی اعتراض ایسا نہیں جس کو دلائل کے ساتھ رد نہ کیا جا سکتا ہو، لیکن جس وجہ سے خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے، وہ دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ، اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں، ان کے مضامین پڑھتے وقت، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت سے بھری جھاڑو لیے کھڑا ہو، اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی، مخاطب کے منہ پر، اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا، کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ اس قسم کے لوگ، اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔'' [۱]

اگرچہ مولانا مودودیؒ کے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ایسے لوگوں کے منہ لگتے ، لیکن ان کی تحریروں میں، جہاں کہیں موضوع کی مناسبت کا تقاضا ہوا، وہاں انہوں نے منکرینِ حدیث کے دلائل کا معقول جواب دیا ہے، لیکن انہوں نے پرویز کیا، کسی بھی اپنے مخالفِ معاصر کی تردید کو اپنا وظیفۂ حیات نہیں بنایا، جس طرح کہ پرویز صاحب، نے مولانا مودودیؒ کی مخالفت کو زندگی بھر اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

مولانا مودودیؒ کے اقتباس میں ،واقع اس جملے پر، کہ...... ''آیت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے، ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے، جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے'' ...... ''مفکر قرآن'' نے ان الفاظ میں یہ حاشیہ لکھا ہے:

''معلوم نہیں ،ایسا کس نے کہا ہے۔'' [۲]

---

[۱] رسائل ومسائل، جلد۲، صفحہ ۵۳ [۲] طلوع اسلام، جون۱۹۷۳ء، صفحہ ۵۵+جنوری ۱۹۸۶ء، ص۲۶

بعض اوقات، انسان بات کر کے بھول جاتا ہے، اور مُکر بھی جاتا ہے، ہم نہیں جانتے کہ ''مفکر قرآن'' یہ حاشیہ آرائی کرتے ہوئے، فی الواقعہ بھول گئے ہیں یا مُکر گئے ہیں؟ کیونکہ وہ خود معترف تھے کہ انہیں بھول جانے کا عارضہ بھی لاحق ہے (ملاحظہ ہو، طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۶)، مزید برآں، دروغ گوئی، ان کی عادت بھی تھی۔ بہر حال، اگر وہ کذب گوئی پر اُتر آئے ہوں، یا بھول گئے ہوں کہ ایسا کس نے کہا تھا، تو ہم یاد دلائے دیتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف ایک آدھ مرتبہ، بلکہ بتکرار واعادہ، خود ایسا کہا تھا۔

> ''زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی، اسے اس نے تمام انسانوں کے لیے ذریعۂ رزق بنایا ہے وَسَوَاءً لِلسَّائِلِينَ (۴۱/۱۰)''اس میں ہر ضرورت مند کے لیے برابر کا حصہ ہے۔''

کوثر نیازی صاحب نے، پیپلز پارٹی میں شمولیت کے بعد، ''اسلامی سوشلزم'' کے حق میں لمبی چوڑی تقریر کی، پرویز صاحب نے، اس تقریر کو، اپنے ذاتی خیالات جان کر، اپنے رسالہ میں شائع کیا اور پھر یوں خراج تحسین پیش کیا۔

> ''آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہوں گے، اور دل میں کہہ رہے ہوں گے یہ تقریر ہے پرویز صاحب کی، اور تقریب ہے طلوع اسلام کی کنونشن یا ان کا ہفتہ واری درس۔ لیکن نہ تو یہ پرویز صاحب کی تقریر ہے، اور نہ ہی تقریب طلوع اسلام کنونشن یا ہفتہ واری درس ہے۔ مقرر ہیں مولانا کوثر نیازی صاحب، اور تقریب ہے مرکزی پان فروش یونین کا جلسہ، جو لاہور میں ۱۶ فروری کو منعقد ہوا، اور جس کی روداد، ۱۷ فروری کے روزنامہ مشرق میں شائع ہوئی ہے، اور یہ وہی کوثر نیازی صاحب ہیں، جو ابھی کل تک (اپنے اخبار شہاب میں) پرویز صاحب کے پیش کردہ نظام ربوبیت کا مذاق اڑاتے، اور اسے خلافِ اسلام قرار دیا کرتے تھے، آپ نے غور فرمایا کہ زمانے کے تقاضے، انسان کو کس

---

[1] طلوع اسلام، جون ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۳

طرح قرآنی حقائق کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

''طلوع اسلام، اپنی اس سعادتِ کبریٰ پر، جسقدر بھی فخر و ناز کرے، کم ہے کہ مبداءِ فیض کی کرم گستری نے اسے اس کی توفیق عطا فرمائی کہ وہ قرآن کریم کے معاشی نظام کو چشم بصیرت سے دیکھے اور اسے اِس وقت قوم کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرے۔'' [1]

یہ زبردست خراجِ تحسین، اور بارگاہِ ایزدی میں، یہ ہدیۂ تشکر، آخر کس بات پر؟ اس بات پر کہ کوثر نیازی صاحب، نے ''معاشی مساوات'' کا یوں دفاع کیا۔

''جو علماء، معاشی مساوات کی ترقی میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں، وہ اسلام کے ساتھ بہت بڑی دشمنی کر رہے ہیں۔'' [2]

''مفکر قرآن'' کے نزدیک، جنگ کے ہنگامی حالات میں، اشعری قبیلے کے اختیار کردہ ''نظام ربوبیت'' میں بھی، اُس ''معاشی مساوات'' اور ''مساوی راشن'' کا ذکر موجود ہے، جس پر مولانا مودودیؒ نے نقد کیا تھا۔

''اشعری قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں، ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں (کسی حادثہ وغیرہ کی وجہ سے) ان کے بال بچوں پر فاقے کی نوبت آجاتی، تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو، ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔'' [3]

ایک اور مقام پر، ''مفکر قرآن'' مساوی تقسیم کا ذکر، مواخاۃِ مدینہ کے ضمن میں یوں کرتے ہیں:

''ہماری مشکل کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے پاس، جو کچھ ہے، اس کی تقسیم غلط ہوئی ہے، اس قسم کے مسئلہ سے، خود نبی اکرمؐ کو بھی دوچار ہونا پڑا تھا، لیکن حضورؐ نے اس کا حل صحیح تقسیم کے ذریعہ کر لیا، اور نہایت کامیاب طریقہ سے کر لیا، مکہ

---

[1] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۴
[2] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۳
[3] طلوع اسلام، جون ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۷

سے آنے والوں اور مدینہ میں رہنے والوں میں، اور جو کچھ میسر آیا، اس کی برابر تقسیم، بس یہی اس مشکل کا حل تھا۔'' [1]

ایک اور الجھن:

سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ کے اس ترجمہ میں، کہ...... ''زمیں میں ہر ضرورتمند کے لیے برابر حصہ ہے''......ایک اعتراض تو وہ ہے جسے مولانا مودودیؒ نے پیش کیا ہے، اور دوسری الجھن یہ ہے کہ ''مساوی راشن'' کی تقسیم، احیاناً، مساوات کا تقاضا تو پورا کر دیتی ہے، لیکن عدل، توازن اور تناسب کا تقاضا پورا نہیں ہونے پاتا، مثلاً، آپ کے سامنے دو گھرانے ہیں، جن میں سے، ایک صرف میاں بیوی پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا خاندان، میاں بیوی کے علاوہ، پانچ بچوں پر بھی مشتمل ہے، آپ اگر ہر خاندان کو روزانہ، دو سو روپے کا ''مساوی راشن'' فراہم کریں، تو اس سے برابری اور مساوات کا تقاضا تو پورا ہو جائے گا، لیکن اعتدال اور تناسب کا تقاضا پورا نہ ہوگا، کیونکہ دو سو روپے کا راشن، بہرحال، دو افراد پر مشتمل خاندان کی یومیہ ضروریات تو پورا کر دے گا، مگر سات افراد پر مشتمل گھرانے کی ضروریات، پوری نہ ہو پائیں گی، لیکن اگر آپ ہر خاندان کو سات سات سو روپے دیدیں، تب بھی مساوات کا تقاضا تو پورا ہو جائے گا، لیکن چھوٹے کنبے کو، اس کی ضرورت سے زائد، جو پانچ صد روپے مل جائیں گے، تو یہ اس کی وہ ''فاضلہ دولت'' ہوگی، جو بقول پرویز، ازروئے قرآن، اس کے پاس نہیں رہنی چاہیے، لیکن اگر آپ چھوٹے کنبے کو اس کی ضرورت کے مطابق، دو سو روپے یومیہ دیں، اور بڑے خاندان کو اس کی حسب ضرورت، سات صد روپے روزانہ دیں ،تو اس سے اعتدال اور تناسب کا تقاضا تو پورا ہو جائیگا مگر یہ ''مساوات'' اور ''برابری'' کے اصول کے منافی ہوگا، اور سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ کا ''قرآنی مفہوم'' یہی ہے کہ...... ''زمین پر ہر ضرورتمند کے لیے برابر حصہ ہے..........''

یہ ہے، ''نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن'' کی وہ صورتِ حال، جس میں ''مساوات و

[1] طلوع اسلام، اگست ۱۹۷۱ء، صفحہ ۱۷

برابری'' اور ''اعتدال وتناسب'' کے تقاضوں کو، بسا اوقات، بیک وقت، نبھانا مشکل ہو جاتا ہے، ''مفکر قرآن'' خود بھی اس الجھن میں مبتلا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں الجھائے رکھا ہے، چنانچہ کبھی وہ، سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ کا ترجمہ مساوات اور برابری کی بنیاد پر کرتے ہیں اور کبھی اعتدال وتناسب کی اساس پر، جب مساوات کی اساس پر مبنی ترجمہ پر اعتراض کیا، تو جھٹ مکر گئے، اور سخنسازی شروع کر دی کہ

نظام ربوبیت کے داعیوں نے سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ سے کبھی یہ مفہوم نہیں لیا کہ دنیا میں ہر شخص کو (مثلاً) دو روٹیاں دے دی جائیں حتّٰی کہ صحن میں بندھی گائے کو بھی دو روٹیاں کھلا دی جائیں، اور ہاتھی کو بھی۔ سائل کے بنیادی معنٰی ''ضرورتمند'' کے ہیں باقی رہا سَوَاءً، سو اس کے معنٰی ''برابر ہی نہیں، اس کے معنٰی ''افراط وتفریط سے محفوظ، ٹھیک ٹھاک تناسب اور توازن کے ساتھ قائم، یا تقاضائے حکمت کے مطابق'' بھی ہیں (امام راغب نے یہ سب معانی دیئے ہیں)، آیۂ زیرِ نظر میں سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ کے معنٰی ہیں کہ زمین کی پیداوار کا انتظام، اس طریق سے ہونا چاہیے کہ اس سے تمام ضرورت مندوں کو، ان کی ضروریات کے مطابق، سامانِ پرورش مل جائے۔''[1]

طلوع اسلام کا امتیازی وصف:

طلوع اسلام کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بے تکلف غلط تراجمِ آیات پیش کرتا ہے، اقتباساتِ دیگراں میں، الفاظ کے حذف و زوائد سے خودساختہ معانی کشید کرتا ہے، قطع و برید سے کام لیتا ہے، بال برابر بھی کوئی مفیدِ مطلب چیز، کہیں سے بھی مل جائے، تو وہ رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتا ہے، بلکہ اس فن میں اسے، اس قدر کمال حاصل ہو چکا ہے کہ وہ بغیر رائی کے ہی پہاڑ بنا ڈالتا ہے، لیکن اگر خلافِ خواہش، پہاڑ برابر بھی کوئی چیز سامنے آ جائے تو اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے، تاہم اگر یہ

---

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۹

چشم پوشی ممکن نہ ہو، تو پھر تاویل کے ذریعہ، اس کے مفہوم کو مسخ وتحریف کا نشانہ بنایا جاتا ہے، خدع وفریب سے کام لینا، دوسروں کی عبارات کو، سیاق وسباق سے اکھاڑنا، اور انہیں غلط معانی پہنانا، طلوع اسلام کی من پسند روش ہے، پھر جو کوئی ان کی اغلاط پر زبان کھولے تو اسے سوقیانہ انداز میں تحقیر وتذلیل کا نشانہ بنانا، اس کا عام رویہ ہے، مثلاً اسی اقتباس میں، تحریف کے کم ازکم دو پہلو تو واضح ہیں۔

اوّلاً یہ کہ سائل کے معنیٰ ''ضرورتمند'' کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا اصل معنیٰ (i) مانگنے والا، اور (ii) پوچھنے والا کے ہیں، ممکن ہے کوئی شخص ''ضرورتمند'' تو ہو، مگر وہ ''سائل'' نہ ہو، اور خودداری اور حیاء، اُسکے ہاتھ کے پھیلنے سے مانع ہو، لیکن جب مانگنے کے لیے اس نے ہاتھ پھیلا دیا، تو وہ سائل قرار پا گیا، قطع نظر اس کے کہ وہ ضرورتمند ہو، یا نہ ہو۔ ''ضرورتمند'' کے لیے عربی میں محتاج کا لفظ استعمال ہوتا ہے، نہ کہ سائل کا۔

ثانیاً یہ کہ سَوَاءً کے معانی...... (i) افراط وتفریط سے پاک (ii) ٹھیک ٹھیک تناسب اور توازن کے ساتھ، اعتدال پر قائم رہنا (iii) تقاضائے حکمت کے مطابق...... بیان کیے گئے ہیں، اور ان تینوں معانی کو منسوب کیا گیا ہے، امام راغب کی طرف۔ اُن کی عبارت میں یہ معانی موجود ہی نہیں ہیں، دیکھئے یہ عبارت:

یقال سواءً وسِویً وسُویً ای یستوی طرفاہ، ویستعمل ذلک وصفاً و ظرفاً واصل ذلک مصدر و قال (فی سواء الجحیم و سواء السبیل ، فانبذ الیھم علی سواءٍ) ای عدل من الحکم . وکذا قولُہٗ (الی کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم) وقولہ (سواءٌ علیھم أأنذرتھم ام لم تنذرھم.سواء علیھم استغفرت لھم.سواء علینا أَجزعنا ام صبرنا) ای یستوی الامران فی انھما لا یغنیان (سواءً العاکف فیہ والبادِ) وقد یستعمل سِویً وسواء بمعنی غیر، قال الشاعر فلم یبق منھا سوی ھامد [۱]

---

[۱] المفردات فی غریب القرآن للراغب، صفحہ ۲۵۲

''سواءً ، سِوىً ، سُوىً کہا جائے تو مراد (کسی چیز کی) دونوں طرفوں کا برابر ہونا ہے، یہ لفظ بطور وصف اور بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمانِ الٰہی ہے سواء الجحیم (جہنم کا وسط، جس سے دونوں طرف کا فاصلہ برابر ہو)، سواء السبیل (سیدھا یکساں راستہ) فانبذ الیھم علی سواءٍ (برابری پر، ان کی طرف معاہدہ کو پھینک دے) اور اسی طرح، یہ فرمانِ الٰہی ہے الی کلمةٍ سواءٍ بیننا و بینکم (ایک ایسی بات کی طرف، جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے) اور یہ فرمان خداوندی کہ سواءٌ علیھم أأنذرتھم ام لم تنذرھم..... (برابر ہے ان پر، خواہ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں) سواء علیھم استغفرت ...... (برابر ہے ان پر خواہ آپ ان کے لیے طالب مغفرت ہوں یا نہ ہوں) سواء أجز عنا ...... (برابر ہے ہم پر خواہ ہم گھبرائیں یا صبر کریں) یعنی یہ دونوں عمل ہمیں فائدہ نہ دیں گے، اور سواءً العاکف ...... (برابر اس میں رہنے والا اور باہر کا پردیسی بدو) اور کبھی سِوىً اور سواء بمعنی غیر بھی مستعمل ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے کہ لَمْ یَبْقَ مِنْهَا سِوىٰ هَامد، یعنی خشک و بنجر کے سوا، اس میں سے کچھ نہ بچا۔

امام راغب کی متعلقہ عبارت کو مع ترجمہ پیش کر دیا گیا ہے، ہر شخص، خود دیکھ سکتا ہے کہ امام راغب کی طرف منسوب تینوں معانی میں سے ایک بھی، اس عبارت میں موجود نہیں ہے۔

ہاں البتہ ''افراط وتفریط سے محفوظ'' ہونے کا معنٰی سَوَاءً لِلسَّائِلِیْنَ میں مذکور لفظ سواء کا نہیں، بلکہ سَوِیٌّ کے لفظ میں موجود ہے، امام راغب کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

والسَّوِیُّ یقال فیما یصان عن الافراط و التفریط من حیث القدر والکیفیة ، قال تعالیٰ : (ثلاث لیالٍ سَوِیّاً) وقال تعالیٰ: (مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ) ورجل سَوِیّ، استوت اخلاقه و خلقته

عن الافراط والتفريط [1]

اور السَّوِیُّ ، اس شئے کے بارے میں کہا جاتا ہے جو مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو، اور رجل سَوِیّ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے اخلاق اور جسمانی ساخت میں افراط وتفریط سے پاک ہو، فرمان الٰہی ثلاث لیالٍ سَوِیّاً اور مَنْ اصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیّ میں یہی مفہوم ہے۔

نمعلوم، یہ جہالت کا کرشمہ ہے یا شرارت کا، کہ ایک لفظ کا معنٰی ، دوسرے لفظ میں سمو دیا جائے، حالانکہ عربی زبان میں، ایک ہی لفظ میں حرکات واعراب کی تبدیلی ،معنٰی کی تبدیلی کا باعث بن جاتی ہے، کجا یہ کہ الفاظ ہی جدا جُدا ہوں، اور ان کے جداگانہ معانی میں سے، ایک لفظ کے معنٰی کو دوسرے لفظ میں داخل کر دیا جائے جیسے یہاں السَّوِیُّ کا جو معنٰی ہے، وہ سَوَاءً لِلسَّائِلِیْنَ کے لفظ سواء میں داخل کیا گیا ہے۔ اور پھر اس معنوی تحریف کو منسوب کر دیا گیا ہے امام راغب کی طرف۔ یہ ہیں لغوی تحقیق میں طلوع اسلام کے پرویزی حیلے، جن کے ساتھ پوری لغات القرآن معرض وجود میں آئی ہے۔

والارض وضعها للانام:

''مفکر قرآن'' نے آیت (۵۵/۱۰) کو بھی، زمین کی عدم ملکیت کے ثبوت کے لیے، اپنی طبع آزمائی کا نشانہ بنایا ہے، لیکن اس پر بہت زیادہ زور نہیں دیا۔ بناءِ استدلال یہ ہے کہ چونکہ زمین، تمام مخلوق کے لیے ہے، لہٰذا یہ ملکیت ایزدی ہے، اور جب یہ ملکیت خداوندی ٹھہری تو کسی اور کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے استدلالات، بیرونی نظریات کو قرآن میں ٹھونسنے کی نہایت بھونڈی کوششیں ہیں، آیت کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس طرح بنایا ہے کہ یہ قسم قسم کی مخلوقات کے رہنے بسنے کے قابل ہوگئی ہے، یہ زمین آپ سے آپ نہیں بن گئی خالق کے بنانے سے ایسی بنی ہے، اس نے اپنی حکمت سے اسے اس طرح وجود بخشا اور اس میں ایسے حالات پیدا کیے کہ تمام مخلوقات

---

[1] المفردات فی غریب القرآن للراغب، صفحہ ۲۵۲

کے جملہ افراد کا یہاں رہنا اور پھر مرکز ٹھکانے لگنا ممکن ہوا۔

''مفکر قرآن'' کا یہ استدلال، ایک ایسے کمیونسٹ کا سا استدلال ہے جو خواتین کو بھی ریاست کی اجتماعی ملکیت قرار دینے کے ہیضہ میں مبتلا تھا، اور قرآن کریم کی یہ آیت، اس کے استدلال کی اساس تھی۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجاً (النحل: ۷۲)

اور اللہ نے تم سب کے لیے تم سب میں سے بیویاں بنائی ہیں۔

وہ صاحب، ترجمہ آیت میں ''تم سب'' کے الفاظ پر زور دیکر اپنی تقریر استدلال یوں پیش کیا کرتے تھے،...... ''آیت میں جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں، جنکا مفاد یہ ہے کہ کوئی خاص عورت، کسی خاص مرد کے لیے نہیں ہے، بلکہ جملہ خواتین، جملہ حضرات کے لیے ہیں، جس طرح زمین کو اللہ تعالیٰ نے سب مخلوقات کے لیے بنایا وَالۡاَرۡضَ وَضَعَھَا لِلۡاَنَامِ، بالکل اسی طرح، بیویوں (خواتین) کو بھی اس نے تم سب کے لیے بنایا جَعَلَ لَکُمۡ مِنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجاً جس طرح، زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں رکھنا مناسب نہیں بلکہ سب کے فائدہ کے لیے اسے ''کھلا رکھنا'' ضروری ہے، بالکل اسی طرح، خواتین کو بھی انفرادی زوجیت میں رکھنا موزوں نہیں، بلکہ سب کے تمتع کے لیے ''کھلا رہنا'' چاہیے، جس طرح زمین کی کھیتیاں، انفرادی پیداوار کی بجائے، پورے معاشرے کو اجتماعی پیداوار دیں گی، بالکل اسی طرح عورتیں بھی، افراد کے لیے اولاد پیدا کرنے کی بجائے، پورے معاشرے کے لیے اولاد پیدا کریں گی ....

''مفکر قرآن'' کا نظام ربوبیت، دراصل، اسی منزل کی طرف، ابتدائی قدم ہے جو صرف معاشیات کے شعبہ میں اٹھایا گیا ہے، اور وہ اس میں کامیاب ہو جاتے، تو ان کا اگلا قدم، ''معاشی نظام ربوبیت'' کے بعد ''جنسی نظام ربوبیت'' کی طرف اٹھتا۔ مغرب کی خدا ناشناس اور مادہ پرست تہذیب کی منزل مقصود یہی کچھ ہے، اس تہذیب کی چمک دمک اور چکا چوند سے مرعوب ہو کر ''مفکر قرآن''، اس کے بہت سے معاشرتی اور تمدنی لوازمات

(مثلاً مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، مرد وزن کی کامل اور مطلق مساوات، خواتین کو شمع خانہ بنے رہنے کی بجائے، انہیں چراغ محفل بنانا، اور حجاب و نقاب کی بجائے، چہرے کی عریانی وغیرہ) کو اپنے پہلے قدم کے طور پر قرآن مجید سے کشید کر ہی چکے ہیں۔

آگے آگے دیکھئے، ہوتا ہے کیا؟



باب چہارم

ملکیتِ مال اور قرآنِ مجید

پرویز صاحب نے ملکیت اراضی کی نفی کی دلیل اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ (۱۲۸/۷) سے کشید کی تھی، مال و دولت کی شخصی ملکیت کا بطلان، سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۹ کے علاوہ، درج ذیل آیت کے ایک ٹکڑے سے وہ کشید کرتے ہیں:

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فی الرزق فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوا بِرَادِّی رِزْقِھِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُم فَھُمْ فِیْہِ سَوَاءٌ اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہ یَجْحَدُونَ (النحل: ۷۱)

''اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض افراد کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے، پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق غلاموں کی طرف پھیر دیا کریں تاکہ وہ سب اس رزق میں برابر ہو جائیں، تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان کو انکار ہے۔''

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں، افراد معاشرہ کے درمیان، معیشت اور رزق کے باہمی فرق و تفاضل کو منشاءِ ایزدی قرار دیا گیا ہے، وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ میں یہی حقیقت مذکور ہے، خود پرویز صاحب نے بھی، اسی آیت کے تحت، اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

''وہ ایسی اشتراکیت کا حامی نہیں ہو سکتا جس میں خدا کی ہستی کا انکار ہو، اور مساواتِ انسانی کی بنیاد، مساواتِ شکم قرار دی جائے، قرآن کریم کی رو سے رزق میں ایک دوسرے پر فضیلت جائز ہے۔'' [1]

---

[1] معارف القرآن، ج۱، صفحہ ۱۲۱

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ''مفکر قرآن''، آیت کے دوسرے حصے سے مساوات شکم ہی کشید کرنے پر اُتر آتے ہیں، وہ، الفاظ آیت فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ سے یہ مفہوم برآمد کرتے ہیں۔

''سو یہ لوگ، اپنی فاضلہ دولت، ان لوگوں کو کیوں نہیں دے دیتے، جو ان کے زیر ہدایت کام کرتے ہیں ...... تاکہ اس طرح سب لوگ، خدا کی عطا کردہ معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہوسکیں۔'' [1]

پرویز صاحب کے اس تضاد کو ملاحظہ فرمائیے جس کے باعث، آیت کے ابتدائی حصے میں تفاضل فی الرزق کو نہ صرف جائز بلکہ منشاءِ خداوندی قرار دیا گیا ہے، اور یہ تضاد، ''مفکر قرآن'' کے اس غلط ترجمہ کی بناء پر واقع ہوا ہے جس میں فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوا میں واقع کلمہ مَا کو نافیہ قرار دینے کی بجائے استفہامیہ قرار دیکر، اس کے معنٰی ''کیوں'' کیا گیا ہے جو لغواً، عقلاً، شرعاً، عرفاً ہر لحاظ سے قطعی غلط ہے، قرآن کریم میں ایسی ساخت کی آیات کا ترجمہ، کہیں بھی، اور تو اور، خود ''مفکر قرآن'' نے بھی ''کیوں'' کے لفظ سے نہیں کیا، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ مَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (الانعام:۱۳۵)

''تم ہمیں بے بس نہیں کر سکتے۔'' [2]

۲۔ مَاهُمْ بِسُكٰرٰى (الحج:۲)

''درحقیقت کوئی نشے میں نہیں ہوگا۔'' [3]

۳۔ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِيْنَ (الصّٰفّٰت:۱۶۲)

''تم اور تمہارے یہ معبود، ان مخلص بندوں کو خدا کی راہ سے منحرف نہیں کر سکتے۔'' [4]

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۶۱۰
[2] مفہوم القرآن، صفحہ ۳۲۴
[3] مفہوم القرآن، صفحہ ۷۵۰
[4] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۰۴۹

۴۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (البقرہ:۸)

''لیکن درحقیقت وہ ان پر ایمان نہیں رکھتے۔'' [۱]

۵۔ وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (یوسف:۱۷)

''آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے۔'' [۲]

یہ چند آیات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کی گئی ہیں، اس طرح کی قرآن میں بہت سی آیات ہیں، جن میں مَا کا ترجمہ، اسے نافیہ قرار دیکر ہی کیا گیا ہے، لیکن آیت زیر بحث میں ''کیوں'' کے لفظ سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے، یہ کمیونزم کا وہ جادو ہے، جو ''مفکر قرآن'' کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

آیت (۱۶/۷۱) کا صحیح مفہوم:

آیت کا صحیح اور اصل مفہوم جاننے کے لیے، سب سے پہلے، آیت کا سیاق وسباق دیکھئے، اوپر سے پوری تقریر، اثباتِ توحید اور رد شرک میں چلی آ رہی ہے، اور اس سے آگے بھی، یہی مضمون جاری ہے، اس سیاق وسباق میں، آخر ایک معاشی ضابطہ بیان کرنے کا کیا موقع ہے؟ یہاں مشرکین کو سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ خدا نے رزق میں تمہیں ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور تم اپنی اس فضیلت کو برقرار رکھنے کی خاطر، خود یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے غلام، تمہارے رزق اور مال و دولت میں یوں حصہ دار بن جائیں، کہ تم باہم مساوی ہو جاؤ، تو آخر تم خدا کے پیدائشی غلام اور بندے ہوتے ہوئے، یہ دھاندلی کیوں کرتے ہو کہ خدائی اختیارات اور حقوق ایزدی میں، اللہ کے بندوں کو اس کا ساجھی اور شریک قرار دو، اور انہیں خدا کا ہم پلہ بنا ڈالو۔ یہی مضمون، سورۃ الروم میں بھی بایں الفاظ موجود ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً مِنْ اَنْفُسِكُمْ هَل لَّكُم مِّمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِنْ شُرَكَآءَ فِيْمَا رَزَقْنَاكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۴ [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۵۲۴

اَنفُسَکُمْ (سورة الروم:۲۸)

''وہ خود تمہاری اپنی ذات سے ایک مثال دیتا ہے، کیا تمہارے ان غلاموں میں سے، جو تمہاری ملکیت میں ہیں، کچھ ایسے غلام بھی ہیں، جو ہمارے دیئے ہوئے مال و دولت میں، تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں، اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو۔''

ان الفاظ کا مفہوم، خود ''مفکر قرآن'' نے یوں بیان کیا ہے۔

''ہم اس کے لیے خود تمہاری اپنی مثال پیش کرتے ہیں، تمہارے ہاں وہ لوگ بھی ہیں جو تمہارے ماتحت کام کرتے ہیں......تمہارے غلام وغیرہ......کیا تم ایسا کرتے ہو کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں انہیں اس طرح شریک کرلو کہ وہ اور تم ہر طرح سے برابر برابر ہو جاؤ، اور پھر تم ان سے اس طرح ڈرنے لگ جاؤ جس طرح تم اپنے برابر کے لوگوں سے ڈرتے ہو (سو، جب یہ لوگ جو تمہارے زیر فرمان کام کرتے ہیں، تمہارے جیسے انسان ہونے کے باوجود، تمہارے ہمسر نہیں ہو سکتے اور تم ان سے کبھی خائف نہیں ہوتے، تو کائنات کی مخلوق، خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو، اس خدا کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے جس نے اسے پیدا کیا اور وہ، اسی کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔'' [۱]

سورة الروم کی آیت کا اصل مفہوم یہی ہے، (اس کے سابق ولاحق میں، پرویز صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ چونکہ الفاظِ قرآن کی حدود سے خارج ہے، اس لیے وہ، نا قابل اعتناء ہے)، یہی مفہوم سورة النحل کی اس آیت کا ہے، جس کے دوسرے حصے میں سے، وہ مفہوم کشید کیا جا رہا ہے، جو خود پرویز صاحب ہی کے بیان کردہ، پہلے حصہ آیت کے مفہوم کے ساتھ متصادم ہے۔

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۹۳۶

ذاتی ملکیت مال اور قرآن مجید:

جہاں تک زر و دولت کی ملکیت کا تعلق ہے، قرآن کریم کی بیسیوں آیات، اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، فی الحال صرف ایک آیت ملاحظہ فرمائیے:

وَلَا تَتَمَنَّوا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (النساء:۳۲)

''اور جو کچھ، اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں دیا ہے، اس کی تمنا نہ کرو، جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے، اس کے مطابق ان کا حصہ۔ ہاں! اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

اس آیت کا مفہوم، خود پرویز صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں، اس تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جسکی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حقوقِ ملکیت، صرف مرد کو حاصل ہیں، عورت کو نہیں ہوتے، جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے (۴/۷) عورت اپنے جائداد و مال کی آپ مالک ہوتی ہے اس طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا صرف مرد کا کام ہے، عورت ایسا نہیں کر سکتی، مرد اور عورت دونوں اکتسابِ رزق کر سکتے ہیں، جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے، جو کچھ عورت کمائے وہ اس کا حصہ ہے، یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے، بعض باتوں میں مردوں کو برتری حاصل ہے اور بعض میں عورتوں کو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں، اپنے آپ کو اپاہج بنا کر، مردوں کی کمائی کو تکتی رہیں اور خود کچھ نہ کریں، انہیں چاہیے کہ خدا سے زیادہ سے زیادہ معاشی اکتساب کی توفیق طلب کرتی رہیں خدا خوب جانتا

ہے کہ وہ کیا کچھ کرسکتی ہیں۔'' [۱]

ایک دوسرے مقام پر، پرویز صاحب رقمطراز ہیں:

''مردوں اور عورتوں کے جداگانہ حقوق ملکیت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں، ان سب کا حصہ ہو، صرف مردوں ہی کا نہ ہو۔'' [۲]

الغرض آیت (۴/۳۲)، خود پرویز صاحب کے اپنے بیان کردہ مفہوم کی روشنی میں بھی ذاتی ملکیتِ مال و دولت پر برہان قاطع ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد آیات میں مال و دولت اور زمین کی انفرادی ملکیت کو اسلامی معاشرے کی اساسی پالیسی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

منعِ بخل کا حکم، ذاتی ملکیت پر دال ہے:

علاوہ ازیں، قرآن کریم نے بہت سی آیات میں، انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ ساتھ، بخل اور کنجوسی سے منع بھی کیا ہے، اور مختلف اسالیب سے اہل ایمان کو اس قبیح عادت سے بچنے کا حکم دیتا ہے مثلاً:

لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْراً لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَابَخِلُوا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (اٰل عمران:۱۸۰)

''جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ بخل کرتے ہیں تو یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخیلی، ان کے لیے اچھی ہے، نہیں یہ ان کے حق میں بُری ہے ان کا نتیجہ بخل بروز قیامت، ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔''

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:۳۷)

''ایسے لوگ، جو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کی شہ دیتے ہیں (اللہ کو پسند نہیں) اور یہ بھی کہ وہ اللہ کے عطا کردہ فضل کو چھپاتے ہیں۔''

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۸۷ [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۸۸

فَلَمَّا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوا بِهٖ وتَوَلَّوا وَ هُمْ مُعْرِضُونَ

(التوبہ:۷۶)

''پھر اللہ نے جب اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا، تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے بڑے بے پرواہ ہو کر پھر گئے۔''

هٰاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَّبْخَلُ وَمَن يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهٖ (محمد:۳۸)

''تم کو خدا کی راہ میں دولت خرچ کرنے کو کہا جاتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ بخل کرتے ہیں، حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔''

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمن يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْوَلِيُّ الحَمِيْدُ (الحدید:۲۴)

''جو لوگ بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں، اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے، تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔''

وَاَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرىٰ

(۸:۱۰)

''اور جس نے بخل کیا اور اپنے خدا سے بے نیازی برتی، اور بھلائی کو جھٹلایا، اُس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''

یہ سب آیات، اہل ایمان کو بخل اور کنجوسی سے اجتناب و احتراز کا حکم دیتی ہیں، ان آیات میں، وہ آیات بھی ہیں، جو غزوۂ تبوک کے بعد نازل ہوئی تھیں، مثلاً آیت (۹/۷۶)، جب اسلامی حکومت، وجود پذیر ہی نہیں بلکہ مضبوط و مستحکم بھی ہو چکی تھی۔ اب اگر قرآن، بقول پرویز، اہل ایمان کے پاس، ان کی ضروریات سے زائد دولت رہنے ہی نہیں دیتا، تو انہیں بخل سے بچنے کی یہ تعلیم کس لیے؟ بخیل تو وہی ہو سکتا ہے جو زائد از ضرورت دولت، اپنے پاس رکھے، اور پھر راہِ خدا میں خرچ نہ کرے۔ ورنہ کسی کے پاس

فاضلہ دولت، اگر سرے سے ہے ہی نہیں، تو وہ بخل اور کنجوسی کیا کرے گا، سوچئے! اگر اسلامی حکومت، بزعم پرویز، عفو المال کو لوگوں کے پاس چھوڑتی ہی نہیں، تو ان کے لیے بخل اور کنجوسی کا کیا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ انہیں یہ وعید سنائی جائے کہ ان کے بخل کا نتیجہ، بصورت طوق، ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ الغرض، یہ آیاتِ قرآنیہ، ملکیتِ مال وزر پر کھلی کھلی دلیل ہیں، بالکل اسی طرح اسراف وتبذیر سے روکنے والی آیات بھی، افراد کی ذاتی ملکیتِ مال پر دلالت کناں ہیں، اسراف وتبذیر، اسی صورت ہی میں ممکن ہے جب دولت زائد از ضرورت موجود ہو، اگر کسی کے پاس فاضلہ دولت موجود ہی نہ ہو، اور اس کے پاس رزقِ کفاف کی حد تک ہی مال موجود ہو، تو ایسا شخص بخل و کنجوسی یا اسراف وتبذیر کی راہ اختیار کرنے پر قادر ہی نہیں ہے کہ اسے خواہ مخواہ، ان امور سے روکا جائے جو اس کی استطاعت وقدرت سے خارج ہوں، اس طرح ایسی جملہ آیات، بجائے خود، ذاتی ملکیتِ مال کو مستلزم ہیں۔

قل العفو (۲/۲۱۹):

قرآن مجید میں، اس بات کی کیا دلیل ہے کہ افراد، اپنی محنت کی کمائی میں سے، صرف اسی قدر کے حقدار ہیں، جو افرادِ کاسبین کی ضرورت کے مطابق ہو، اور اس سے زائد کمائی کے وہ مالک نہیں ہو سکتے؟ اسکا جواب، پرویز صاحب، درج ذیل آیت سے نکالتے ہیں:

يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ العفو (البقرہ:۲۱۹)

''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ کہو جو بہترین چیز ہو۔''

پرویز صاحب، کا استدلال یہ ہے کہ یہاں عفو کے انفاق کا حکم ہے، لغت عرب میں چونکہ عفو المال کے معنٰی ''زائد از ضرورت مال'' کے بھی ہیں، اس لیے یہاں، تمام زائد از ضرورت مال کا حکمِ انفاق دیا گیا ہے جسکا مقتضٰی یہ ہے کہ لوگ، اپنی فاضلہ دولت کے مالک نہیں ہو سکتے۔

لیکن یہ استدلال کرتے ہوئے انہوں نے یہ قطعاً نہیں سوچا کہ زائد از ضرورت مال و

دولت خرچ کرنیکی یہ ترغیب، اہل ایمان کو، اسی لیے تو دی گئی ہے کہ وہ اس مال کے خو مالک ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا، تو اُنہیں انفاقِ مال کی یہ ترغیب دی ہی کیوں جاتی، پھر بجائے اس کے کہ قرآن، اربابِ اقتدار سے یہ کہے کہ ''تم اہل ثروت سے فاضلہ دولت حاصل کر لو کیونکہ وہ قدر کفایت سے زائد مال کے حقدار نہیں ہیں۔'' الٹا مال داروں ہی سے یہ کہتا ہے کہ ''اپنے عفوالمال کو راہِ خدا میں صرف کریں۔'' جو اس امر کا ثبوت ہے کہ کاسبِ مال، اپنے مالِ مکسوب کا خود مالک ہے۔

خذ العفو (۷/۱۹۹) پر بحث:

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ ارباب اقتدار کو بھی، قرآن نے، یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ اہل مال سے زائد از ضرورت مال لے لیں، اور دلیل میں آیت (۷/۱۹۹) کے ابتدائی جملے کو پیش کریں، جس کے متعلق، پرویز صاحب کا یہ فرمان ہے کہ:

''اس آیت میں، اسلامی نظام یا اس کے سربراہ سے کہا گیا ہے کہ جماعت مومنین سے زائد از ضرورت مال اپنی تحویل میں لے لیا کرو۔'' [۱]

حالانکہ، اس سے قبل، وہ، الفاظِ آیت خُذِالعَفُو کا ترجمہ ''درگزر کرنا'' ہی کرتے ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے:

خُذِالْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (۷/۱۹۹)

(بہر حال تم ان کی باتوں کی وجہ سے، اپنے پروگرام میں رکو نہیں) تم ان سے درگزر کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ، اور قاعدے اور قانون کے مطابق، انہیں خدا کے احکام دیتے جاؤ، اور جہلا سے کنارہ کش رہو۔'' [۲]

ہمارے نزدیک، پرویز صاحب کا یہی مفہوم آیت درست ہے، رہا اُن کا وہ مفہوم جدید، جس کے مطابق خُذِالْعَفْو کے حکم کا مخاطب، سربراہِ نظام اسلامی کو قرار دیکر، اسے لوگوں کا عفوالمال وصول کرنے کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے، تو وہ بوجوہ باطل ہے۔

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۵۵ [۲] مفہوم القرآن (۷/۱۹۹)، صفحہ ۳۹۰

اولاً......اس لیے کہ عفو کا مفہوم ''زائد از ضرورت مال'' صرف اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے ساتھ مال کا لفظ بطور مضاف الیہ موجود ہو (جیسے عفوالمال) یا پھر کوئی ایسا قرینہ ہو جو عفو کے مفہوم کو اس معنٰی کے لیے خاص کر دے، اور از روئے لغت، اس کے علاوہ کوئی اور معنٰی لینا متعذر رہو، لیکن یہاں آیت (۷/۱۹۶) میں **خُذْ عَفْوَ المَالِ** کی بجائے، **خُذِالعَفْوَ** کے الفاظ ہیں، اس لیے، یہاں ''زائد از ضرورت'' مال کا مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا، بلکہ ''درگزر کرنے'' کا مفہوم ہی اولیٰ اور انسب ہے۔

ثانیاً......اس لیے کہ یہ آیت قبل از ہجرت، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی، اور مکی دور میں سرے سے وہ نظام حکومت، قائم ہی نہیں ہوا تھا، (جسے پرویز صاحب نے نظام ربوبیت کا نام دے رکھا ہے) کہ اس کے سربراہ کو یہ کہنے کی ضرورت پڑتی کہ...... ''آپ لوگوں کے عفوالمال کو اپنی تحویل میں لے لیں'' ......وہاں تو صورتحال یہ تھی کہ غریب مسلمان، کفار مکہ کی چیرہ دستیوں کا شکار تھے، ان کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے، استہزاء و تضحیک، طعن و تشنیع، سب وشتم، مخالفت وعداوت، سلب ونہب اور مار پیٹ کی فضا میں، ان کے لیے سانس تک لینا مشکل تھا، اس صوتحال میں، ان ستم رسیدہ اور مقہور ومظلوم مسلمانوں سے (جو تازہ تازہ اسلام لائے تھے) زائد از ضرورت مال لے لینے کا حکم، قطعی غیر مناسب اور غیر حکیمانہ قرار پاتا ہے، جسکی توقع، خود خالقِ عقل وحکمت سے نہیں کی جا سکتی کیونکہ ایسا حکم، اس وقت کی صوتحال سے کوئی میل نہیں کھاتا، اس لیے لامحالہ، آیت کا صحیح مفہوم، صرف اور صرف یہی ہے کہ...... ''اے نبی! نرمی و درگزر کا رویہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو......''

ثالثاً......اس لیے کہ اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکمتِ تبلیغ کی تعلیم دی ہے، اس لیے، ان آیات کے مضمون و مدعا کی روشنی میں، ان جملہ احکام کو، ان معانی پر محمول کرنا، جو حکمتِ تبلیغ سے میل کھاتے ہوں، اقرب الی الصواب ہے بہ نسبت اس کے، کہ انہیں خود ساختہ محذوفات کی بدولت، ایسے معانی پہنائے جائیں جو

نہ سیاقِ کلام سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں اور نہ ہی اُس دور سے، جس میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

رابعاً ...... اس لیے کہ ربط آیات کا تقاضا ہے کہ **خُذِ العَفُوَ** کو درگزر کے مفہوم میں لیا جائے، آیت میں تین حکم دیئے گئے ہیں۔

(i) عفو کو اختیار کیجیے

(ii) معروف کی تلقین کرتے رہیے

(iii) جاہلوں سے کنارہ کش رہیے۔

خُذِ العَفُوَ کا معنٰی ''زائد از ضرورت مال'' لینے کی صورت میں، پہلا حکم، اہل ایمان سے وابستہ ہوگا، کیونکہ مسلمان ہی اس پر عمل پیرا ہو سکتے تھے، جبکہ آیت کے باقی دو احکام کا تعلق، کفار سے قائم ہو گا کہ اُن ہی کو امر بالمعروف کرنا ہے اور ان ہی کے جاہلوں سے اعراض کرنا مقصود ہے، اس طرح، آیت کے ابتدائی حصے کا تعلق، اہل ایمان سے جوڑنا، اور باقی ماندہ احکام کو اہل کفر سے وابستہ کرنا، اختلالِ نظم کا موجب ہے جبکہ تینوں احکام کا تعلق، ایک ہی فریق (کفار) کے ساتھ جوڑنے میں، کسی قسم کا خلل اور سقم واقع نہیں ہوتا، اس لیے **خُذِ العَفُوَ** کا یہ معنٰی کہ ''درگزر کیجیے'' ہی صحیح اور مناسب ہے۔

خامساً ...... اس لیے کہ عفو کے معنٰی یہاں ''زائد از ضرورت مال'' لینے کی صورت میں عفو کے بعد ''المال'' کو بطور مضاف الیہ محذوف ماننا پڑتا ہے، اور یہ بات عالم، تو رہا ایک طرف، عام مبتدی بھی جانتا ہے کہ قرآن کا معنٰی کرتے وقت، اپنی طرف سے کوئی محذوف ماننے کی بجائے، بغیر محذوف مانے ہوئے، مفہوم بیان کرنا، اولیٰ، انسب اور افضل ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ **خُذِ العَفُوَ** کا وہی سابقہ مفہوم درست ہے جسے ''مفکر قرآن''، اپنے ماڈرن مفہوم سے قبل، بایں الفاظ پیش کرتے رہے ہیں۔

> ''(بہرحال، تم ان کی باتوں کی وجہ سے اپنے پروگرام میں رکو نہیں) تم ان سے درگزر کرتے ہوئے، آگے بڑھتے جاؤ، اور قاعدے اور قانون کے مطابق،

انہیں خدا کے احکام دیتے جاؤ اور جہلا سے کنارہ کش رہو (اگر تم ان سے الجھتے رہے تو یہ ناحق تمہارا وقت ضائع کریں گے)۔'' ۱

آیت (۲/۲۱۹):

اب آئیے، آیت (۲/۲۱۹) کی طرف، جسکا مفہوم پرویز صاحب نے یوں پیش کیا ہے۔

''پوچھتے ہیں کہ اپنی کمائی کا کتنا حصہ، دوسروں کے لیے کھلا رکھنا ہوگا؟ ان سے کہو جتنا تمہاری ضروریات سے زائد ہو۔'' ۲

اگرچہ قواعد لغت کے اعتبار سے یہ ترجمہ غلط نہیں ہے، لیکن ترجمہ کرتے وقت، صرف قواعد لغت ہی کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ ترجمہ، قرآن کی مجموعی تعلیم کے بھی مطابق ہے یا نہیں، جناب پرویز صاحب کا اپنا فرمان ہے کہ:

''جب کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں، اور قرآن کریم میں وہ لفظ مختلف آیات میں آیا ہو تو قرآنی طالب علم کے لیے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس آیت میں، اس لفظ کے متعدد معانی میں سے کون سا معنٰی زیادہ موزوں ہے، اس لیے قرآن کے دیگر مقامات کو بھی سامنے رکھنا ہوگا، اس طریق سے جن معانی کو ترجیح دی جائے گی وہ قرآنی مفکر کا فکری اجتہاد ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بڑے سے بڑے مفکر کا فکری اجتہاد بھی نہ وحیُ خداوندی کی طرح حرفِ آخر ہوسکتا ہے اور نہ غیر متبدل۔ دوسرے تو ایک طرف، وہ خود بھی، مزید غور و تدبر سے، اپنے سابقہ فکری استنباط میں، تبدیلی کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کی تائید لغت اور قرآن کی کُلّی تعلیم سے ہوتی ہو۔'' ۳

اگرچہ لغت کی رو سے، عفو کا معنٰی، یہاں (بقرینہ یُنْفِقُوْن) ''زائد از ضرورت مال''

---

۱ مفہوم القرآن (۷/۱۹۹)، صفحہ ۳۹۰ ۲ نظام ربوبیت، صفحہ ۱۵۸
۳ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۵۵

ممکن ہے، لیکن ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا، اس معنٰی کی تائید، قرآنِ کریم کی کلّی تعلیم سے ہوتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا کہ وہ اپنی ساری زائد از ضرورت دولت کا انفاق کر ڈالے، اور قدر کفاف سے بڑھ کر کوئی رزق اس کے پاس نہ رہے۔

حکمِ انفاقِ مال، بعض یا کل؟:

بلکہ اس نے افراط وتفریط سے ہٹ کر، انفاق میں میانہ روی اختیار کرنے کی تاکید کی ہے، اور یہ انفاقِ مال بھی، اس فاضلہ دولت میں سے ہوگا، جو اس کی ضروریات سے زائد ہو، کیونکہ مال بقدرِ ضرورت کا تو ہر فرد، خود محتاج ہوگا، خواہ یہ اس کی اپنی کمائی کا نتیجہ ہو یا معذور الکسب ہونے کی بناء پر حکومت کی طرف سے اسے یہ ملا ہو، پھر اس فاضلہ دولت کے بھی کُلّی انفاق کا حکم نہیں ہے بلکہ اس کے ایک حصہ کے انفاق کا حکم ہے، چند آیات ملاحظہ فرمائیے جن سے اسلام کی کلّی اور مجموعی تعلیم واضح ہو جاتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ (البقرہ: ۲۵۴)

”اے ایمان والو! جو مال ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔“

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ: ۲۶۷)

”اے ایمان والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے، اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔“

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ....

(یٰس: ۴۷)

''جب بھی، ان سے کہا گیا کہ اللہ نے جو رزق تمہیں دیا ہے، اس میں سے کچھ ،اللہ کی راہ میں خرچ کرو، تو کفار نے یہی کہا کہ......''

اَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيه (الحدید:۷)

''ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن پر اللہ نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔''

وَاَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

(المنافقون:۱۰)

''جو رزق، ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی پر موت آجائے۔''

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَا هُمْ

(ابراھیم:۳۱)

''(اے نبی!) میرے صاحب ایمان بندوں کو فرما دو کہ وہ نماز قائم رکھیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے رہیں۔''

مشتے نمونہ از خروارے، یہ چند آیات، اس امر کو واضح کر دیتی ہیں کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو یہ حکم دیا ہی نہیں کہ وہ اپنی ساری زائد از ضرورت دولت، حکومت کی تحویل میں دیدیں بلکہ اس کا حکم صرف یہ ہے کہ اس دولت کا ایک حصہ راہ خدا میں خرچ کر دیا جائے، یہ تو وہ آیات ہیں جن میں انفاق کا حکم دیا گیا ہے، اب وہ آیات ملاحظہ فرمایئے جن میں ان احکام پر عمل پیرا ہونے والے مؤمنین کی تحسین فرمائی گئی ہے، اور وہ بھی، ان کے اس فعل پر نہیں کہ وہ اپنی ساری زائد از ضرورت دولت، حکومت کی تحویل میں دے دیتے ہیں، بلکہ اس پر کہ وہ اپنے اموال میں سے ایک حصہ، راہِ خدا میں صرف کرتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُون الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنَا هُمْ يُنْفِقُون

(البقرہ:۳)

''یہ لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز کی نگہداشت کرتے رہتے ہیں، اور جو

کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنَا هُمْ يُنفِقُوْن (انفال: ۲)

"یہ وہ لوگ ہیں جو نماز قائم رکھتے اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ وَمِمَّا رَزَقْنَا هُمْ يُنفِقُوْنَ (الحج: ۳۵)

"نماز قائم کرنے والے ہیں اور ہمارے عطا کردہ رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

وَيَدْرَءُ ونَ بالحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَا هم يُنفِقُوْنَ. (القصص: ۵۴)

"وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کر رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوفاً وَّطَمَعاً وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُم يُنفِقُوْنَ(السجده: ۱۶)

"وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں

وَاَمْرُهُمْ شُورىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْن(الشوریٰ: ۳۸)

"اور وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

ان آیات کی روشنی میں ہر شخص، خود دیکھ سکتا ہے کہ آیا قرآن کی کُلّی اور مجموعی تعلیم یہ ہے کہ تمام زائد از ضرورت دولت کو، خرچ کرتے ہوئے، حوالۂ حکومت کیا جائے یا یہ کہ عفو المال میں سے، ایک حصہ صرف کیا جائے۔

اگر کوئی شخص فی الواقع، خالی الذہن ہو کر قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کرے، تو وہ ہرگز یہ باور نہیں کر سکتا کہ قرآن پورے عفو المال ہی کو خرچ کر ڈالنے کا حکم دیتا ہے، یہ حکم قرآن سے صرف اس وقت بتکلف نچوڑا جاتا ہے جب کوئی شخص، اشتراکیت پر پیشگی ایمان

لا کر، قرآن کا مطالعہ کرتا ہے، پھر تو ظاہر ہے کہ ساون کے اندھے کو ہر طرف، ہرا ہی ہرا سوجھے گا، لیکن اگر کوئی شخص، اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کے خارجی تصورات سے پاک کر کے، بارگاہِ قرآن میں آتا ہے تو وہ یہ باور کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن پورے عفوالمال کے انفاق کا روادار نہیں ہے بلکہ وہ اعتدال اور توسط کی ایسی تعلیم دیتا ہے کہ اسے قبول کرنے والا، نہ تو اسراف وتبذیر پر اترتا ہے اور نہ ہی بخل و کنجوسی پر۔ وہ اپنے بندوں کی میانہ روی کو جو وہ مالی امور میں اختیار کرتے ہیں، یوں سراہتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوا لَمْ یُسْرِفُوا وَلَمْ یَقْتُرُوا وَ کَانَ بین ذَالِكَ قَوَامًا

(الفرقان:٦٧)

’’(رحمان کے بندے وہ بھی ہیں) جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ بخل وتنگدستی، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان، اعتدال پر ہوتا ہے۔‘‘

غور فرمایئے، اگر قرآن کی تعلیم، واقعی یہ ہوتی کہ......’’افراد کے پاس زائد از ضرورت دولت رہ ہی نہیں سکتی، اور ان کی انفرادی ملکیت، محض رزق کفاف تک ہی محدود ہوتی تو اس صورت میں اسراف کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا، کہ اسے اسراف وبخل سے منع کیا جاتا اور میانہ روی کی تعلیم دی جاتی۔ بَیْنَ ذالِكَ قَوَاماً کی روش، تو وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کے پاس زائد از ضرورت دولت ہو، اور اس کے انفاق میں افراط و تفریط کی دونوں راہیں کھلی ہوئی ہوں، مگر وہ خود، اپنے ایمان کی روشنی میں دونوں انتہاؤں سے ہٹ کر، اقتصاد و اعتدال کی راہ اپنائے۔ جس کے پاس مال ہو ہی حسب ضرورت اور بقدر رزق کفاف، وہ بیچارا کیا اسراف وبخل کرے گا۔ ایک اور مقام پر، قرآن یہی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُوراً (بنی اسرائیل:۲۹)

''تو (اے مخاطب!) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھے رکھ، اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دے، کہ تو ملامت زدہ اور حسرت زدہ بن کر رہ جائے۔''

اگر فی الواقعہ، قرآن کے پیشِ نظر، اشتراکیت کا وہی نظام قائم کرنا ہوتا، جس پر پرویز صاحب، نے ''نظامِ ربوبیت'' کا لیبل چپکا رکھا ہے، اور جس میں افرادِ معاشرہ، حکومت کے قیدیوں کی حیثیت میں، کولہو کے بیل کی طرح، سارا دن کام کاج میں جتے رہتے ہیں، اور شام کو، حسب ضرورت، چند سکے اور دو روٹیاں، اس کی ضرورتِ شکمی کو پورا کرنے کے لیے، بالکل اُسی طرح مل جائیں جس طرح، کولہو کے بیل کو ہری بھری گھاس مل جاتی ہے، اور افرادِ کاسبین کے پاس، ان کی محنت کے ماحصل میں سے بقدرِ ضرورت ہی انہیں میسر آتا ہے اور اس کی بقیہ سب کمائی، حکومت کی تحویل میں چلی جاتی ہے، تو قرآن، انفاقِ اموال اور صرفِ دولت میں، اعتدال و توسط کی یہ تعلیم ہی سرے سے نہ دیتا، قرآن کی مجموعی اور کلی تعلیم میں، ان امور کا موجود ہونا، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ ایسے نظامِ معیشت کا علمبردار ہے، جو ذاتی ملکیت کے اصول پر قائم ہے، اور اس بات کے حق میں ہے کہ لوگوں کے پاس عفو المال رہے اور وہ اپنے ایمانی تقاضوں کے مطابق، دل و دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ، راہ خدا میں، فراخ دلی سے خرچ کرتے رہیں۔

قل العفو کا صحیح مفہوم:

اب آئیے قُلِ الْعَفْوَ کے معنٰی و مفہوم کی طرف، ہمارے نزدیک، قرآن کی کُلّی اور مجموعی تعلیم کی روشنی میں، اس کا مفہوم ''زائد از ضرورت مال'' نہیں ہے بلکہ ''بہترین اور محبوب مال'' ہے، لغت اور قرآن، دونوں سے اس معنٰی کی تائید ہوتی ہے، جہاں تک، لغت کا تعلق ہے، وہ ''عفو'' کے دیگر معانی کے علاوہ، اِس معنٰی کو بھی تسلیم کرتی ہے، خود پرویز صاحب رقمطراز ہیں۔

''عفو'' کے معنٰی ''بہترین چیز'' کے ہوتے ہیں، نیز، وہ چیز جس میں کسی قسم کی

تکلیف و مشقت نہ اٹھانی پڑے۔" ۱

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ اَنفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ (۲/۲٦۷)، طَيِّبَاتِ کی وضاحت، میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"طیّب: راغب نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنٰی ہیں وہ چیز جس سے، انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی، یعنی، ہر وہ چیز، جو دیکھنے، سونگھنے، سننے اور کھانے میں بھی پسندیدہ ہو، اور اس سے نفس انسانی بھی کیف اندوز ہو اَلْاَطَايِيْب اور اَلْمَطَايِيب "پسندیدہ اور بہترین چیزیں۔" ۲

اس کے بعد، آیت (۲/۲٦۷) کا وہ مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیے، جو جناب پرویز صاحب نے لکھا ہے:

"اے مؤمنین! تم زمین کی پیداوار میں سے بھی، اور اپنی صنعت و حرفت میں سے بھی، جو کچھ کماؤ، اس میں سے بہترین حصہ کو نظام ربوبیت کے قیام کے لیے کھلا رکھو......" ۳

ایک اور مقام پر، قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (اٰلِ عمران: ۹۲)

"تم نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی محبوب اشیاء میں سے خرچ نہ کرو۔"

اور یہ ظاہر ہی ہے کہ ان کی محبوب اشیاء، وہی ہوتی ہیں، جو اچھی اور بہترین ہوں۔

ذاتی ملکیتِ مال کے دیگر دلائل:

اس کے علاوہ اس معنٰی کو یہ چیز بھی تقویت پہنچاتی ہے کہ قرآن کریم کے تیئیس سالہ دورِ نزول میں، ہر مرحلے پر، اللہ تعالیٰ نے ایسے احکام نازل فرمائے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ فاضلہ دولت کی انفرادی ملکیت پر دلالت کناں ہیں، ان احکام کے نتیجہ میں جو نظام عملاً

---

۱ لغات القرآن، صفحہ ۱۱۷۸ ۲ لغات القرآن، صفحہ ۱۱۰۳

۳ مفہوم القرآن، صفحہ ۱۰٦

متشکل ہوا، اس میں کہیں بھی اس اصول کی نفی نہیں کی گئی، ترکہ و میراث، بیع وشراء، صدقہ و خیرات، دَین و اقراض اور لین دین کے احکام (جو انفرادی ملکیت اور فاضلہ دولت کے وجود کو متضمن ہیں)، آخری دور نبوی تک نازل ہوتے رہے۔ ان کے متعلق، یہ کہنا کہ ''یہ سب عبوری دور کے احکام ہیں''، قطعی بیجا بات ہے، یہ محض ایک دعویٰ ہے جسکی پشت پر کوئی دلیل و برہان نہیں ہے، دور نبوی تو رہا ایک طرف، خلافت راشدہ تک میں، شخصی ملکیت اور پرائیویٹ پراپرٹی (Private Property) کو ثابت کرنے والے ان گنت واقعات موجود ہیں، اور خود قرآن بھی، اس حقیقت پر شاہد عدل ہے، سورۃ التوبہ، قرآن کی ان سورتوں میں سے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں، اس سورہ میں غزوۂ تبوک پر تبصرہ کیا گیا ہے، جو رجب ۹ ھ میں ہوا تھا، اور یہ سورہ اس جنگ کے بعد نازل ہوئی تھی، اس سورہ میں درج ذیل آیات، ذاتی ملکیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَن يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ مَغْرَمًا (التوبہ:۹۸)

''ان بدویوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو (راہ خدا میں) خرچ کرنے کو چٹی سمجھتے ہیں۔''

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللّٰهِ (التوبہ:۹۹)

''ان بدویوں میں کچھ ایسے بھی ہیں، جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔''

راہِ خدا میں، دامے درمے، قدمے، سخنے، حصہ لینے والے مخلصین کو یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ:

وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (التوبہ:۱۲۱)

''ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ اہل ایمان (راہ خدا میں) تھوڑا یا بہت، کوئی خرچ

کریں، اور سعی جہاد میں کوئی وادی عبور کریں، اور ان کے حق میں، اسے لکھ نہ لیا جائے تا کہ، اللہ، ان کے، ان کارناموں پر، بہترین اجر عطا فرمائے۔''

حضور اکرم ﷺ کو، اہل ایمان سے (پوری کی پوری فاضلہ دولت نہیں بلکہ) ان کے مال کا ایک حصہ وصول کرنے کا حکم دیا گیا۔

خُذْمِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُ هُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِم

(التوبہ: ۱۰۳)

''(اے نبی!) تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر، انہیں پاک کرو، اور نیکی میں انہیں آگے بڑھاؤ، اور ان کے حق میں دعا کرو۔''

یہ سورۃ التوبہ کی چند آیات ہیں جن میں انفاقِ اموال کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ فاضلہ دولت کی انفرادی ملکیت، اسلامی نظامِ معیشت کی ایک طے شدہ پالیسی ہے، اگر قُلِ الْعَفْوَ اور خُذِ الْعَفْوَ کا یہی مفہوم ہوتا کہ افراد کی زائد از ضرورت دولت کو، ریاست اپنی تحویل میں لے لے، تو نفقۂ صغیرہ اور نفقۂ کبیرہ کا وجود تک نہ ہوتا، اور افراد کے پاس، بذل وصرف کے لیے، زائد از ضرورت دولت موجود ہی نہ ہوتی، کجا یہ کہ وہ خرچ کرتے اور پھر اپنے ان انفاقات کو زبردستی کی چٹی سمجھتے، یا قربِ الٰہی کا ذریعہ۔ حضور اکرم ﷺ کو وصولیٔ صدقات کا حکم، اسی لیے تو دیا گیا کہ لوگ، اپنی فاضلہ دولت کے آپ مالک تھے، اگر آپؐ، لوگوں کے پاس، بقدرِ کفایت اور حسبِ ضرورت ہی چھوڑتے، تو ان کے پاس سرے سے وہ عفو المال ہی نہ ہوتا جس میں سے آپؐ صدقات وصول فرماتے۔

الغرض، ان آیات سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ رجب ۹ھ کے بعد تک بھی، ذاتی ملکیت اور فاضلہ دولت کے شخصی قبضے میں رہنے کا اصول جاری تھا، پھر ہمیں نہیں معلوم کہ قُلِ الْعَفْوَ اور خُذِ الْعَفْوَ کے الفاظ میں سے کشید کردہ، اشتراکیت کا جو نظام ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے نام سے موسوم ہے، وہ آخر کب نفاذ پذیر ہوا تھا؟

ایک قابل غور بات:

یہاں ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ اگر عہد نبوی میں، واقعی لوگوں کی ''زائد از ضرورت دولت''، اُن کی ذاتی ملکیت سے نکل کر، ریاست کی تحویل میں آتی رہتی، تو بیت المال میں اس قدر مال و دولت کی فراوانی ہوتی کہ غزوہ تبوک میں، مسلمانوں کو قلت اسلحہ اور اسباب حرب وسفر کی کمی واقع نہ ہوتی، جبکہ غزوۂ تبوک میں حال یہ تھا کہ بعض افراد، جن کو سفرِ جنگ کے لیے سواری بھی میسر نہ تھی، تو نبی اکرم ﷺ بھی، بیت المال کی خستہ حالی کے باعث، کچھ نہ دے سکے، وہ لوگ بے بسی کے آنسو بہاتے ہوئے واپس لوٹے، آیت (۹/۹۲) میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے، پرویز صاحب، نے، اس کا مفہوم، ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> ''نہ ہی وہ لوگ پیچھے رہ جانے میں، مورد الزام قرار دیئے جا سکتے ہیں جنکی حالت یہ ہے کہ وہ سفر کے لیے سواری کی استطاعۃ نہیں رکھتے تھے، اس لیے وہ تیرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کے لیے سواری کا انتظام کر دیا جائے، اور تنگی کا یہ عالم تھا کہ تم بھی اس کا کچھ انتظام نہیں کر سکتے تھے، اس لیے تم نے بھی اپنی معذوری کا اظہار کر دیا چنانچہ وہ بے بس ہو کر لوٹ گئے، دریں عالم کہ ان کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے، اور ان کا دل اس احساس سے پھٹا جاتا تھا کہ افسوس! آج ہمارے پاس اتنا بھی نہیں کہ ہم اس سے جہاد کے لیے سواری کا انتظام کر سکیں۔'' [1]

یہ واقعہ، اور قرآن کریم کی اس قسم کی آیات، اس امر کو شک وشبہ سے بالاتر کر دیتی ہیں کہ غزوۂ تبوک کے بعد بھی، فاضلہ دولت کی شخصی ملکیت کا اصول رائج رہا تھا، علاوہ ازیں، تاریخ و سیر، اور کتب احادیث میں، ایسے بیشمار واقعات مذکور ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف، عہد نبوی میں، بلکہ خلافتِ راشدہ میں بھی انفرادی ملکیت کا اصول قائم تھا، اور

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۴۳

اس نام نہاد ''نظام ربوبیت'' کا نام ونشان تک نہ تھا جسے پرویز صاحب کی قلمکاری نے قُلِ الْعَفْوَ اور خُذِ الْعَفْوَ کے الفاظ سے، کتاب اللہ کی کُلی اور مجموعی تعلیم کے خلاف کشید کر ڈالا ہے، مگر میں ان بیشمار واقعات کو صرف اس لیے پیش نہیں کرسکتا کہ اتباع پرویز، انہیں یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ یہ سب تاریخی واقعات ہیں اور

''دین میں سند، نہ تاریخ کے مشمولات ہیں، اور نہ مسلمانوں کے متواتر و متوارث عقائد ومسالک، سند ہے خدا کی کتاب۔''[1]

''تاریخ بہر حال ظنّی ہے اور قرآن یقینی، ظنی چیز کو یقینی کی روشنی میں پرکھنا ہوگا نہ کہ یقینی کو ظنّی کے تابع رکھنا۔'' [2]

واقعی! یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن، فی الواقعہ وحی ہے فلہٰذا قطعی اور یقینی ہے، اس معاملہ میں ہمیں پرویز صاحب سے مکمل اتفاق ہے۔

اختلاف، تاویلِ پرویز سے نہ کہ قرآن سے:

ہمیں ''مفکر قرآن'' سے اختلاف تو اس امر میں ہے کہ وہ ایک نرالی اپج اختیار کرتے ہیں، اور اسے منسوب الی القرآن کر کے یہ کہتے ہیں کہ...... ''یہی قرآنی مفہوم ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ خلافِ قرآن ہے، اور ''عجمی سازش'' کا نتیجہ ہے، فلہٰذا قابل ردّ ہے''...... حالانکہ جسے وہ قابل رد قرار دیتے ہیں، وہ قطعاً خلافِ قرآن نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف، اس مفہوم کے خلاف ہوتا ہے، جسے وہ منسوب الی القرآن کر ڈالتے ہیں، اس لیے انسب اور اولیٰ یہی ہے کہ شخصی ملکیت پر دالّ، ان لاتعداد واقعات سے صرفِ نظر کر لیا جائے، اور صرف انہی واقعات کو پیش کیا جائے، جو ''مفکر قرآن'' کی قرآنی بصیرت پر پورے اتر کر، ان کی کتب میں استشہاداً جگہ پا چکے ہیں۔

ذاتی ملکیت پر دال واقعات:

قبل اس کے کہ ذاتی ملکیت پر دال، ان واقعات کو پیش کیا جائے، قارئین کے لیے یہ

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۱۹۲ [2] نظام ربوبیت، صفحہ ۱۹۱

جان لینا ضروری ہے کہ قُلِ العَفُو کا حکم، ہجرت کے تقریباً ایک سال بعد نازل ہوا تھا، اور خُذِ الْعَفْوَ کا حکم، تو ہجرت سے بھی پہلے، مکی دور میں، اسوقت نازل ہو چکا تھا جب ہنوز، اسلامی نظام کے نفاذ کی توقع تک نہ تھی، کجا یہ کہ عملاً نفاذ پذیر ہو چکا ہوتا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ان دونوں آیات (۲/۲۱۹، ۷/۱۹۹) کے نزول کے بعد بھی اموال واراضی کی ذاتی ملکیت کا اصول، اس نظامِ مملکت میں رائج تھا جو جناب رسالتمآب ﷺ نے قائم فرمایا اور خلافت راشدہ میں بھی برقرار رہا۔

۱۔ عہدِ نبوی میں دولتِ زر کی شخصی ملکیت:

غزوۂ تبوک (جو رجب ۹ھ میں وقوع پذیر ہوا) میں لوگوں نے جس ایثار و قربانی سے کام لے کر، اپنے اموال پیش کر کے، اسلامی تحریک کی معاونت کی، اس کی تفصیل، پرویز صاحب نے یوں بیان کی ہے:

> ''یہ معرکہ، اخلاص و منافقت کی امتحان گاہ تھا۔ چنانچہ ایک طرف، صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا، لیکر حاضر ہو گیا، حضرت عثمانؓ نے نو سو (۹۰۰) اونٹ، ایک سو گھوڑے، اور ایک ہزار دینار پیش کیے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چالیس ہزار درہم پیش کیے، حضرت عمرؓ کئی ہزار روپے کا نقد و جنس لے کر حاضر ہوئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ، اپنے گھر، اللہ اور رسول کی محبت کے سوا، کچھ بھی چھوڑ کر نہ آئے، حضرت ابوعقیلؓ انصاری نے دو سیر چھوہارے لا کر حاضر کیے اور عرض کی کہ رات بھر کسی کے کھیت پر، مزدوری کر کے چار سیر چھوہارے حاصل کیے تھے، دو سیر بچوں کو دے آیا ہوں، اور دو سیر خدمتِ اقدس میں حاضر ہیں۔''[1]

یہ واقعہ، اموالِ فاضلہ کی ذاتی ملکیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، اگر آیت (۲/۲۱۹ اور ۷/۱۹۹) کی روشنی میں، بقول پرویز صاحب، واقعی قرآنی حکم یہی ہوتا کہ افراد، ''زائد از

---

[1] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۸۰

ضرورت مال''، اپنے پاس نہیں رکھ سکتے، اور نظام حکومت کا واقعی یہ فریضہ ہوتا کہ وہ افراد سے، ان کا عفو المال، اپنی تحویل میں لے لیتا، تو صحابہؓ کے پاس یقیناً، اُن کی ضروریات سے زائد یہ مال نہ ہوتا، جواب وہ غزوہ تبوک میں پیش کر رہے ہیں۔ پھر یہ واقعہ ''عفو'' سے متعلقہ، دونوں آیات کے نزول کے برسوں بعد کا واقعہ ہے، حتّٰی کہ فتح مکہ کے بھی بعد کا واقعہ ہے، اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شاید، اسلامی حکومت، ہنوز، قائم نہ ہو پائی ہو، کیونکہ اسلامی حکومت کا قیام، مدینۃ الرسول میں، ہجرت کے فوراً بعد، عمل میں آ چکا تھا، اور وقتاً فوقتاً نازل ہونے والے قوانین کا نفاذ بھی ہو رہا تھا، اور مملکت اسلامیہ کا دائرہ، دن بدن وسیع بھی ہو رہا تھا، حتّٰی کہ غزوہ تبوک تک اس کی قلمرو میں تقریباً پورا جزیرۃ العرب شامل ہو چکا تھا۔

لٰہذا، عہد رسالتمآب میں، یہ بات، ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ وہاں ذاتی ملکیت کی نفی کا اصول قطعی مفقود تھا، لوگ، اپنی محنت کے ماحصل کو پاتے تھے، ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد، فاضلہ دولت ان کی ملکیت میں رہتی تھی جس میں سے وہ موقع بموقع خرچ کیا کرتے تھے۔

۲۔عہدِ نبوی ودورِ صدیقی میں تقسیمِ غنائم:

اموال غنیمت میں سے چار اخماس کا، مجاہدین میں تقسیم کیا جانا بھی، مال و دولت کی انفرادی ملکیت کا قطعی اور واضح ثبوت ہے، غنائم کی تقسیم، اگرچہ ہر دور میں ہوتی رہی ہے، مگر عہد نبوی اور دور صدیقی میں تقسیم غنائم کا ذکر، خود پرویز صاحب نے بھی کیا ہے۔

> ''رسول اللہ اور خلافت صدیقی میں قانون یہ تھا کہ مال غنیمت، مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔''[1]

حضرت خالدؓ بن ولید (سیف اللہ) کی معزولی پر بحث کرتے ہوئے، پرویز صاحب، نے لکھا ہے کہ

---

[1] شاہکار رسالت، صفحہ ۲۷۹

''حضرت عمرؓ نے انہیں مدینہ بلا لیا اور ان سے کہا کہ ''تم کہاں کے ایسے دولت مند تھے کہ اس قدر خطیر رقم انعام میں دیدی''، انہوں نے کہا کہ ان فتوحات میں، ساٹھ ہزار درہم، بطور مالِ غنیمت، میرے حصہ میں آیا ہے، آپ حساب کر لیجیے، جس قدر اس سے زائد ہو وہ لے لیجیے، چنانچہ حساب کیا گیا تو اسی ہزار درہم نکلے، ان میں ساٹھ ہزار درہم چھوڑ دیئے گئے اور باقی بیس ہزار بیت المال میں داخل کر دیئے۔'' [1]

عہد صدیقی اور پھر اس کے بعد دور فاروقی کا یہ واقعہ تقسیمِ غنائم، مال و دولت کی انفرادی ملکیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۳۔ عہد فاروقی اور مال دولت کی شخصی ملکیت:

عہد فاروقی کے بیشمار واقعات میں سے درج ذیل واقعہ بھی، مال و دولت کی شخصی ملکیت کا آئینہ دار ہے۔

''یہ واقعہ مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ، اپنی بیویوں کا مہر مقرر کرنے میں بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں، تو آپ نے ایک اجتماع میں، اس کا ذکر کیا اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ اس پر ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ ''یہ کیا؟ اللہ نے فرمایا ہے کہ وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَاراً فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا (۴/۲۰)''اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو' حضرت عمرؓ، یہ سنکر بول اٹھے کہ عورت نے سچ کہا ہے، عمرؓ غلطی پر تھا۔'' [2]

شادی کے موقع پر، لوگوں کا اپنی مالی حیثیت کے مطابق...... عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ..... حقیر یا خطیر رقم کو بصورتِ حق مہر، بیویوں کو دینے کا رواج، صریحاً اُس معاشرت سے میل کھاتا ہے جس میں نہ صرف یہ کہ ذاتی ملکیت مال کا اصول متداول

---

[1] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۲۱ [2] شاہکار رسالت، صفحہ ۲۷۷

ہو، بلکہ لوگوں میں مساواتِ شکم کی بجائے، تفاضل فی الرزق بھی پایا جاتا ہو، خلافتِ فاروقی کا یہ واقعہ، اس امر کو مبرہن کر ڈالتا ہے کہ اُس دور میں بھی، مال وزر کی انفرادی ملکیت کا اصول کارفرما تھا، اگر فاروقی حکومت، لوگوں کی مکسوبہ دولت میں سے، فاضلہ دولت، خود اپنی تحویل میں لے لیا کرتی، تو قنطار (ڈھیر سا مال) دیئے جانے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا۔ اگر ریاست واقعی، لوگوں کا عفو المال لے لیا کرتی تو حق مہر کے قطعی تعین کی کوئی گنجائش ہی نہ رہتی کجا یہ کہ لوگ افراط سے کام لیتے اور پھر خلیفۂ وقت کو (بیش از بیش یا کم از کم) کوئی حد مقرر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی، اور خلیفہ عمرؓ سے مخاطب خاتون، اُس دروازے کو کُھلا رکھنے پر زور دیتی جس سے خواتین کے حصولِ قنطار کا امکان وابستہ رہتا تھا، یہ سب کچھ تو اس نظام حکومت اور معاشرے ہی میں ممکن ہے جہاں شخصی ملکیتِ مال کا اصول جاری ہو، اور لاریب خلافتِ فاروقی، ایسے ہی نظام حکومت اور سماج کا منظر پیش کرتی ہے، نہ کہ وہ جو ''مفکر قرآن'' کی خلاّقیٔ ذہن کا کرشمہ ہے۔

آیتِ غنیمت کی معنوی تحریف:

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اموالِ غنیمت کا سپاہ میں تقسیم کیا جانا، بجائے خود، ملکیتِ مال و دولت کی کھلی دلیل ہے، اور اسلام میں تقسیم غنائم کے قانون کا موجود ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ انفرادی ملکیت کا علمبردار ہے، یہ نقطۂ نظر چونکہ پرویز صاحب کے اس مارکسزم کے خلاف ہے جسے وہ ''نظام ربوبیت'' کا نام دیتے ہیں، اس لیے، انہیں، اس قانون میں مطلوبہ تبدیلی واقع کرنے کے لیے، تحریف کی راہ اختیار کرنا پڑی۔

قرآن کریم نے مال غنیمت کے متعلق، یہ قانون دیا ہے کہ کل مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ، خدا و رسول، رشتہ داروں، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے ہے، بقیہ چار اخماس، فوج میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں، مجاہدین میں مال غنیمت کی یہ تقسیم، چونکہ صریح طور پر، فاضلہ دولت کی شخصی ملکیت کی دلیل ہے، اس لیے ''مفکر قرآن'' نے اس بدیہی حقیقت کو مسخ کرنے کے لیے، مفہومِ آیت میں، ایسی ترمیم بلکہ تحریف کی ہے جو قواعد زبان کے یکسر

خلاف ہے، ملاحظہ فرمایئے، آیت کے الفاظ:

وَاعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنَ السَّبِیْلِ (الانفال:۴۱)

''اور یہ جان لو کہ جو کچھ غنیمت کا مال، تم نے پایا ہے، اس کا پانچواں حصہ (۱/۵)، اللہ، رسول، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔''

آیتِ غنیمت کا جدید مفہوم:

آیت غنیمت کے الفاظ تو وہی رہے، مگر ''مفکر قرآن'' کا مفہومِ آیت، اب یوں ہو گیا۔

''یاد رکھو! میدان جنگ میں جو مال غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ ''خدا و رسول'' یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات کے لیے رکھ کر، باقی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے صرف کیا جائے گا (مثلاً میدان جنگ میں جانے اور کام آ جانے والوں کے) اقرباء کے لیے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یارومددگار، تنہا رہ جانے والوں کے لیے، جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو، یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں، نیز، ان مسافروں کے لیے، جو مدد کے محتاج ہوں۔''[1]

''مفکر قرآن کے اس جدید مفہوم کے لحاظ سے، کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ، خدا و رسول یعنی ''مملکت کی انتظامی ضروریات'' کے لیے ہوگا، اور بقیہ چار اخماس (۴/۵) قربتداروں، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے ہوں گے جبکہ چودہ صدیوں پر محیط، اسلامی ادب میں، جمیع علماء سلف و خلف کے نزدیک، کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ، خدا و رسول، اقرباء، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے، اور بقیہ چار اخماس (۴/۵) سپاہ افواج میں تقسیم ہوں گے۔

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۹۶

''مفکر قرآن'' نے اپنے اس جدید ترجمہ و مفہوم کی خاطر، آیت کو بدترین تحریف کا نشانہ بنایا ہے، الفاظِ آیت لِلّٰہِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ کی بنیاد پر، خدا و رسول کو باقی مستحقینِ غنیمت سے الگ کر کے، ان کے لیے، ایک خمس مخصوص کرنا اور ذِوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنَ السَّبِیْلِ کو خدا و رسول سے جدا کر کے، انہیں چار اخماس کا مستحق قرار دینا، قواعد زبان کے قطعی خلاف ہے، کیونکہ جس حرفِ جار (لام) کے تحت ''اللہ و رسول'' کا ذکر ہے، اُسی حرف جار کے تحت، باقی مستحقین بھی مذکور ہیں، لہٰذا یہ تمام لوگ، جو ایک ہی حرف جار (لام) کے تحت، آیت میں، مذکور ہیں، خدا و رسول کے ساتھ صرف، ایک ہی خمس کے مستحق ہیں۔

ہمارا جی تو یہ چاہتا ہے کہ ہم چودہ صدیوں کے علماء سلف و خلف کے اقتباسات پیش کرتے جو ہمارے مؤقف کی تصدیق کرتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے صرف اس لیے محترز ہیں کہ پرویز صاحب اور ان کے ماننے والے، یہ کہہ دیں گے کہ ''یہ رویہ، اسلاف کی راہ پر، اندھے کی لاٹھی کا سہارا لینے کے مترادف ہے''، اس لیے ہم یہاں ''مفکر قرآن'' ہی کا ایک اقتباس پیش کیے دیتے ہیں کیونکہ:

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

''اور جان رکھو کہ جو تمہیں مال غنیمت میں ملے، اس کا پانچواں حصہ، اللہ کے لیے، رسول کے لیے، (رسول کے) قرابت داروں کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں کے لیے، اور مسافروں کے لیے، نکالنا چاہیے، (اور بقایا چار حصے، مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جا سکتے ہیں)۔''[۱]

اور اسی صفحہ پر حاشیہ میں، یہ عبارت بھی موجود ہے .... ''مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوگا، اور باقی چار حصے، سپاہیوں میں تقسیم ہوں گے............''

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۶۲۴

''مفکرِ قرآن'' کے تضادات:

''مفکرِ قرآن'' نے آیت غنیمت کے مفہوم کو نشانہ تحریف بناتے وقت یہ قطعاً نہیں سوچا کہ ان کے طرزِ عمل سے کس طرح تضادات کے شگوفے پھوٹ رہے ہیں، یہاں دو تضادات ملاحظہ فرمایئے۔

اولاً یہ کہ، آیت میں مذکور وَلِذِی الْقُرْبٰی سے کون اور کس کے رشتہ دار مراد ہیں؟ ''مفکرِ قرآن'' نے اِسکے دو متضاد جوابات دیئے ہیں۔

(الف) میدان جنگ میں جانے اور کام آ جانے والے لوگوں کے رشتہ دار۔

(دیکھئے مفہوم القرآن، آیت (۸/۴۱)، صفحہ ۴۰۴)

(ب) رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار (دیکھئے معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۶۲۴)

کس کا یقین کیجیے، کس کا یقین نہ کیجیے
لائے ہیں بزمِ ناز سے لوگ خبر الگ الگ

ثانیاً یہ کہ ''خدا اور رسول'' کے نام پر، مالِ غنیمت کا ایک خمس، جو الگ کیا گیا ہے، اس کا مصرف کیا ہے؟ اس کے بھی دو متضاد جوابات ہیں۔

(الف) پانچواں حصہ، خدا ورسول یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات کے لیے ہوگا

(دیکھئے مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۹۶)

(ب) یہ حصہ، ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہوگا۔

(دیکھئے تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۹۷)

پانی میں مدھانی:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ''خدا ورسول'' کے نام پر الگ کیا جانے والا خمس بھی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے، صرف کیا جائے گا، جیسا کہ ''مفکرِ قرآن'' کے درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

''یہ مال سب کا سب نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہنا چاہیے تاکہ اس کو

ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے صرف کیا جائے۔''[1]

تو پھر بقیہ چار اخماس (۴/۵) کا مصرف کیا ہے؟ پرویز صاحب کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

''یاد رکھو! میدان جنگ میں جو مال غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ، خدا اور سول یعنی انتظامی ضروریاتِ مملکت کے لیے رکھ کر، باقی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے صرف کیا جائے گا۔'' [2]

اب جبکہ ''خدا و رسول'' کے نام پر، الگ کیا جانے والا ایک خمسِ غنیمت، اور باقی مذکورین فی الآیت کے نام پر الگ کیے جانے والے چار اخماس کا مصرف بھی ایک ہی ٹھہرا (یعنی ضروتمندوں کی ضروریات کو پورا کرنا)، تو پھر فہرستِ مستحقینِ غنیمت میں یہ فرق و امتیاز کیسا؟ جب سارا مال غنیمت ضرورت مندوں ہی کے لیے ہے، تو ایک خمس اور چار خمس کی یہ تفریق کیوں؟ پانی میں مدھانی چلانے کا آخر فائدہ کیا؟ جب مقصد ضرورتمند کی حاجت بر آری ہی تھا تو اخماس میں تفریق و امتیاز کا یہ پیچیدہ راستہ کس لیے؟ اس قسم کے سوالات کا آپ کے ذہن میں پیدا ہونے اور پھر زبان سے استفسار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بگلا پکڑنے والی کہانی نہیں سنی۔ کہانی یہ ہے کہ کسی نے لال بجھکڑ سے پوچھا کہ بگلا کیسے پکڑا جاتا ہے؟۔ اس نے کہا کہ ''جب بگلا اطمینان سے دھوپ میں بیٹھا ہو، تو دبے پاؤں جا کر اس کے سر پر موم رکھ آؤ، اور پھر خاموشی اور صبر سے انتظار کرو، کیونکہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جب موم دھوپ سے پگھل کر، اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لے گی تو وہ اندھا ہو جائے گا۔ اُس وقت جا کر بگلے کو پکڑ لو۔'' مستفسر نے پوچھا کہ جب بگلے کے سر پر موم رکھنے کے لیے جائیں، تو اُسے ،اُس وقت کیوں نہ پکڑ لیں؟ لال بجھکڑ نے فرمایا کہ ''پھر اس میں استادی کیا ہوئی؟''۔

یہ ہے بگلے پکڑنے کی استادانہ تدبیر اور وہ ہے آیتِ غنیمت کی ''مفکرانہ'' تفسیر۔

☆......☆......☆

TRUEMASLAK@INBOX.COM

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۹۹ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۹۶

باب پنجم

انفاقِ اموال اور قرآن مجید

قرآن حکیم نے جگہ جگہ، اہل ایمان کو انفاقِ اموال کا حکم دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حکم ذاتی ملکیت مال کو متضمن ہے، ''مفکر قرآن'' نے اس لفظ سے اس لزوم و تضمن کو خارج کرنے کے لیے، اس کے مفہوم کو قطعی طور پر تبدیل کر دیا ہے، چنانچہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) کے تحت وہ لکھتے ہیں:

> ''ان الفاظ کا ترجمہ کیا جاتا ہے...... ''جو روزی ہم نے دی ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں''...... یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے مال و دولت کو خرچ کرتا ہے، لہٰذا اس میں متقین کی کیا خصوصیت ہے جو ان کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت پڑی کہ متقی وہ ہیں جو اپنے مال و دولت کو خرچ کرتے ہیں، اس کے لیے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دینا کافی تھا کہ وہ اپنے روپے پیسے کو احتیاط سے خرچ کرتے ہیں اور فضول خرچی (اسراف و تبذیر) سے بچتے ہیں۔'' [1]

''مفکر قرآن'' کا ان الفاظ کے ترجمہ پر یہ اعتراض کرنا کہ جب آدمی، اپنی دولت کو خرچ کرتا ہی ہے تو اسے متقین کی صفات میں کیوں شامل کیا گیا ہے، نہایت سطحی اعتراض ہے جو ان کی کوتاہ نظری پر دال ہے، اگر وہ غور کرتے تو انہیں یہ محسوس ہوتا کہ بخیل اور کنجوس لوگوں کے مقابلے میں، واقعی، یہ اہل تقویٰ کی خوبی ہے کہ وہ اپنی دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں، علاوہ ازیں، ان الفاظ میں دو مفہوم اور بھی پائے جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۱، صفحہ ۱۰۵

۱...... یہ لوگ، ''ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے'' خرچ کرتے ہیں (وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ پر زور ہے)، اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے، یہ لوگ ناجائز ذرائع آمدنی اختیار نہیں کرتے، بلکہ ہمارے عطا کردہ رزق حلال پر قناعت کرتے ہیں اور اسی روزی پر گزارہ کرتے ہیں جو انہیں حلال ذرائع سے پہنچتی ہے، اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے حرام مال پر ہاتھ مارنا، ان کا شیوہ نہیں ہے۔

۲...... یہ متقی لوگ ہیں، ان کے اموال کے مصرف، فسق و فجور کی راہیں نہیں ہیں بلکہ بر و تقویٰ کی راہیں ہیں، یہ لوگ، بخل سے دامن کش رہتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں اپنے مال صرف کرتے ہیں، کیونکہ اسلام میں انفاق ہمیشہ ''فی سبیل اللہ'' ہی کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔

یہی وہ حقائق ہیں، جن کی بناء پر، وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کو صفاتِ مومنین میں شمار کیا گیا ہے۔

انفاق کی لغوی تحقیق:

پرویز صاحب نے، انفاق کے لفظ میں سے ''خرچ کرنے'' کے مفہوم کو خارج کرنے کے لیے، جو لغوی تحقیق کی ہے، اسے وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> ''اب لفظ يُنْفِقُوْنَ کی طرف آیئے، جس کا مادہ (ن۔ف۔ق) ہے، نفق اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں، جنگلی چوہا اپنے رہنے کے لیے، جو بل بناتا ہے، اس میں داخل ہونے کے علاوہ، اگلی طرف، باہر نکلنے کے لیے متعدد راستے بنا چھوڑتا ہے اور انہیں باریک مٹی سے ڈھانپ دیتا ہے کہ جو کوئی اسے پکڑنے کی کوشش کرے تو وہ ان راستوں سے نکل جائے، اس قسم کی سرنگ کو نفق کہتے ہیں، بنا بریں، منافق، اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی نظام میں داخل ہونے سے پہلے، دل میں یہ سوچ لے کہ مجھے اس سے باہر نکلنا پڑا تو اس کے لیے کون کون سے راستے اختیار

کرنے ہوں گے، بہر حال، اس مادہ کے بنیادی معنٰی ''خرچ کرنا'' نہیں بلکہ ''کھلا رکھنا'' ہیں۔'' [۱]

''مفکر قرآن'' بزعم خویش، عمر بھر قرآنی تحقیق میں مصروف رہے ہیں لیکن قرآنی الفاظ کی لغوی تحقیق میں، تغافل جاہلانہ یا تجاہل عارفانہ کے باعث وہ ایسی روش اختیار کرتے رہے ہیں کہ علم اشتقاق کا مبتدی طالب علم بھی بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

تامرد سخن نگفته باشد
عیب و ہنرش نہفته باشد

اگر ''مفکر قرآن'' کے دل و دماغ پر ''انفاق'' کی بے لاگ، لغوی تحقیق کا فکر ہی غالب ہوتا اور ان پر اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی جا وبیجا حمایت کی دھن سوار نہ ہوتی تو ان ہی کتب لغات سے، جو بقول، ان کے، ان کی اپنی لغات القرآن کی ترتیب و تدوین میں اساس کا کام دیتی رہی ہیں، ان پر یہ واضح ہو جاتا کہ (ن۔ف۔ق) کا مادہ، دو جداگانہ اصل فراہم کرتا ہے، ان میں سے، ایک، کسی چیز سے کٹ کر جدا ہو جانے اور چلے جانے پر دلالت کرتا ہے، اور دوسرا کسی شئے کے اخفاء واغماض پر۔

(نفق) اَلنُّونُ وَالْفَآءُ وَالْقَافُ اَصْلَانِ صَحِيْحَانِ يَدُلُّ اَحَدُهُمَا عَلٰى اِنْقِطَاعِ شَیْءٍ وَذِهَابِهٖ وَالْاٰخَرُ عَلٰى اِخْفَاءِ شَیْءٍ وَاِغْمَاضِهٖ [۲]

''نفق...... ''ن۔ف۔ق'' دو اصل ہیں اور دونوں ہی صحیح ہیں، ایک اصل، کسی چیز کے منقطع ہونے اور چلے جانے پر دال ہے، جبکہ دوسری اصل، اخفاء و اغماض پر دلالت کرتی ہے۔''

پھر اصلِ اول میں مصدرِ فعل (قلیل وکم ہونے، ختم اور فنا ہونے یا مر جانے) کا مفہوم پایا جاتا ہے جبکہ اصل دوم میں، اسم (سرنگ یا جنگلی جانور کے بل وغیرہ) کا مفہوم پایا جاتا ہے جس میں داخل ہو کر چھپ جانے میں، اخفاء و اغماض کا معنٰی واقع ہے۔

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۱، صفحہ ۱۰۵ تا ۱۰۶

[۲] معجم مقاییس اللغة لا بن فارس، جلد۵، صفحہ ۴۵۴

(الف) کمی وقلت اور فناء اور نفاد کا مفہوم:

قلت و کمیابی اور فناء و نفاد کا مفہوم درج ذیل صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

..... نَفَقَ مَالُهٗ وَدِرْهُمُهٗ وَطَعَامُهٗ نفقًا ونفاقًا ..... ونَفِقَ كِلا هُمَا نقص وَقَلَّ وَقِيْلَ فَنِيَ وَ ذَهَبَ [1]

''مال، درہم یا طعام میں ''نفق'' یا ''نفاق'' ہوا، یعنی ''ان میں کمی و قلت ہو گئی'' اور یہ بھی کہا گیا کہ ''یہ چیزیں فنا ہوئیں اور (ہاتھ سے) چلی گئیں۔''

.....نَفَقَ الشَّيْءُ : مَضٰى وَ نَفِدَ

''چیز چلی گئی اور ختم ہو گئی۔'' [2]

.....نَفَقَ الشَّيْءُ : فَنِيَ ''چیز فنا ہوئی'' [3]

اسی نفق (بمعنی قلیل و کم ہونا، فناء و ختم ہونا اور لقمہ موت بن جانا) سے باب افعال کا مصدر انفاق آتا ہے جس کا استعمال، بطور فعل لازم کے بھی ہوتا ہے اور بطور فعل متعدی کے بھی..... جب فعل لازم کے طور پر آتا ہے تو اس کے معنیٰ ''مال کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد، فقیر و محتاج ہونے'' کے ہیں، اور جب فعل متعدی کے طور پر، استعمال ہو تو اس کا معنیٰ ''بذل و صرف کے ذریعہ، کسی چیز میں کمی کر دینے'' کے ہیں۔

.....اَنْفَقَ الرَّجُلُ : اِفْتَقَرَ اى ذَهَبَ مَاعِنْدَهٗ [4]

''آدمی نے ''انفاق کیا یعنی حاجتمند اور فقیر ہوا، جو کچھ اس کے پاس تھا وہ (ہاتھ سے نکل کر) چلا گیا۔''

.....اَنْفَقَ فُـلَانٌ : اِذا نَفِقَ مَالُهٗ فَا فْتَقَرَ [5]

''فلاں نے ''انفاق'' کیا یعنی اس کا مال قلیل و کم ہوا (یا ختم ہوا) اور وہ فقیر اور

---

[1] لسان العرب لابن منظور، جلد۱۰، صفحہ۳۵۷ [2] مفردات للراغب، صفحہ۵۰۲

[3] معجم مقاييس اللغة، جلد۵، صفحہ۴۵۴

[4] معجم مقاییس اللغۃ لابن فارس، جلد۵، صفحہ۴۵۴ + لسان العرب، جلد۱۰، صفحہ۳۵۸

[5] مفردات للامام الراغب، صفحہ۵۰۲

حاجت مند ہوا۔''

قرآن پاک کی آیت اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ (۱۷/۱۰۰) میں یہ لفظ بطور فعل لازم ہی کے استعمال ہوا ہے، فعل متعدی کے طور پر، قرآن پاک میں ''انفاق'' کا استعمال جہاں بھی ہوا ہے، وہاں اکثر و بیشتر مقامات پر، اس کا مفعول مال و دولت واقع ہوا ہے جس سے صرف و بذل کے ذریعہ، مال میں کمی و قلت یا فناء و نفاد کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ دنیا و جہاں کی کوئی بھی ڈکشنری اٹھا کر دیکھ لیجیے اَنْفَقَ الْمَالَ کا معنیٰ، آپ کو یہی ملے گا کہ ''اس نے مال خرچ کیا۔'' اس خرچ میں کمی و نفاد کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

اَنْفَقَ الْمَالَ اَی بَذَلَ الْمَالَ وَصَرَفَهُ [۱]

''اس نے انفاقِ مال کیا یعنی مال خرچ کیا یا صرف کیا۔''

(ب) مرگ و موت کا مفہوم:

یہ مفہوم، ان صورتوں میں پایا جاتا ہے:

نَفِقَتِ الدَّابَّةُ نفوقًا [۲]

''جانور نے ''نفوق'' کیا یعنی وہ مر گیا۔''

اصلِ ثانی:

اصلِ ثانی کے اعتبار سے نفق میں دوسرا مفہوم ''سرنگ'' کا پایا جاتا ہے جس میں چھپ جانے سے اخفاء و اغماض کا معنیٰ متحقق ہوتا ہے۔

.....وَالْاَصْلُ الْاٰخَرُ النَّفَقُ : سَرْبٌ فِی الْاَرْضِ لَهٗ مَخْلَصٌ اِلٰی مَکَان [۳]

''دوسری اصل نفق ہے جو زمین میں ایسی سرنگ ہے جس میں سے کہیں نکلنے کا راستہ بھی ہوتا ہے۔''

.....وَالنَّفَقُ الطَّرِيْقُ النَّافِذُ وَالسَّرْبُ فِی الْاَرْضِ النَّافِذ [۴]

---

[۱] لسان العرب، جلد ۱۰، صفحہ ۳۵۸
[۲] معجم مقاییس اللغۃ، جلد ۵، صفحہ ۴۵۴ + لسان العرب، جلد ۱۰، صفحہ ۳۵۷ + المعجم الوسیط، جلد ۲، صفحہ ۹۴۲
[۳] معجم مقاییس اللغۃ، جلد ۵، صفحہ ۴۵۵
[۴] مفردات، صفحہ ۵۰۲

''اور ''نفق'' آر پار ہونے والا راستہ ہے نیز زمین میں آر پار ہونے والی سرنگ کو بھی کہتے ہیں۔''

.....والنَّفقُ : سَرُبٌ فِي الْاَرْضِ مُشْتَقٌّ اِلٰی مَوْضَعٍ اٰخَر ۱

''اورنفق زمین میں واقع ایسی سرنگ ہے جسے دوسری جگہ تک شق کیا گیا ہو۔''

اسی نفق (بمعنی سرنگ سے) نَافِقَاء کا لفظ آیا ہے جس سے مراد جنگلی چوہوں کے بل یا سوراخ ہیں، چنانچہ علماء لغت یہ بیان کرتے ہیں کہ

.....وَالنَّافِقَآءُ : مَوضَعٌ یُرَقِّقُهُ الْیَرْ بُوعُ مِنْ حُجُرِهٖ فَاذَا اُتِیَ مِنْ قِبَلِ الْقَاصِعَاءِ ، ضَرَبَ النَّافِقَآءَ بِرَأسِهٖ فَانْتَفَقَ اَیْ خَرَجَ ۲

''اور نافقاء، جنگلی چوہے کے بل کا وہ مقام (سرا) ہے جسے اس نے مٹی کی پتلی سی تہہ سے ڈھانپ رکھا ہو کہ جب کوئی بل میں اس پر حملہ آور ہو تو وہ سر کی ٹھوکر سے، اسے توڑ کر باہر نکل جائے۔''

.....وَمِنْهُ نَافِقَآءُ الْیَرْبُوعِ وَقَدْ نَافَقَ الْیَرْبُوعُ ونَفَقَ ۳

''اس سے جنگلی چوہے کا بل ''نَافِقَاء'' برآمد ہوا ہے (کہا جاتا ہے) چوہا بل میں داخل ہوا اور نکل گیا۔''

.....اَلنَّا فِقَاءُ جُحْرُ الضَّبِّ وَالْیَرْبُوعِ وَقِیْلَ النُّفَقَةُ وَالنَّافِقَآءُ مَوْضِع یُرَقِّقُهُ الْیَرْبُوعُ مِنْ جُحْرِهٖ فَاِذااُتِیَ مِن قِبَلِ الْقَاصِعَاء ضَرَبَ النَّا فِقَاءَ بِرَأْسِهٖ فَخَرَجَ ۴

''نافقاء، گوہ اور جنگلی چوہے کے بل کو کہتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ النُّفَقَةُ اور النَّافِقَآءُ بل کا وہ مقام (سرا) ہے جسے چوہے نے مٹی کی باریک تہہ سے ڈھانپ رکھا ہو، تا کہ اگر اس پر بل میں (کھلے سرے کی طرف سے) حملہ ہو، تو

---

۱ لسان العرب، جلد۱۰، صفحہ ۳۵۸
۲ معجم مقاییس اللغۃ، جلد۵، صفحہ ۴۵۵
۳ مفردات للراغب، صفحہ ۵۰۲
۴ لسان العرب، جلد۱۰، صفحہ ۳۵۸

وہ اپنے سر کی ٹھوکر سے، اسے توڑ کر باہر نکل جائے۔"

چنانچہ اسی نفق (بمعنی سرنگ) سے مندرجہ ذیل الفاظ آتے ہیں۔

.....نَفَقَ الیَرْبُوعُ وَنَفِقَ وَانْتَفَقَ و نَفَّقَ : خَرَجَ مِنْهُ [۱]

"جنگلی چوہے نے "نفوق" "نفاق" "انتفاق" اور "تنفیق" کی یعنی وہ بل سے خارج ہوا۔"

.....نافق الیَرْ بُوعُ و نَفَقَ [۲]

"جنگلی چوہا ایک طرف سے بل میں داخل ہوا اور دوسری طرف سے نکل گیا۔"

.....انتفق الیَرْبُوعُ [۳]

"جنگلی چوہا بل میں سے نکلا۔"

اور اسی نفق (بمعنی سرنگ یا بل) سے وہ "نفاق" ہے جسے منافقین کا طرز عمل کہا جاتا ہے۔

.....وَمِنْهُ اشتقاق النِّفَاقِ لِاَنَّ صَاحِبَهُ یکْتُمُ خِلَافَ مَایُظْهِرُ فَکَانَّ الْاِیْمَانَ یَخْرُجُ اوهو مِنَ الایْمَان فِی خِفَاءٍ [۴]

"اور اسی نفق (بمعنی سرنگ) سے "نفاق" مشتق ہوا ہے، کیونکہ صاحب نفاق، اپنے دل میں وہ کچھ چھپائے رکھتا ہے جسکے خلاف وہ ظاہر کرتا ہے گویا ایمان، اس کے دل سے نکل جاتا ہے یا وہ خود، ایمان میں سے چھپ چھپا کر نکل جاتا ہے۔"

منافق کے "نفاق" میں اور جنگلی چوہے کے "نافقاء" میں جو معنوی تقارب پایا جاتا ہے، اسے لسان العرب میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

.....سُمِّیَ الْمُنَافِقُ مُنَا فِقًا لِلنَّفْقِ وَهُوَ السَّرْبُ فِی الْاَرْضِ وَقِیْلَ اِنَّمَا سُمِّیَ مُنَافِقًا لِاَنَّهُ نَا فَقَ کَالْیُرْبُوعِ وَهُوَ دَخُولُهُ نَافِقَائَهُ ..... وَلَهُ

---

[۱] لسان العرب، جلد ۱۰، صفحہ ۳۵۸ — [۲] مفردات، امام راغب، صفحہ ۵۰۲

[۳] معجم مقاییس اللغۃ، جلد ۵، صفحہ ۴۵۵ — [۴] معجم مقاییس اللغۃ، جلد ۵، صفحہ ۴۵۵

جُحْرَ اٰخَرُ يُقَالُ لَهُ القَاصِعَاءُ فَإِذَا طُلِبَ قَصَّعَ فَخَرَجَ مِنَ القَاصِعَاءِ فَهُوَ يَدْخُلُ فِي النَّافِقَاءِ وَيَخْرُجُ مِنَ القَاصِعَاءِ اَوْيَدْخُلُ فِي القَاصِعَاءِ وَيَخْرُجُ مِنَ النَّافِقَاءِ فَيُقَالُ هٰكَذَا يَفْعَلُ المُنَافِقُ يَدْخُلُ فِي الْاِسْلَامِ ثُمَّ يَخْرُجُ مِنْهُ مِنْ غَيْرِ الْوَجْهِ الَّذِي دَخَلَ فِيْهِ [۱]

''منافق کو منافق کا نام، اس نفق کے باعث دیا گیا ہے جو بصورتِ سرنگ زمین میں موجود ہوتی ہے، اور یہ بھی کہا گیا کہ اسے اس لیے یہ نام دیا گیا کہ اس کا (دین میں) داخل ہونا (اور نکلنا) جنگلی چوہے کے اپنے بل میں داخل ہونے (اور نکلنے) کے مماثل ہے ...... جنگلی چوہے کے بل کا ایک دوسرا سرا بھی ہوتا ہے جسے قاصعاء کہا جاتا ہے، جب یہ کسی (دشمن جانور) کو مطلوب ہوتا ہے، تو وہ (جنگلی چوہا) اس قاصعاء میں سے باہر نکل جاتا ہے، اس طرح وہ نافقاء میں داخل ہوتا ہے اور قاصعاء میں سے نکل جاتا ہے یا قاصعاء میں داخل ہوتا ہے اور نافقاء میں سے نکل جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ منافق کا طرزِ عمل بھی ایسا ہی ہے وہ اسلام میں، ایک رخ سے داخل ہوتا ہے، اور دوسرے رخ سے نکل جاتا ہے۔''

ہماری اس لغوی بحث سے واضح ہوا کہ

(۱) نفق کے مادہ سے دو اصل برآمد ہوتی ہیں۔

(الف) نفق (دوسرے مصادر کے ساتھ) بمعنی نقصان و قلت، فناء و نفاد اور مرگ و موت۔

(ب) نفق بمعنی سرنگ (یا بل)

(۲) ''انفاق'' (جو نفق سے باب افعال کا مصدر ہے) کا تعلق اصل اول سے ہے جبکہ منافق کے نفاق کا تعلق اصل ثانی سے ہے۔

---

[۱] لسان العرب، جلد۱۰، صفحہ۳۵۹

لغوی تحقیق میں پرویز صاحب کی اصل لغزش:

اس امر میں، پرویز صاحب کی اصل لغزش یہ ہے کہ وہ، انفاق کی لغوی بحث کی ابتداء، نفق بمعنی سرنگ سے کرتے ہیں، حالانکہ اس مادہ سے، کوئی واحد اور تنہا اصل نہیں بلکہ دو اصل برآمد ہوتی ہیں، (۱) نفق بمعنی قلیل و کم ہونا اور فناء و نفاد کا شکار ہونا، اور (۲) نفق بمعنٰی سرنگ۔ ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنی جہالت یا شرارت سے، اصل اول کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں، اور پھر نفق بمعنی سرنگ کو لیکر، تمام علماء لغت کے خلاف، لفظ ''انفاق'' میں ''کھلا رکھنے'' کا مفہوم داخل کرتے ہیں حالانکہ یہ لفظ، نفق بمعنی سرنگ سے ماخوذ ہونے کی بجائے، نفق بمعنی نقصان و نفاد سے ماخوذ ہے، خواہ یہ قلت و کمی اور فناء و نفاد، بذل و صرف کے ذریعہ سے ہو یا خرید و فروخت کے عمل سے، یا موت و ہلاکت اسکا سبب ہو، چنانچہ اسی نفق (بمعنی نقصان و نفاد) سے باب افعال کا مصدر ''انفاق'' لایا گیا ہے جس کا مفعول، اگر مال و دولت ہو، تو دنیا جہان کی ہر لغت میں، اس کا معنٰی ''بذل و صرف'' ہی دیا گیا ہے، کیونکہ اس معنٰی میں نقصان و نفاد کے دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں، کسی لغت میں اَنْفَقَ الْمَالَ کا معنٰی ''اس نے مال کو کھلا رکھا'' موجود نہیں ہیں۔ ''مفکر قرآن'' اپنی انتہائی کوشش کے باوجود، کسی گری پڑی کتاب لغت سے بھی، یہ معنٰی بیان نہیں کر پائے، انہوں نے یہ معنٰی لفظی شعبدہ بازی اور حرفی بازیگری کے نتیجہ میں خود پیدا کیے ہیں، پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ...... انفاق کے معنٰی ''خرچ کرنے'' کے علاوہ ''کھلا رکھنے'' کے بھی ہیں، بلکہ وہ بڑی بلند آہنگی اور بڑے دھڑلے سے ''بذل و صرف'' کے معانی کی نفی کرتے ہیں، اور یہ اصرار کیے چلے جاتے ہیں کہ

> ''اس مادہ کے بنیادی معنٰی ''خرچ کرنا'' نہیں بلکہ ''کھلا رکھنا'' ہے ......
> واضح رہے کہ انفاق کے معنی ''خرچ کرنے'' کے نہیں۔'' [۱]

لیکن میدان تحقیق میں یہ انکشاف کر ڈالنے کے بعد، کہ ''انفاق'' کے معنٰی ''خرچ

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶

کرنا'' نہیں ہے، وہ خود، اپنی تحقیق کے خلاف، اسی معنیٰ کو قبول کرتے ہیں، چند مثالیں پیش خدمت ہیں جو سب کی سب ''مفہوم القرآن'' سے لی گئی ہیں۔

انفاق بمعنی بذل وصرف ......از قلم پرویز:

۱.....**وَمَا اَنۡفَقۡتُم مِنۡ نَفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِنۡ نَذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُهٗ**

(البقرہ: ۲۷۰)

''جو کچھ تم خرچ کرنے کی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہو یا جو کچھ تم (مالی امداد کے علاوہ، دیگر امور میں) اپنے اوپر واجب قرار دے لیتے ہو، تو ان میں سے ہر بات، خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں میں ہوتی ہے۔''

۲.....**اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً**..... **(البقرہ: ۲۷۴)**

''وہ لوگ، اپنا مال، دن رات، کھلے بندوں اور خاموشی سے اس مقصد کے لیے خرچ کرتے ہیں کہ......''

۳.....**اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ رِئَاءَ النَّاسِ** **(النساء: ۳۸)**

''بعض ایسے بھی ہیں جو اسے خرچ تو کرتے ہیں ......مگر محض لوگوں میں اپنی نمود ونمائش کے لیے۔''

۴.....**مَاذَا عَلَیۡهِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ.**

(النساء: ۳۹)

''اگر یہ لوگ، خدا کی متعین کردہ، مستقل اقدار کی صداقت، اور قانونِ مکافاتِ عمل پر، یقین رکھتے، اور دولت کو انہی مقاصد کے لیے صرف کرتے، تو......''

۵.....**اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَسَیُنۡفِقُوۡنَهَا** .....**(الانفال: ۳۶)**

''یہ لوگ، جو نظام خدا سے اس طرح انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہیں، اور اپنا مال، اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو خدا کی طرف آنے سے روکیں، سو

انہیں اپنی دولت خرچ کرنے دو۔''

۶.....لَو اَنۡفَقۡتَ مَافِی الۡاَرۡض جَمِیۡعًا مَّا اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِھِمۡ (الانفال:۶۳)

''تمہاری جماعت کے افراد کے دلوں میں باہمی محبت ڈال دی، یہ وہ گراں مایہ متاع ہے، جو دنیا بھر کی دولت خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔''

۷.....لَیۡسَ عَلَی الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَی الۡمَرۡضٰی وَلَا عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ حَرَج (التوبہ:۹۱)

''البتہ جو لوگ، کمزور یا بیمار ہیں، یا جن کے پاس، (سامان جنگ کے لیے) خرچ کرنے کو کچھ نہیں، ان کے لیے، پیچھے رہ جانے والوں میں کوئی حرج نہیں۔''

۸.....وَلَا یُنۡفِقُوۡنَ نَفَقَةً صَغِیۡرَةً وَلَا کَبِیۡرَةً ..... (التوبہ:۱۲۱)

''یہ لوگ، اس مقصد کے لیے، جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں، خواہ تھوڑا ہی ہو، یا بہت۔''

۹.....وَمِنَ الۡاَعۡرَابُ مَن یَّتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ مَغۡرَمًا ..... وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ من یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَایُنۡفِقُ قُرُبَاتٍ عِنۡدَاللّٰہِ (التوبہ:۹۸، ۹۹)

''ان (بدوؤں) میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو کچھ وہ نظام خداوندی کے لیے خرچ کرتے ہیں، اسے (جہالت کی بناء پر) اپنے اوپر جرمانہ سمجھتے ہیں ...... انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو سچے دل سے، اللہ اور آخرت پر یقین بھی رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اسے خدا کے ہاں، بلند درجات اور رسول کی طرف سے تحسین وآفرین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔''

۱۰.....وَاَنۡفَقُوا مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ سِرّاً وَّ عَلَانِیَةً (الرّعد:۲۳)

''اسے نوع انسانی کے لیے حسب ضرورت، خفیہ یا علانیہ صرف خرچ کرتے ہیں۔''

۱۱.....وَيُنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَا هُمْ سِرّاً وَّ عَلَانِيَةً (ابراهيم: ۳۱)

''حسب موقع وضرورت، علانیہ اور پوشیدہ، اس بلند مقصد کے لیے، خرچ کیے چلے جائیں۔''

۱۲.....فَهُوَ يُنفِقُ مِنْهُ سِرّاً وَّ جَهْراً (النحل: ۷۵)

''اور وہ اسے، اپنے اختیار و ارادہ سے، ظاہر اور پوشیدہ، ربوبیت عامہ کے لیے صرف کرتا ہے۔''

۱۳.....قُلْ لَّو اَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّى اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ (بنی اسرائیل: ۱۰۰)

''اگر تمہارے پاس خدا کی نعمتوں کے لامحدود خزانے بھی ہوتے، تو تم انہیں باندھ کر رکھتے کہ کہیں خرچ نہ ہو جائیں۔''☆

۱۴.....وَاٰتُوهُمْ مَا اَنْفَقُوا ..... وَاسْئَلُوا مَا اَنْفَقْتُمْ (اَلْمُمْتَحِنَة: ۱۰)

''ان لوگوں نے، جو کچھ، ان عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے سلسلہ میں خرچ کیا ہو، وہ انہیں لوٹا دیا جائے .... جو کچھ تم نے، ان عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے سلسلہ میں خرچ کیا تھا، اس کا مطالبہ کفار سے کرلو۔''

۱۵.....وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: ۶)

''اگر وہ حمل سے ہوں تو وضع حمل تک، تمہیں ان کا خرچ، بہر حال برداشت کرنا ہوگا۔''

☆ ''مفکر قرآن'' کو یہاں سوءِ فہم لاحق ہوا ہے، ''انفاق'' یہاں ''خرچ'' کے معنوں میں نہیں بلکہ ''فقر و افلاس'' کے لاحق ہونے کے معنوں میں مستعمل ہے اَنْفَقَ الرَّجُلُ : اِفْتَقَرَاى ذَهَبَ مَا عِنْدَهُ . آدمی نے ''انفاق'' کیا، یعنی وہ فقیر ہوا، اور جو کچھ اس کے ہاں تھا، وہ (اس کے ہاتھ سے) نکل گیا۔

المعجم مقاييس اللغة، جلد۵، صفحہ ۴۵۴ + لسان العرب، جلد۱۰، صفحہ ۳۵۵

یہ صرف پندرہ مثالیں ہیں، جن میں ''انفاق'' کا ترجمہ ''خرچ کرنا'' یا ''صرف کرنا'' خود اسی شخص کے قلم سے نکلا ہے، جو اس لفظ کی لغوی تحقیق کے بعد، یہ کہتا ہوا نہیں تھکتا کہ

''انفاق کے بنیادی معنیٰ ''خرچ کرنا'' نہیں بلکہ ''کھلا رکھنا'' ہیں ...... واضح رہے کہ انفاق کے معنیٰ ''خرچ کرنے'' کے نہیں ہیں۔'' [۱]

لغوی تحقیق کی آڑ میں ''مفکر قرآن'' صاحب، قرآنی الفاظ کے اصل مفہوم سے کس طرح پیچھا چھڑایا کرتے تھے، یہ سب کچھ، کسی حد تک ''انفاق'' کی اس لغوی تحقیق کی بحث سے واضح ہے، پوری لغات القرآن، ان کی ذہنی چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی کا کرشمہ ہے جس میں، انہوں نے قرآنی مفردات کے معانی و مفاہیم میں کھینچ تان، کتر بیونت اور مسخ و تحریف سے خوب کام لیا ہے، ہر صاحب علم، جسکی نظر، اگر جملہ کتبِ لغاتِ عربیہ پر نہیں، تو کم از کم، ان سب کتبِ لغات پر ضرور وسیع ہے، جن کو سامنے رکھ کر، پرویز صاحب نے، اپنی لغات القرآن کو مرتّب اور مدوّن کرنے کا دعویٰ کیا ہے، یہ جانتا ہے کہ موصوف نے اصل معانی و مفاہیم سے، کہاں، کس طرح اور کن ''ذہنی تحفظات'' کے تحت، انحراف کیا ہے، قرآن کریم کے عربی الفاظ میں، تہذیبِ فرنگ کے مفہوم کو بالعموم اور اشتراکیت کے نظام کو بالخصوص، داخل کرتے ہوئے، نئی نرالی لغت مرتب کرنا، ایک ایسی گھناؤنی سازش ہے، جس کے سامنے، وہ دسائس، کسی شمار و قطار میں نہیں، جنہیں ''مفکر قرآن'' عجمی سازشوں کا نام دے کر، زندگی بھر، علماءِ سلف کو بالعموم اور محدثین کرام کو بالخصوص برا بھلا کہتے رہے ہیں۔



---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶

باب ششم

زکوٰۃ اور قرآن مجید

زکوٰۃ سے کیا مراد ہے؟ یہ وہ مخصوص مقدار مال ہے، جو اسلامی مملکت، مسلم اغنیاء سے وصول کرتی ہے اور اسے امت مسلمہ کے اہل حاجت کی طرف لوٹا دیتی ہے تاکہ ان کی ضروریات بھی پوری ہوں، اور وہ بھی معاشی خوشحالی کی طرف گامزن ہوسکیں، چودہ صدیوں پر مشتمل اسلامی ادب، زکوٰۃ کا یہی مفہوم، تواتر اور تسلسل کے ساتھ پیش کرتا رہا ہے، چونکہ زکوٰۃ کا یہ مفہوم، بجائے خود، فاضلہ دولت کی شخصی ملکیت کا بیّن ثبوت ہے، اس لیے ''مفکر قرآن'' کو، اصطلاحِ ''زکوٰۃ'' سے یہ مفہوم خارج کرنے کے لیے، اور اس کی جگہ، نیا مفہوم داخل کرنے کے لیے خاصی کوہ کنی کرنی پڑی ہے، نئے دور میں ''زکوٰۃ'' کا ماڈرن مفہوم، اب کمیونزم اور مارکسزم سے ہم آہنگ ہو کر رہ گیا ہے، چنانچہ ''مفکر قرآن'' فرماتے ہیں۔

> ''قرآن کے پیش کردہ معاشی نظام کی رو سے مملکت کی ساری آمدنی ''زکوٰۃ'' ہے کیونکہ اسے نوع انسانی کی نشو ونما کے لیے صرف کیا جاتا ہے، (ایتاءِ زکوٰۃ کے معنی نشو ونما دینا ہوتا ہے)، جسے آج کل زکوٰۃ کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔'' [1]

اس اقتباس میں، ہمارے ''مفکر قرآن'' نے جسے قرآن کریم کا پیش کردہ معاشی نظام کہا ہے، وہ دراصل قرآن کریم کا معاشی نظام ہے ہی نہیں، بلکہ وہ، قرآن کی طرف منسوب کردہ، اُن کا اپنا طبع زاد نظام ہے، جو کمیونزم اور مارکسزم ہی سے ماخوذ ہے، وہ مزید فرماتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۸ (برحاشیہ)

''مملکت میں تمام کا سب افراد، ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کیے جائیں گے اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق پوری تندہی سے انجام دیں گے، اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر فاضلہ، اس نظام کی سنٹرل اتھاریٹی (مرکز ملت) کی تحویل میں دے دیں گے تاکہ وہ اس سے، ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کا انتظام بھی کرے جو اپنی ضروریات خود پوری کرنے کے قابل نہ ہوں، اس کے علاوہ، وہ مملکت، افراد معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے جس سے وہ اس قابل ہو جائیں، کہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکیں، اس اعتبار سے آپ، آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی حکومت کی جملہ آمدنی (Revenue) کو کہا جائے گا اور اسے اس لیے زکوٰۃ کہا جائے گا کہ اس آمدنی کا مقصد، افراد معاشرہ کی نشوونما ہوگا۔'' [1]

ماڈرن مفہوم زکوٰۃ اور لغوی انحرافات:

اس ماڈرن مفہوم کی رو سے، اب زکوٰۃ، وہ مخصوص مقدارِ مال نہ رہی، جو ایک مسلمان فرمانِ خداوندی کے مطابق، اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر، اپنے عفو المال میں سے نکال کر، نظم اجتماعی کے حوالے کرتا ہے بلکہ اب وہ سارے کا سارا عفو المال ''زکوٰۃ'' قرار پا گیا جو افراد کی شخصی ملکیت میں رہنے کی بجائے، مملکت کی تحویل میں رہے گا، قرآنی ''زکوٰۃ'' میں یہ مفہوم گھسیڑنے کے لیے، عربی لغات کو کھنگالا گیا، اور بہت سے صُغروں کُبروں کو ملا کر، زکوٰۃ کا یہ مفہوم ایجاد کر ڈالا گیا۔

زَكَا الْمَالُ وَالزَّرْعُ يَزْكُوا زُكُوًّا وَازْكٰى.....

''جانوروں کا اور کھیتی کا پھلنا پھولنا، بڑھنا، نشوونما پانا۔''

اَزْكَى اللّٰهُ الْمَالَ وَزَكَّاهُ.

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۲، صفحہ ۲۰۷ تا ۲۰۸

''خدانے مال کونشو ونما دی اور بڑھایا۔''

زَکَا الرَّجُلُ یَزْکُو.

''آدمی، آسودہ اورخوش حال ہو گیا، اس کی صلاحیتوں میں نشو ونما آ گئی، اس کی زندگی سرسبز وشاداب ہوگئی۔''

''لہٰذا زَکَا کے بنیادی معنٰی نشو ونما پانا، بڑھنا، پھلنا، پھولنا ہیں۔ راغب نے یہ معنٰی لکھ کر اس کی مثال میں قرآن مجید کی یہ آیت، درج کی ہے **فَلْیَنْظُرْ اَیُّھَا اَزْکٰی طَعَاماً** (۱۹/۱۸)'' دیکھو کہ کونسا کھانا حلال اور خوش انجام ہے'' یعنی جس میں نشو ونما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے، جو زیادہ (Nutritious) ہے۔''[۱]

''مفکر قرآن'' کی اس لغوی تحقیق میں کم از کم تین پہلوؤں سے انحراف بالکل واضح ہے۔

اولاً ...... لفظ ''زکوٰۃ'' کے بنیادی معنوں میں، جس طرح، ''افزائش ونشو ونما'' کا مفہوم پایا جاتا ہے، بالکل اُسی طرح ''طہارت وصلاح'' کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے، لیکن چونکہ ہمارے ''مفکر قرآن'' کو، یہ دوسرا مفہوم قابل قبول نہیں تھا، اس لیے انہوں نے، اُسے پایۂ ثقاہت سے گرا دینے کے لیے، اس مفہوم کی ایسی کمزور اور لا یعنی بلکہ شاید من گھڑت توجیہ پیش کی کہ ایک اوسط درجے کا قاری بھی، اسے تسلیم نہ کر پائے، اور یہی ان کا مطمح نظر تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں، کہ:

''زکوٰۃ کے معنٰی ہیں نشو ونما پانا، بڑھنا، پھلنا پھولنا، بالیدگی۔ اس کے معنٰی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں غالباً اس لیے کہ درختوں کی نشو ونما کے لیے ان کی شاخ تراشی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ اس کے بنیادی معنٰی نہیں ہیں۔''[۲]

---

[۱] + [۲] لغات القرآن، صفحہ ۸۰۸

نمعلوم، ''مفکر قرآن'' کو کس طرح کلیجہ تھام کر، یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ...... ''زکوٰۃ کے معنٰی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں''......لیکن اس کے ساتھ ہی، یہ بے بنیاد دعویٰ بھی کر ڈالا کہ...... ''یہ اس کے بنیادی معنٰی نہیں ہیں''......اور پھر اس کی توجیہ میں، ایسی بیکار سخن سازی کی ہے کہ ''درختوں کی نشوونما'' کے پیشِ نظر، ان کی ''شاخ تراشی'' کے عمل میں، اور ''پاکیزگی'' میں کوئی معنوی ربط سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔

ثانیاً...... علاوہ ازیں، زکوٰۃ کے مفہوم کے تعیّن میں، ایک اور چیز کو بھی، ہمارے ''مفکر قرآن'' نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اور وہ یہ کہ مال، کھیتی وغیرہ (جن کی مثالیں دے کر، انہوں نے، زکوٰۃ بمعنی ''بالیدگی ونشوونما'' کو اجاگر کیا ہے) بے جان اشیاء ہیں، کجا یہ کہ یکے از جاندار مخلوق ہونے کے باعث، اپنا اخلاقی و اعتقادی وجود رکھتی ہوں، جب کہ انسان، اول و آخر، ایک اخلاقی و اعتقادی تشخّص کا حامل ہے، اس لیے جب زکوٰۃ کے مادہ سے کوئی مشتقّہ فعل، مال یا کھیتی کے لیے آئے، تو وہاں اس کے معنٰی یقیناً ''نشوونما، بالیدگی اور پھلنا پھولنا'' ہی ہوں گے، کیونکہ ان چیزوں میں اخلاقی طور پر ''خیر وصلاح'' اور اعتقادی لحاظ سے، ''طہارت و پاکیزگی'' کا مفہوم ہو ہی نہیں سکتا لیکن جب انسان کے متعلق کہا جائے، زَكَا الرَّجُلُ تو اس کا معنٰی ''صلاح وطہارت'' ہی کی نسبت سے کیا جائے گا (نہ کہ طبیعی نشونما اور ''جسمانی بالیدگی'' کی نسبت سے) کیونکہ ایک اخلاقی و اعتقادی وجود میں، جو ''افزائش اور بالیدگی ونمو'' پایا جائے گا، اس کا تعلق بھی، اس کی ''طہارت و پاکیزگی ''اور ''صلاح و خیر'' ہی سے ہوگا (نہ کہ ''طبیعی افزائش'' اور ''جسمانی بالیدگی'' سے جو صرف، غیر اخلاقی اور غیر اعتقادی وجود ہی میں متحقّق ہوتا ہے) یہی وجہ ہے کہ کتب لغات میں بے جان اشیاء یا غیر انسانی مخلوق کے لیے، زَكَا يَزْكُو کے مفہوم میں، غالب معنٰی افزائش ونمو کا ہوتا ہے، نہ کہ طہارت وصلاح کا، جبکہ انسان کے لیے استعمال ہونے کی صورت میں، اس فعل کے مفہوم میں ''طہارت وصلاح'' کا مفہوم ہی غالب ہوگا (نہ کہ ''طبیعی افزائش'' یا ''جسمانی بالیدگی'' کا مفہوم)۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ''مفکر قرآن''

نے ، اپنی لغوی تحقیق میں، یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

ثالثاً ...... ''مفکرِ قرآن'' نے اپنی لغوی تحقیق کے دوران ، یہ فرمایا ہے کہ...... ''لٰہذا زکوٰۃ کے بنیادی معنٰی نشو و نما پانا، بڑھنا، پھلنا، پھولنا ہیں، راغب نے یہ معنٰی لکھ کر، اس کی مثال میں قرآن مجید کی یہ آیت درج کی ہے: فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا (۱۸/۱۹)''

...... یہ قطعی غلط ہے۔ امام راغب نے قولُهٗ : اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا سے پہلے قومہ (،) نہیں، بلکہ خاتمۂ جملہ کی علامت، جسے انگریزی میں (Ful-stop) کہتے ہیں (یعنی نقطہ کی علامت) لگا کر، نئے سرے سے اس جملے کا آغاز کیا ہے، جو اپنے مابعد والے جملہ سے متعلق ہے نہ کہ ماقبل والے فقرہ سے، امام راغب کی پوری عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

زكا : اَصل الزكواة النموُا لحاصل عن بركة الله تعالٰى ، ويعتبرذالك بالامور الدنيويّة والاخروية، يقال زكا الزَّرْعُ يَزْكُو اذا حَصَل منه نموٌّ وبركة. وقولهٗ: (اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَاماً) اشارة الى مايكون حلالاً لا يُستوخَمُ عقباه ومنه الزكاة لما يخرجُ الانسان من حق الله تعالٰى اِلىَ الفقراء وتسميتهٗ بذالك لما يكون فيها من رجَاء البركة او لتزكية النفس [۱]

''ز۔ک۔حرف علت، زکاۃ کی اصل، وہ افزائش ہے جو اللہ کی برکت سے حاصل ہو، اور اسکا اعتبار دنیاوی اور اخروی دونوں قسم کے امور میں کیا جاتا ہے، جب کھیتی میں نمو اور برکت حاصل ہو تو کہا جاتا ہے کہ زَكَا الزَّرْعُ يَزْكُو۔ اور اللہ کا یہ فرمان اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَاماً ''کونسا کھانا پاکیزہ ہے'' ایک اشارہ ہے، اس چیز کی طرف، جو حلال ہو، اور جسکے کھانے سے انجام، مضر اور ناموافق نہ ہو جائے ، اور اسی سے وہ ''زکاۃ'' ہے، جو انسان، (اپنے مال میں سے) بطورِ حقِ باری تعالٰی، نکال کر فقراء (وغیرہ) کو دیتا ہے، اور اس کا یہ نام ''زکوٰۃ'' اس

---

[۱] المفردات للراغب، صفحہ ۲۱۳

لیے ہے کہ اس میں، امید برکت اور تزکیۂ نفس پایا جاتا ہے۔''

علاوہ ازیں، لفظ زکوٰۃ کی وضاحت میں، امام راغب کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ...... ''اسی سے زکوٰۃ ہے، جو انسان اپنے مال سے بطورِ حق اللہ نکالتا ہے، اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس سے یا تو مال میں برکت ہوتی ہے یا نفسِ انسانی میں طہارت و پاکیزگی پیدا ہوتی ہے''...... یہ عبارت، چونکہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے لیے مفیدِ مطلب نہ تھی، اس لیے اسے نظر انداز کر دیا، کیونکہ انہیں زندگی بھر مفید مطلب (نہ کہ مفیدِ حق و صدق) اشیاء ہی کی تلاش و جستجو رہی، جہاں، انہیں رائی کے برابر بھی، ایسی کوئی چیز مل گئی، اسے پہاڑ بنا کر پیش کر دیا، تاہم جہاں، انہیں ایسی کوئی چیز نہ ملتی تھی، تو وہ گھبرایا نہیں کرتے تھے، بلکہ رائی کے بغیر ہی پہاڑ بنا ڈالا کرتے تھے، لیکن جہاں کوئی چیز، پہاڑ کے برابر، خلافِ مطلب نظر آئی، وہاں ''حیاء'' سے اپنی آنکھیں بند کر لیں (جیسا کہ یہاں کیا گیا ہے)۔ یہ تھا، ''مفکرِ قرآن'' کی ''قرآنی تحقیق کا انداز'' جس پر، وہ عمر بھر قائم رہے۔

ایک بے بنیاد دعویٰ:

رہا ان کا یہ فرمان کہ...... ''طہارت و پاکیزگی کا معنٰی زکوٰۃ کے بنیادی مفہوم میں شامل نہیں ہے''...... تو یہ ایک قطعی غلط بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''نشوونما و بالیدگی'' اور ''صلاح وطہارت'' دونوں ہی اس لفظ کے بنیادی مفہوم میں شامل ہیں۔ دیگر لغات کو تو چھوڑیئے ایک طرف، جن کتبِ لغات کی مدد سے ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے ''لغات القرآن'' کو مرتب کیا ہے، ان میں معجم مقابیس اللغۃ بھی شامل ہے جس میں، یہ عبارت موجود ہے۔

(زکی) اَلزَّاء والکاف وَالْحَرْفُ الْمُعْتَلُّ اَصْلٌ یَدُلُّ علٰی نَمَاءٍ وَّ زِیَادَۃٍ وَیُقَالُ الطَّھَارَۃُ زَکَاۃُ الْمَالِ ۔ قَالَ بَعْضُھُم سمیت بذالك لانها مما یرجیٰ به زکَاءُ الْمَالِ وَھُوَ زِیَادَتُہٗ وَنَمَا ئُہٗ وَقَالَ بَعْضُھُمْ سمیت زکاۃً لِاَنَّھَا طَھَارَۃٌ قالوا وحجة ذالك قوله جلَّ ثناء ہٗ . خُذمِنْ اَمْوَالھم صَدَقَۃً تطھّرھم و تزکیھم بھا والاصل فی ذالك

راجع الی هٰذَیْنِ المَعْنَیَیْنِ وَهُمَا النَمَآءُ و الطهارةُ [1]

زکوٰۃ۔زاء، کاف اور حرفِ علت، اس کا مادہ ہے جو نماء اور افزائش پر دلالت کرتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا کہ طہارت بھی زکوٰۃِ مال ہے، بعض علماء لغت کے نزدیک، زکوٰۃ کو زکوٰۃ کا نام، اس لیے دیا گیا کہ اس فعل سے ''افزائشِ مال اور نماءِ زر'' کی امید کی جاتی ہے، جبکہ دیگر علماء کے نزدیک، طہارت و پاکیزگی کے پیشِ نظر، اسے زکاۃ کا نام دیا گیا ہے، ان کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے کہ خُذمِنْ اَمْوَالهم صَدَقَةً تطهّرهم و تزكيهم بها (التوبہ:۱۰۳) ''ان کے اموال میں سے صدقہ لیکر انہیں پاک کر دیں اور نیکی کی راہ میں ان کی نشوونما کرتے رہیں۔'' حقیقت یہ ہے کہ اس مادے میں ''بالیدگی اور افزائش'' اور ''طہارت و صلاح'' کے دونوں ہی مفہوم پائے جاتے ہیں۔''

اس کے بعد، ابنِ منظور کی لسان العرب کی یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمایئے، یاد رہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے لغات القرآن کی تالیف و ترتیب میں، لسان العرب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ علامہ ابن منظور بھی زکوٰۃ کے معانی میں ''نشوونما'' کے علاوہ ''طہارت و صلاح'' کا معنیٰ بیان کرتے ہیں۔

اَلزَّكَاةُ : اَلِاصْلَاحُ ..... زَكَّاهُ اللهُ وَزَكَّا نَفْسَهُ تَزْكِيَةً : مَدَحَ ..... وَزَكّٰى الرَّجُلُ نَفْسَهُ اِذَا وَصَفَهَا وَاَثْنٰى عَلَيْهَا [2]

''الزکوٰۃ، صلاح ہے...... زَكَّاهُ اللهُ وَزَكَّا نَفْسَهُ تَزْكِيَةً کا معنیٰ ہے کہ اللہ نے اس کی اصلاح کی اور اُس کے نفس کو سنوارا، یا اس کی تعریف کی ...... وَزَكّٰى الرَّجُلُ نَفْسَهُ کا معنیٰ ہے کہ...... ''آدمی نے اپنے آپ کی تعریف کی ، یا اپنی اصلاح کی۔''

---

[1] معجم مقاییس اللغة لا بن فارس ، جلد۳، صفحہ۱۷

[2] لسان العرب، جلد۱۴، صفحہ۳۵۸

وَقَالَ تعالیٰ : خَیْراً مِنْهُ زَکوٰةً ای خَیْراً مِنْهُ عَمَلاً صَالِحاً وقال الفرّاء زکٰوةً صَلَاحًا وَکذالك قوله عَزَّوَجَلَّ : حَنَانًا مِنْ لَّدُنَّا وَزکوٰةً قَالَ صَلَاحًا قال ابوزید النحویُّ فِی قولِهٖ عَزَّوَجَلَّ : وَلَوْلَا فضل الله علیکم ورحمته مَازَکَامِنکم من اَحدٍ ابداً وَّ قُرِیَ مَازَکّٰی منکم فَمَنْ قَرَءَ مَازَکٰی فمعناه مَاصَلُحَ مِنکم وَمَنْ قَرَءَ مَازَکّٰی فَمَعْنَاهُ مَااَصْلَحَ وَلکن الله یزکّی من یشاء ای یُصلِحُ [1]

ارشادِ خداوندی خیرا منه زکوٰة کا معنی ہے کہ ''عمل صالح کے اعتبار سے بہتر'' اور فَرَّاء نے کہا ہے کہ ''زکوٰۃ، صلاح ہے'' اسی طرح، فرمانِ ایزدی ہے حَنَانًا مِنْ لَّدُنَّا وَزکوٰةً یعنی ''ہماری طرف سے نرم دل اور صاحب صلاح۔'' ابوزید نحوی نے اس فرمان باری تعالیٰ کے متعلق کہا ہے کہ وَلَوْلَا فضل الله علیکم ورحمته مَازَکَامِنکم من اَحدٍ ولکن اللهَ یُزَکِّی من یشاء میں بعض لوگوں نے مَا زَ کا پڑھا، تو معنی یہ ہوا کہ ''تم میں سے وہ صاحبِ صلاح نہ ہوا'' اور جس نے مَازَکّٰی پڑھا تو معنی یہ ہوا کہ...... ''بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے، اس کا تزکیہ کرتا ہے''، یعنی ''اصلاح کرتا ہے۔''

چونکہ عام لوگوں کو، الفاظ کی لغوی تحقیق سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، اس لیے، ہم انہی دو کتب کے حوالوں پر اکتفاء کرتے ہیں ورنہ کوئی کتاب لغت ایسی نہیں ہے جس میں ''زکوٰۃ'' کے مفہوم میں ''نشوونما'' کے علاوہ ''طہارت وصلاح'' کے معنی کو بنیادی معانی میں شامل نہ کیا گیا ہو۔

لفظ زکوٰۃ اور جدید وقدیم مفاہیم پرویز:

اس کے بعد، اب یہ ملاحظہ فرمایئے کہ پرویز صاحب پر جوں جوں اشتراکیت کا رنگ گہرا اور تیز ہوتا چلا گیا، وہ الفاظ کے قالب میں سے کس طرح، سابقہ مفہوم کو خارج کر کے، ان میں بالکل نئے نرالے اور خودساختہ معانی ومفاہیم داخل کرتے چلے گئے، مثال کے طور

---

[1] لسان العرب، جلد۱۴، صفحہ ۳۵۸

پر، اسی لفظ زکوٰۃ اور اس کے قرآنی مشتقات کے سابقہ اور جدید مفاہیم پر ایک نظر ڈال لیجیے، سب کچھ واضح ہو جائے گا:

۱.....فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَاماً (سورۃ الکھف:۱۹)

(قدیم ترجمۂ پرویز) ''جا کر دیکھے کس کے ہاں اچھا کھانا ملتا ہے''

(معارف القرآن، جلد۳، صفحہ۵۹۶سال اشاعت، جولائی ۱۹۳۵ء)

(جدید مفہومِ پرویز) ''(ایسا کھانا) جو زیادہ (Nutritious) ہے''

(لغات القرآن، صفحہ۸۰۸سال اشاعت، اکتوبر۱۹۶۰ء)

''مفکر قرآن'' کے ماڈرنزم کی انتہا ہے کہ اَزْكٰى طَعَاماً کا ترجمہ و مفہوم ''(ایسا کھانا) جو زیادہ (Nutritious) ہے''، کیا ہے جو اس تصور پر مبنی ہے کہ دورِ نزولِ قرآن سے بھی بہت پہلے، اصحابِ کہف کے زمانہ میں، گویا، جگہ جگہ غذائی تجزیہ (Food Analysis) کی معملات (Laboratories) موجود تھیں، اور کھانا لانے والے پر لازم تھا کہ وہ ایسا کھانا لائے، جو غذائیت سے بھرپور ہو، اور جس میں لحمیات (Protiens)، حیاتین (Vitamins)، نشاستہ (Starch or Carbohydrates)، نمکیات (Minerals)، اور روغنیات (Oils & Fats) وغیرہ کی نہایت متوازن مقدار موجود ہو۔

۲.....اَقَتَلْتَ نَفْساً زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ (الکھف: آیت ۷۴)

(قدیم ترجمہ پرویز) ''آپ نے ایک بیگناہ کی جان لے لی حالانکہ اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی'' (معارف القرآن، جلد۳، صفحہ۳۸۱، جولائی ۱۹۳۵ء)

(جدید مفہومِ پرویز) ''آپ نے کیا کیا؟ ایک پلے پلو سے لڑکے کو یوں ہی قتل کر دیا۔'' (مفہوم القرآن، ج۲، ص۶۷۵)

شاید بوقتِ قتل، صاحبِ موسیٰؑ کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور انہیں نظر نہ آیا، کہ وہ ایک ''پلے پلو سے'' لڑکے کو قتل کر رہے ہیں، ورنہ وہ شاید، اس ''ہٹے کٹے لڑکے کی بجائے، کسی ایسے لڑکے کو اپنی مشق آزمائی کے لیے چنتے، جو ''پلا پلوسا'' نہ ہوتا۔

۳.....لِاَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (سورہ مریم :۱۹)

(قدیم ترجمۂ پرویز) ''......کہ تجھے ایک پاک فرزند دے دوں............''

(معارف القرآن، جلد۳، صفحہ۴۹، سال اشاعتِ کتاب، جولائی ۱۹۳۵ء)

(جدید مفہومِ پرویز) ''وہ تجھے ایک عمدہ نشوونمایافتہ بچہ عطا کرے گا۔''

(مفہوم القرآن، ج۲، صفحہ۶۸۹)

....

۴.....وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ (سورة المؤمنون: ۴)

(قدیم ترجمۂ پرویز) ''جو زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں''

(معارف القرآن، جلد۴، صفحہ۲،۴۵۵ نومبر۱۹۴۹ء:۱۲ محرم۱۳۶۹ھ)

(جدید مفہومِ پرویز) ''وہ اسی پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوع انسانی کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا ہے۔'' (مفہوم القرآن، ص۷۷۳)

....

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لفظ زکوٰۃ سے ''طہارت و پاکیزگی، صلاح و خیر، اور توصیف و اِثناء کے اُن حقیقی مفاہیم سے، محض اپنے جدید مفاہیم کی خاطر، کس طرح گریز کیا گیا ہے، جو سابقہ تراجم میں مسلّم چلے آ رہے تھے، نیز یہ بھی کہ ماڈرن مفاہیم میں تجدد پسندی کی اس روش کے باعث، کسقدر تکلف کیا گیا ہے، اور جو معانی، قرآنی مفردات میں سے نچوڑے گئے ہیں، وہ اصل سے کس قدر بُعد رکھتے ہیں، اور پھر دعویٰ یہ ہے کہ یہ معانی، دورِ نزولِ قرآن کے محاورۂ عرب کے عین مطابق ہیں اور ''مفکر قرآن'' نے بڑی جانگسل مشقتوں کے ساتھ، یہ معانی دریافت کیے ہیں۔

زکوٰۃ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم:

علاوہ ازیں، یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے، کہ ''زکوٰۃ'' یا ''الزکوٰۃ'' قرآن پاک کی مخصوص اصطلاح ہے، اس کا یکے از اصطلاحاتِ قرآن ہونا، خود ہمارے ''مفکر قرآن'' کو بھی مسلّم تھا، انہوں نے ایک مقام پر یہ لکھا کہ:

''قرآن کریم نے ...... الزَّکوٰۃ کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔'' [1]

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۲، صفحہ۲۰۲

اب یہ بات، اہل علم تو درکنار، معمولی سمجھ بوجھ والا آدمی بھی جانتا ہے، کہ الفاظ کے اصطلاحی اور لغوی مفہوم میں بڑا فرق و تفاوت ہوا کرتا ہے، جب کوئی لفظ، ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر، مستعمل ہوتا ہے، تو اس میں لغوی مفہوم سے انتہائی بُعد، بلکہ مغایرت تک پیدا ہو جاتی ہے، اس بناء پر، اس اصطلاح کا مفہوم، اس نظام، نظریئے، فن یا شخصیت کے حوالے سے متعیّن کیا جائے گا، جس کے ہاتھوں وہ اصطلاح اختیار کی گئی ہے، یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا خود، پرویز صاحب کو بھی اقرار و اعتراف تھا، چنانچہ انہوں نے خود ایک مقام پر یہ لکھا ہے کہ:

''جب کوئی لفظ، اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے، تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے، اس کے بعد آپ جب بھی اس لفظ کا استعمال کریں گے وہ اپنے ان تمام مضمرات ولزومات کو، اپنے ساتھ لائے گا جن سے وہ نظریہ یا نظام عبارت ہے جس کے لیے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔'' [۱]

اب اس کے بعد، ''مفکر قرآن'' کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیے، کہ وہ ''الزکوٰۃ'' کو قرآنی اصطلاح بھی مانتے ہیں، پھر یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ..... ''جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں، مستعمل ہونے لگ جائے، تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے'' ..... پھر وہ، اس قرآنی اصطلاح ..... زکوٰۃ ..... کے مفہوم کے تعیّن کے لیے، کتب لغات کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس ورق گردانی کے نتیجہ میں، کہیں کی اینٹ، اور کہیں کا روڑا لیکر، وہ نئے معانی کا کنبہ جوڑتے ہیں، ہمارے نزدیک، یہ ساری کاروائی، جس میں قرآنی اصطلاحات کا مفہوم ازروئے کتبِ لغات، متعیّن کرنے کی کوشش، پرویز صاحب عمر بھر کرتے رہے ہیں، یہ سب کچھ اگر فریب دہی نہیں تو فریب خوردگی ضرور ہے۔

بہرحال، زکوٰۃ، ایک قرآنی اصطلاح ہے، شارع نے نظام اسلام سے اسے وابستہ کرتے ہوئے، جو معنیٰ و مفہوم، اس میں ودیعت کیا ہے، اور معاشیاتِ اسلام سے وابستگی کی بناء پر، جو لزومات و مضمرات، اس میں سموئے ہوئے ہیں، ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، کتب لغات کی بنیاد پر کھینچ تان کر کے، مارکسزم کی فکری و ذہنی غلامی کے زیر اثر، نئے معانی

---

[۱] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۴۴

داخل کرنا، سخت بیجا حرکت ہے، پرویز صاحب کی عمر بھر کی ''قرآنی خدمات'' کا ماحصل یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی ایک ایک اصطلاح کو لیکر، اشتراکی تہذیب کی فکری اسیری میں مبتلا ہو کر، کتب لغات کے نام پر، ان میں نئے معانی داخل کیے ہیں۔

زکوٰۃ لغوی اور اصطلاحی مفہوم کا مجمع البحرین:

اگرچہ زکوٰۃ کے لغوی مفہوم میں ''بالیدگی ونشوونما'' اور ''طہارت وصلاح'' دونوں داخل ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر، خود شارع نے زکوٰۃ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ مال و دولت میں سے وہ مخصوص مقدار ہے جو ملت اسلامیہ کے صاحب ثروت افراد سے وصول کر کے، امت کے مفلس اور حاجتمند افراد کو لوٹائی جاتی ہے، شارع نے مختلف النوع اموال کے لیے جداگانہ نصاب مقرر فرمائے ہیں، زکوٰۃ کے عملی پروگرام میں، حصہ لیتے ہوئے، خود افراد امت کے ہاں، اس کا لغوی مفہوم بھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ زکوٰۃ، اس لیے دیتے ہیں کہ ان کے مال میں بالیدگی ونشوونما، اور ان کے نفوس میں طہارت وصلاح پیدا ہو، اُن کے قلب و ذہن، بخل، زر پرستی اور حُبّ مال اور فریفتگیٔ دنیا جیسی صفاتِ رذیلہ سے پاکیزگی وطہارت پالیں، اور ایثار وقربانی، ہمدردی وغمگساری، فیاضی وسخاوت، رحمدلی اور انسان پروری کی صفاتِ حسنہ کی ان میں افزائش ونشوونما ہو، دوسری طرف، نظامِ زکوٰۃ کی بناء پر، اہل حاجت اور نادار طبقوں کو، جو امداد بصورت مال یا بصورتِ جنس (Help in cash or kind) اہل ثروت کی طرف سے ملتی ہے، اسے پا کر، ان افراد کے قلوب ونفوس، مالدار طبقے کے خلاف، حسد، کڑھن، جلن اور احساس کہتری جیسی صفاتِ رذیلہ سے پاک ہو جاتے ہیں، اور ان کے قلوب و اذہان میں بھی، اہل ثروت کے ساتھ، خیر خواہی، خیر سگالی، اور باہمی احترام و اکرام کے جذبات کو افزائش اور بالیدگی میسّر آتی ہے، اس طرح مجموعی طور پر پورے معاشرے میں، مالی اعتبار سے قوی اور کمزور طبقوں میں، باہمی تعاون واشتراکِ عمل کی فضا پھلتی پھولتی اور افزائش پذیر ہوتی ہے، اس طرح معاشرہ، طبقاتی کشمکش کے مفسدات سے دن بدن، نظام زکوٰۃ کی بدولت پاک ہوتا رہتا ہے، پس جب یہاں حال یہ ہے کہ زکوٰۃ

کے اصطلاحی مفہوم پر، عمل پیرا ہونے میں لغوی مفہوم بھی، اس سے منفک نہیں ہوتا تو آخر اس بات کی کیا ضرورت پڑی ہے کہ زکوٰۃ کے لفظ سے، اس اصطلاحی مفہوم کو نکال باہر کیا جائے جو شارع نے خود اس میں داخل کیا ہے، اور اشتراکیت کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوتے ہوئے، حکومت کی جملہ آمدنی (Revenue) کا مفہوم، خواہ مخواہ، اس میں گھسیڑا جائے، لیکن ہمارے ہاں کے غلام فطرت ''مفکر قرآن'' صاحب کی ''قرآنی فکر'' کی معراج ہی یہ ہے کہ وہ قرآنی اصطلاحات کو، اصل معانی سے (جو شارع نے انہیں دے رکھے ہیں) مجرّد کر کے، لغت کی کتب کی بنیاد پر، مختلف صغرے اور کبرے ملا کر، ان میں نئے خود ساختہ معانی داخل کیے جائیں، پرویز صاحب نے زکوٰۃ کی قرآنی اصطلاح کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے، اور خود شارع کے مقرر کردہ مفہوم کو ''مروجہ مفہوم'' کہہ کر مذاق اڑاتے رہے ہیں۔

زکوٰۃ کا مفہوم اصلی اور ''مفکر قرآن'':

حالانکہ کل تک وہ خود، اسی شرعی اور مصطلحہ مفہوم کو مانتے رہے ہیں، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

> ''نبی اکرمؐ نے (اور حضورؐ کے اتباع میں خلفائے راشدین نے) جن یہود ونصاریٰ وغیرہ سے صلح کی تو ان کے معاہدات میں جزیہ کے مقاصد کی بھی تصریح فرمادی، ان معاہدات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زر جزیہ کے معاوضہ میں، ان لوگوں کو یہ حقوق حاصل تھے۔
>
> (۱) کوئی شخص، ان پر حملہ آور ہوگا تو ان کی مدافعت کی جائے گی، اس میں ان کی جان و مال، کاروانِ تجارت اور دیگر مملوکہ اشیاء سب شامل ہیں۔
>
> (۲) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا، ان کے معابد کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔
>
> (۳) جو حقوق انہیں اس سے پہلے حاصل تھے وہ زائل نہیں کیے جائیں گے۔
>
> (۴) ان سے عُشر وصول نہیں کیا جائے گا۔

کی؟ اس کے حتمی فیصلہ کے لیے، ہم، بوجوہ، تاریخ الامت کا حوالہ پیش کر رہے ہیں۔

اولاً ......اس لیے کہ اس کتاب کے مصنف ''اسلم جیراجپوری'' کو ''مفکر قرآن'' نے جا بجا اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔

ثانیاً ......اس لیے، کہ اس کتاب کو ادارہ طلوع اسلام ہی نے شائع کیا ہے۔

ثالثاً ......اس لیے کہ، اس کتاب کے متعلق یہ دعویٰ مذکور ہے کہ مصنف نے کتاب میں ''جو تحقیقی بات تھی، ثبت کر دی'' (صفحہ ۱۲)۔

لہٰذا، اس کتاب کا اقتباس، وابستگانِ طلوعِ اسلام کے لیے، اتمام حجت کا درجہ رکھتا ہے، اب ملاحظہ فرمائیے، کہ آیت (۹/۶۰) میں مذکور مصارف کو، اسلم جیراجپوری صاحب، مصارفِ زکوٰۃ قرار دیتے ہیں؟ یا مصارفِ صدقات؟

> ''زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے، ایک مصرف، خاص اس کے لیے مقرر فرمایا، یعنی زکوٰۃ کی آمدنی میں سے مال کا ایک حصہ اس غرض کے لیے مخصوص کرایا جائے کہ اس سے غلام آزاد کرائے جائیں۔'' [۱]
>
> ''زکوٰۃ، مدینہ میں فرض ہوئی، اس کے مصارف، سورہ توبہ میں بیان کر دیئے گئے۔'' [۲]

اب یہ ظاہر ہے کہ سورۃ التوبہ کی جس آیت میں مصارف زکوٰۃ کا حوالہ، اسلم جیراجپوری صاحب نے دیا ہے، وہ وہی آیت ہے، جس کے متعلق، پرویز صاحب نے، کچھ مدت، پیش از مرگ، یہ واویلا مچانا شروع کر دیا تھا کہ...... ''یہ صدقات کے مصارف ہیں، جنہیں ہمارے ہاں، غلطی سے زکوٰۃ کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے''......حالانکہ اس واویلا سے قبل، وہ ایک مدت تک، آیت (۹/۶۰) کے اندر مذکور مصارفِ زکوٰۃ کو، زکوٰۃ ہی کے مصارف قرار دیتے رہے ہیں، صدقات کا لفظ، زکوٰۃ کے معنوں میں، آیت (۹/۵۸) میں بھی آیا ہے، چنانچہ پرویز صاحب، یہاں بھی، صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی لیتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ الامت، جلد ا، صفحہ ۲۰۵ [۲] تاریخ الامت، جلد ا، صفحہ ۲۰۶

وَمِنْهُم مَنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّم يُعْطَوا مِنْهَا إِذا هُمْ يَسْخَطُونَ (٩/٥٨)

''اوران میں کچھ ایسے ہیں کہ مال زکوٰۃ بانٹنے میں تجھ پر عیب لگاتے ہیں (کہ تو لوگوں کی رعایت کرتا ہے) پھر حالت اُن کی یہ ہے کہ اگر انہیں، اس میں سے دیا جائے، تو خوش ہو جائیں، نہ دیا جائے تو اچانک بگڑ بیٹھیں!'' [1]

آیت (٩/٦٠) اور موقف پرویز کا جائزہ:

اب آیئے، آیت (٩/٦٠) کی طرف، جس کے متعلق، پرویز صاحب، یہ کہتے ہیں کہ اس میں مذکور مصارف، مصارفِ صدقات ہیں، نہ کہ مصارف زکوٰۃ۔

اَنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِى سَبِيْلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِنَ اللهِ وَاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (سورة التوبة:٦٠)

''یہ اموال صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو زکوٰۃ کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جنکی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کو چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں، اور مسافر نوازی کے لیے ہیں، یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ صاحب علم وحکمت ہے۔''

یہاں، یہ امر، غور طلب ہے کہ اگر اس آیت میں صدقات سے مراد ''ہنگامی حالات کے عطیّات'' ہوتے، تو ہنگامی حالات کے باعث، افراد معاشرہ کا فقر ومسکنت میں مبتلا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر لوگوں کی گردنوں کا بندِ غلامی میں پھنس جانا اور ان پر حالت سفر کا طاری ہونا (جس میں یہ عطیات انہیں دیئے جائیں گے) بالکل نا قابلِ فہم ہے، کیا لوگ ہنگامی حالات ہی میں سفر کیا کرتے ہیں کہ ان کو چندوں کی ضرورت پڑتی ہے؟ کیا عہد نبوی میں

---

[1] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۸۵

ہنگامی حالات ہی میں غلامی کا رواج تھا؟ کیا یہ ہنگامی حالات ہی کا تقاضا تھا کہ اہل کفروشرک کومحض تالیفِ قلب کے لیے، دیا جائے؟ کیا عام حالات میں غلامی رواج پذیر نہ تھی کہ ان کی گردنوں کو بندِ غلامی سے چھڑانے کے لیے ہنگامی چندوں کی ضرورت ہوتی؟ کیا عام حالات میں، مؤلفۃ القلوب کا وجود، معدوم ہوتا ہے؟ اور یہ لوگ صرف ہنگامی حالات ہی میں وجود پذیر ہوکر منصۂ شہود پر آتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ صدقات کا یہ مفہوم (کہ وہ ہنگامی چندوں اور عطیات کا نام ہے) قطعی خود ساختہ مفہوم ہے جسے طلوع اسلام کی لغت ساز ٹکسال میں ڈھالا گیا ہے، آیت (۹/۶۰) میں ''صدقات'' کا لفظ، مال زکوٰۃ ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ انہی صدقات کو، اسی آیت میں فَرِیضَةً مِنَ اللهِ کہا گیا ہے، اور یہ خدائی فریضہ بہرحال، زکوٰۃ ہی ہے۔ زکوٰۃ سے مراد، ''ضرورت سے زائد پوری دولت مکسوبہ نہیں ہے، جس میں سے بقدرِ ضرورت رکھ کر، باقی سب مال، بقولِ پرویز، ریاست کی تحویل میں چلا جاتا ہے، بلکہ یہ وہ مقدارِ مال ہے، جس کی ادائیگی کے بعد بھی، فرد کا سب کے پاس، مال و دولت بچ رہتی ہے، جس میں سے وہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی فراخدلی سے خرچ کرتا رہتا ہے، درج ذیل، آیات، اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔

زکوٰۃ کے بعد بھی حکم انفاق:

زکوٰۃ، تو بہرحال، رکن اسلام ہے، جسکی ادائیگی کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں، لیکن زکوٰۃ کے علاوہ، انفاق فی سبیل اللہ کا جو حکم مذکور فی القرآن ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ زکوٰۃ، حکومت کی کل آمدنی (Revenue) کو نہیں کہتے جیسا کہ پرویز صاحب کا خیال ہے، اگر ایسا ہوتا، تو پھر، ان کے پاس ہوتا ہی کیا، جو وہ انفاق فی سبیل اللہ کے حکم پر عمل کرتے؟ درج ذیل آیات، اس تصور پرویز کی تردید کرتی ہیں۔

(۱)..... وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللهَ قَرْضًا حَسَنًا

(المزمل: ۲۰)

''نماز قائم کرتے رہو، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور اللہ تعالیٰ کو قرض حسن بھی پیش کرتے رہو۔''

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔

اولاً ...... یہ کہ زکوٰۃ سے مراد پوری دولت نہیں ہے، جو بقولِ پرویز صاحب، افرادِ کاسبین کے ہاتھوں سے نکل کر، مملکت کی تحویل میں چلی جاتی ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو انسان کے پاس سرے سے کوئی فاضل مال باقی ہی نہ بچتا، کجا یہ کہ وہ قرض حسن بھی پیش کر ڈالتا، زکوٰۃ کے علاوہ، یہاں قرضِ حسن کا مطالبہ، اس امر کو مستلزم ہے کہ قرآن کے نزدیک، فرد کا سب، اپنے اموالِ مکسوبہ میں سے صرف اتنے ہی کا حقدار نہیں ہے جو اس کی ضروریات کی کفایت کر سکے بلکہ وہ اپنے پورے ماحصل کا مالک ہے، اور مالک ہی کی حیثیت سے پھر وہ انفاق فی سبیل اللہ کرتا ہے۔

ثانیاً ...... یہ کہ، زکوٰۃ، ایک ایسی مخصوص مقدارِ مال کا نام ہے جو عفو المال میں سے نکالی جاتی ہے اور اس مقدار کے نکل جانے کے بعد بھی، اس کی ملکیت میں، اس قدر عفو المال بچ رہتا ہے کہ قرآن کریم، اس میں سے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

خود پرویز صاحب نے ایک مقام پر، اس آیت کے ترجمے میں، اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

''اور نماز کے نظام کو قائم رکھو، زکوٰۃ دو، نیز (زکوٰۃ کے علاوہ بھی)، اللہ (کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے اگر ضرورت پڑے تو مرکز) کو قرض حسنہ بھی دیا کرو۔'' [1]

(۲)...... لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ

---

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۳۳۳

وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃ وَاٰتَی الزَّکٰوۃ

(البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے، یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی، اللہ کو، یوم آخر اور ملائکہ کو، اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال، رشتہ دار افراد، اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، سوال کرنے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔''

سورۃ المائدہ میں واقع، یہ آیت بھی، اسی حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے۔

(۳)..... لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِی وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللہَ قَرْضًا حَسَناً لَّاُ کَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَلَاُدْخِلَنَّکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھَارُ (اَلْمَآئِدَۃ:۱۲)

''اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔''

ان آیات میں، زکوٰۃ کے علاوہ بھی، اہل حاجت پر مال خرچ کرنے یا اللہ تعالیٰ کو قرضِ حَسَن دینے کا ذکر ہے، اگر فی الواقع زکوٰۃ سے مراد، وہ سارے کا سارا عفو المال ہوتا، جو افراد معاشرہ کی ذاتی ملکیت سے نکل کر، ریاست کی تحویل میں چلا جاتا، تو اس کے بعد، اہل حاجت پر، صَرف کرنے یا اللہ کو قرضِ حسن دینے کا حکم عبث قرار پاتا، حکم زکوٰۃ کے بعد بھی، انفاق کے یہ مطالبے، اس امر کو شک وشبہ سے بالاتر کر دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کا وہ مفہوم قطعی غلط ہے جو پرویز صاحب نے بیان کیا ہے۔

الغرض، آیت (۹/۶۰) میں صدقات سے مراد ''زکوٰۃ'' ہی ہے جسکا ذکر، آیت

(۹/۵۸) میں بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ پرویز صاحب کے حوالے (معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۸۵) سے گزر چکا ہے۔

اصطلاحی زکوٰۃ پر اعتراضاتِ پرویز کا جائزہ:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے زکوٰۃ کے اصطلاحی مفہوم پر (جو دورِ نزولِ قرآن سے لے کر، آج تک متفق علیہ اور مجمع علیہ مفہوم کے طور پر، متواتر و مسلسل معروف رہا ہے)، جو اعتراضات کیے ہیں، ان کا بھی جائزہ لے لیا جائے، ان اعتراضات کا خلاصہ (جن کی تفصیل، تفسیر مطالب الفرقان، جلد دوم، صفحہ ۲۰۸ پر دی گئی ہے) حسب ذیل ہے۔

(۱) قرآن جمع مال ہی کے خلاف ہے کجا یہ کہ اس پر ایک سال گزر جائے اور پھر اس پر مصطلحہ زکوٰۃ واجب ہو۔

(۲) قرآن میں وصولی وجمعِ زکوٰۃ کا کوئی حکم ہی نہیں ہے، اس میں صرف ایتاءِ زکوٰۃ کا حکم ہے، لہٰذا یہ مروجہ وصولی وجمع کے خلاف ہے۔

(۳) قُلِ العَفْوَ انتہائی مرحلہ ہے جس پر پہنچ کر جمعِ مال اور پھر اس پر زکوٰۃ ممکن ہی نہیں ہے۔

جائزہ اعتراضِ اول:

ہاں! یہ درست ہے کہ قرآن جمعِ مال کے خلاف ہے، لیکن کس صورت میں؟ اِس صورت میں جبکہ مال و دولت سے وابستہ شرعی حقوق ادا نہ کیے جائیں۔ اگر شرعی حقوق کی ادائیگی، بلا تعطل اور بلا تامّل، جاری رہے اور مال و دولت بھی شریعت کی حدود میں رہ کر کمایا جائے، اور اسے نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے، بخل سے کام بھی نہ لیا جائے، تو اس کے باوجود، جو مال، اس کے پاس جمع ہوگا وہ اللہ کا فضل ہوگا اور ہرگز ہرگز اکتنازِ زر کی وعید کے تابع نہیں ہوگا۔ اکتنازِ زر کی وعید صرف اس صورت میں ہے جبکہ جمعِ مال کے ساتھ لَايُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ الله کا طرزِ عمل بھی موجود ہو، ''مفکرِ قرآن'' نے، اشتراکیت کے

زیرِ اثر مرتب کردہ، اپنے ''نظامِ ربوبیت'' کو سامنے رکھتے ہوئے، مطلق جمعِ مال کو اس وعید کا مصداق قرار دیکر، جمعِ مال کی مذمت کی ہے حالانکہ یہ بات ہی سرے سے غلط ہے، جمع مال کی مذمّت میں، پرویز صاحب نے قرآنی الفاظ...... جَمَعَ فَاَوْعٰی (۱۸/۷۰) اور اَلَّذِی جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ (۲/۱۰۴) سے بھی استدلال کیا ہے، حالانکہ یہ آیات ان لوگوں کی مذمت میں ہیں جو کافر ہیں اور اپنے اموال میں، خدا کے کسی حق کو سرے سے مانتے ہی نہیں ہیں کجا یہ کہ وہ عملاً اس کو ادا کریں، لہٰذا یہ منکرینِ خدا و آخرت، مال کی محبت میں ایسے مبتلا ہیں کہ انہیں اپنے رزق میں رازق کے حقوق کی مطلق پرواہ نہیں ہے، ایسے لوگ واقعی مذمّت کے مستحق ہیں خواہ وہ کھلے کافر ہوں یا منافق یا نام نہاد مسلمان ہوں، ایک سچے اور کھرے مسلمان کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اپنی مکسوبہ دولت میں سے خدا کے راستے میں، دل کھول کر خرچ کرے، پھر بھی اگر کچھ رقم، اس کے پاس رہ جائے، تو اسلام، اس دولت کو، اللہ کا فضل قرار دیتا ہے۔ قرآن، مطلق جمع مال کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ صرف، اس صورت میں، اس کے خلاف ہے جبکہ خدا اور آخرت کے تقاضوں سے گریز کرتے ہوئے مال جمع کیا جائے، ایک مقام پر اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے، یہ کہا گیا ہے کہ:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فبذالك فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ

(یونس:۵۸)

''اے نبی! یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی، اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے یہ ان سب سے بہتر ہے جو لوگ جمع کر رہے ہیں۔''

یہاں نہ تو مَا يَجْمَعُون کو برا بھلا کہا گیا ہے اور نہ ہی جمع کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے بلکہ نعمتِ قرآن پر، انہیں خوشی منانے کی دعوت دی گئی ہے، اس ہدایت کے ساتھ کہ قرآنی تعلیمات کے مقابلے میں، اپنے دنیاوی مال کو بہتر نہ جانا جائے، کہ حقیر دولت کی خاطر کتاب اللہ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیا جائے، لیکن اگر کوئی شخص، کتاب اللہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، مال و دولت کو حاصل کرتا ہے، تو یہ کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے کہ

جس کے پاس بھی نہ پھٹکا جائے، بلکہ یہ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ کی رو سے فضل ربانی ہے، اور یہ شجر ممنوعہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ:

(۱)...... قرآن پاک، اپنی ضروریات پوری کر لینے کے بعد، بچ جانے والے مال میں سے ادائے زکوٰۃ، اور قرضِ حسن کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے، جو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کے پاس عفوالمال ہو۔

(۲)...... مال و دولت کو اللہ تعالیٰ نے ہستی ٔ انسان کا سہارا قرار دیا ہے، وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا ''اور اپنے وہ مال، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو'' اب ظاہر ہے کہ جو چیز ہستی انسان کا سہارا ہو، ازروئے قرآن، خیر ہو، اس کو کمانے کی جدوجہد کو، اللہ نے اِبْتِغَآءِ فَضْلِ اللّٰهِ سے تعبیر کیا ہو، تو اس کی بندۂ مومن کے پاس موجودگی، جبکہ شرعی حقوق کی ادائیگی میں بھی کوئی کوتاہی نہ ہو، قطعاً مکروہ ومبغوض نہیں ہے، اور نہ ہی اس مال کی وہ حیثیت ہوگی، جو منکر خدا اور مال پرست شخص کے مال کی ہوا کرتی ہے۔

(۳)...... قرآن مجید، مال و دولت کو بھی خیر کے نام سے موسوم کرتا ہے مَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ (۲/۲۷۳) اور وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰/۸)۔ ان تعلیمات کو بھی، وہ، خیر ہی کہتا ہے جو منزّل من اللہ ہوں، وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَا ذَا اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا (۱۶/۳۰) جب قرآن، دونوں کو (مال و دولت کو بھی، اور وحی کی تعلیمات کو بھی) خیر ہی کہتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کے حصول کو مذموم وممنوع قرار دے، البتہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیاوی خیر کو دینی خیر کے تابع رکھ کر، حاصل کیا جائے، اور جب ایسا کیا جائے، تو جو خیر بھی، از قبیل دنیا حاصل ہوگی وہ نہ تو عند اللہ معیوب ومبغوض ہوگی اور نہ ہی اس کے حاصل کرنے والوں کو، ان وعیدوں کا مستحق گردانا جائے گا، جن کو ''مفکر قرآن'' صاحب، عمر بھر،

جا و بیجا، اور بے سوچ سمجھے، ہر مسلمان پر چسپاں کر دینے کے عادی رہے ہیں۔

جائزہ اعتراضِ ثانی:

پرویز صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں جمع زکوٰۃ کا سرے سے کوئی حکم ہی نہیں ہے لہٰذا جس زکوٰۃ کے جمع اور وصول کرنے پر زور دیا جاتا ہے، وہ قرآن سے ثابت نہیں ہے۔

''مفکر قرآن'' صاحب، اشتراکیت پر ایمان لا کر، اسے مشرّف بالاسلام کرنے کے لیے، قرآن کریم کے ایک ایک لفظ سے اور ایک ایک اصطلاح سے زور آزمائی کیا کرتے تھے، اور زندگی بھر، ان قرآنی مصطلحات کے ظروف میں، نئے معانی و مفاہیم کی شراب بھرا کرتے تھے، پھر ان خود ساختہ مفاہیم و مطالب کو ''قرآنی معیار'' اور ''سندِ وحی'' قرار دیکر، وہ ہر اس چیز کے انکار پر تل جایا کرتے تھے، جو ان کے تصورات کے خلاف ہوں۔ قرآنی اصطلاح، زکوٰۃ اور صدقات کے ساتھ بھی، انہوں نے یہی کھیل کھیلا اور ان کے اصل معروف و متداول معانی سے انکار کر کے، انہیں اپنی طرف سے نئے معانی دیئے، اور پھر بڑے دھڑلّے سے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ

> ''ہمارے ہاں صدقات کے انہی مصارف کو، زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے، اور کوئی نہیں پوچھتا کہ قرآن نے یہ مصارف، صدقات کے بتائے ہیں، انہیں زکوٰۃ کے مصارف کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔'' [1]

حالانکہ انہی صدقات کا ذکر، سورۂ توبہ کی آیت (۵۸) میں بھی ہے، جسکا ترجمہ خود پرویز صاحب نے بھی زکوٰۃ ہی کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ (۹/۵۸)

''ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ مالِ زکوٰۃ بانٹنے میں، تجھ پر عیب لگاتے ہیں۔'' [2]

اس آیت میں، خود پرویز صاحب نے، ''صدقات'' سے مراد ''مال زکوٰۃ'' لیا ہے اور

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۹ [2] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۸۵

انہی صدقات کے مستحقین کا ذکر، آیت (۹/۶۰) میں ہے، خود پرویز صاحب، رقمطراز ہیں۔

''سابقہ آیات میں منافقین کے انہی صدقات کی تقسیم کے سلسلہ میں، حضور کے خلاف الزام تراشی کی تھی، زیرِ نظر آیات میں، انہی صدقات کے مصارف کا ذکر ہے۔'' [1]

یہی وہ ''صدقات'' (اموالِ زکوٰۃ) ہیں، جن کی وصولی و جمع کا حکم، حضور اکرم ﷺ کو ،ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔

خُذْمِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (التوبہ: ۱۰۳)

''لوگوں کے مالوں میں سے (اے نبی)، تم صدقات (اموالِ زکوٰۃ) وصول کیا کرو۔''

اس وصولی و جمع کے بعد ہی، وہ مرحلہ آتا ہے جس میں اسلامی حکومت کا فریضہ ''ایتاء زکوٰۃ'' (۲۲/۴۱) بتایا گیا ہے، نادار لوگوں کو زکوٰۃ دینے سے قبل، بہرحال، صاحبِ ثروت اور خوشحال افراد سے، اس کی وصولی و جمع کا مرحلہ مقدّم اور ناگزیر ہے، جب زکوٰۃ جمع ہو جاتی ہے تو پھر بیت المال سے مستحقین کو عطا کی جاتی ہے، اس پر یہ کہنا کہ ''قرآن میں، سرے سے وصولی وجمعِ زکوٰۃ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا''، ایک بے جا بات ہے، اپنے ہی خیالات میں مگن رہنے والوں کو کوئی چیز بھی، اپنے مطلب کے خلاف، قرآن میں سے نہیں ملا کرتی، اس آیت (۹/۱۰۳) کے تحت، پرویز صاحب، فرماتے ہیں۔

''یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہنوز قرآنی نظام، اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا، اس نظام میں، ہر شخص، اپنی آمدنی میں سے، اپنی ضروریات کے بقدر لے کر، باقی سب مملکت کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے کہ وہ اس سے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرے (۲/۲۱۹)۔'' [2]

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۹ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۳۴

تعجب خیز رویہ پرویز:

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اگر پرویز صاحب، اپنے خود ساختہ ''نظام ربوبیت'' کے حوالہ سے کلام فرمائیں، تو ''زکوٰۃ' ان کے من گھڑت مفہوم کے لحاظ سے، حکومت کی ایسی پوری آمدنی (Revenue) قرار پاتی ہے، جس کی وصولی وجمع، افراد معاشرہ ہی سے کی جاتی ہے، لیکن جب ''زکوٰۃ'' کا وہ مفہوم مراد لیا جائے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک سے لیکر، آج تک تواتر وتسلسل سے ہم تک پہنچا ہے، تو پھر ''مفکر قرآن'' صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ''قرآن میں تو وصولی وجمع زکوٰۃ کا سرے سے حکم ہی نہیں ہے۔''

جائزہ اعتراضِ ثالث :

پرویز صاحب کا یہ جملہ، بڑے تکرار کے ساتھ، اکثر وبیشتر مقامات پر، آپ کو ملے گا کہ...... ''یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ قرآنی نظام، ہنوز اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا''...... لیکن کسی ایک مقام پر بھی، انہوں نے بھولے سے یہ نہیں فرمایا کہ ''قرآنی نظام'' کا مکمل نفاذ کس سال میں ہوا تھا، کیونکہ وہ جس سال کو بھی، ''قرآنی نظام'' کا سال قرار دیں گے، اس کے بعد تک، بلکہ خلافت راشدہ تک کے دور میں ذاتی ملکیت کا اصول برقرار رہا ہے، کہیں بھی، وہ دور نہیں آیا جس میں زائد از ضرورت مال، لوگوں نے ریاست کے حوالہ کر دیا ہو، اور ریاست نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا ہو، اب یہاں دیکھئے کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً کا حکم، غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ، مطابق نومبر ۶۳۵ء، بحوالہ معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۸۰ اور معراج انسانیت، صفحہ ۲۹۲) کے بعد نازل ہوا، اور پرویز صاحب، آخر عمر تک، یہی رٹ لگاتے رہے، کہ...... ہنوز قرآنی نظام، اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا''...... حالانکہ بقولِ پرویز صاحب، ''قرآنی نظام'' کے تحت، ہر شخص، اپنی آمدنی میں سے بقدر ضرورت لیکر، باقی سب کچھ، جس حکم کے تحت، مملکت کی تحویل میں دینے پر مامور تھا، وہ سورۃ البقرہ (۲/۲۱۹) میں موجود ہے، یہ حکم ۲ھ میں نازل ہوا تھا، اب جبکہ ۲ ہجری میں نازل ہونے والے، حکم کے بعد بھی، ۹ھ تک، اس پر عملدرآمد نہیں ہوا تو نمعلوم،

پھر وہ ''قرآنی نظام'' کب نافذ ہوا تھا، جس کا یہ لوگ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے۔ جب خلفاء راشدین تک کے دور میں، مال و دولت اور زمین کی شخصی ملکیت کا وجود ثابت و برقرار رہا ہے (جیسا کہ پرویز صاحب کی کتب کے حوالہ سے اس مقالہ کے دوسرے مقام پر تفصیلاً مذکور ہے)، تو پھر نہ معلوم، وہ انتہائی مرحلہ، کس سن و سال میں آیا ہے جب لوگوں کے پاس، زائد از ضرورت کوئی مال و دولت باقی نہ رہا؟ کاش! ''مفکر قرآن'' صاحب یہ وضاحت بھی کر ڈالتے، کہ ان کے ''قرآنی نظام'' کے نفاذ کے تین مراحل، کس سن و سال میں طے پائے تھے، تاکہ ہم خود بھی، قرآن کی روشنی میں، ان کا جائزہ لے سکتے، حقیقت یہ ہے کہ قُلِ العَفْوَ کا وہ انتہائی مرحلہ (جسے مارکسزم سے ماخوذ، نام نہاد نظام ربوبیت کی آخری منزل کے طور پر، پرویز صاحب نے پیش کیا تھا) عہد نبوی یا خلافتِ راشدہ میں آیا ہی نہیں، یہ صرف ''مفکر قرآن'' کی اپنی فکری اُپج ہے، جو اُن کے اپنے ذہن کے سوا، عالم واقعہ میں کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتی۔

بحوالۂ زکوٰۃ، خارزار تضادات:

زکوٰۃ کی بحث کے آخر میں، ایک نظر، اس خارزار تضادات پر بھی ڈال لیجیے، جو زکوٰۃ کے ضمن میں، ''مفکر قرآن'' کے لٹریچر میں پایا جاتا ہے، یہی خارزارِ تضادات، اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ تشریح اسلام اور تفسیر قرآن میں، انہوں نے کبھی بھی فطرت اور صداقت کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ تصنّع اور تکلف کا راستہ اختیار کیا ہے، اور یہی ان کے تضادات کا اصل سبب ہے، اور جہاں تضادات پائے جائیں، اور وہ بھی بکثرت و بسیار، وہاں ممکن ہی نہیں کہ حقیقت بھی موجود ہو، وہاں تصنّع اور تکلف کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، خود، پرویز صاحب، ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

> ''حقیقت اور تصنّع میں ایک فرق ضرور ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، حقیقت کے بیان میں کبھی تعارض و تناقض نہیں ہوتا، کسی واقعہ کی جزئیات، آپ جس قدر زیادہ سے زیادہ بیان کرتے چلے جائیں گے کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی

جائیں گی، لیکن جو بات، واقعہ کے خلاف گھڑی جائے گی، اس کی جزئیات بیان کرتے وقت، کہیں نہ کہیں سچی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے، اس لیے کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی نہیں، کہ وہ قدم قدم پر زندگی بھر اپنے تصنع کا خیال رکھ سکے، لہٰذا اس کی جزئیات میں آپ کو تعارض و تناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے نظر آئیں گے۔''[1]

اب مندرجہ ذیل تضادات کو ملاحظہ فرمائیے، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ''مفکر قرآن'' نے کہاں تک تصنع سے کام لیا ہے؟ اور یہ بھی کہ جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے، اس میں واقعی کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی گئی ہیں؟ اور یہ بھی کہ کیا وہ واقعی اس قدر قوی الحافظہ تھے کہ قدم قدم پر انہوں نے اپنے تصنعات کو ملحوظ خاطر رکھا ہو؟ اور کیا ان کی تحریروں میں بھی تناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے دکھائی نہیں دیتے ہیں؟

(۱) صدقات و زکوٰۃ۔ مترادف المعنیٰ یا متغائر المفہوم؟:

ایک زمانہ تھا، کہ پرویز صاحب، زکوٰۃ کو تو فَرِیْضَةً مِنَ اللهِ مانتے تھے، اور صدقات کی رضا کارانہ (نفلی عبادت) اور لازمی (فریضہ کی) حیثیت کے بھی قائل تھے اور اس دوسری حیثیت کے اعتبار سے، صدقات و زکوٰۃ، ہم معنیٰ قرار پاتے ہیں، اور خود، پرویز صاحب بھی، زکوٰۃ اور صدقات کے مترادف المعنیٰ ہونے کے کبھی قائل تھے۔

''زکوٰۃ سے مفہوم وہی ہے جو ہم نے طلوع اسلام میں بیان کیا تھا، اس کے لیے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے وصول کر خُذْمِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (۹/۱۰۳)، حتیٰ کہ ان کارکنوں کا بھی ذکر ہے، جو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے متعین کیے جائیں وَالعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا (۹/۶۰)۔''[2]

اس اقتباس سے واضح ہے، کہ صدقات اور زکوٰۃ ہم معنیٰ ہیں، اور صدقات وصول کرنے کے حکم کا مطلب، وصولیٔ زکوٰۃ ہی ہے، نیز یہ بھی کہ آیت (۹/۶۰) میں مذکور

---

[1] طلوع اسلام، جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۹ [2] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۹ء، صفحہ ۸۲

مصارف بھی، زکوٰۃ ہی کے مصارف ہیں، جن میں وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا بھی ایک مصرف ہے، اگرچہ اس میں ''زکوٰۃ'' کی بجائے، ''صدقات'' ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن بعد میں، جب پرویز صاحب کا ذہن پلٹا، اور وہ ''مفکر قرآن'' بن گئے تو زکوٰۃ و صدقات میں مغائرت پیدا ہوگئی، اب زکوٰۃ، ایک چیز قرار پائی اور صدقات الگ اور جداگانہ شئے۔ یوں لفظی تفاوت کے ساتھ ساتھ ان میں معنوی تغایر بھی پیدا ہوگیا، اب، قرآن ہی کی بنیاد پر، ''مفکر قرآن'' نے یہ کہنا شروع کردیا کہ

''قرآن نے نہایت وضاحت کے ساتھ، ان دو الفاظ کو الگ الگ استعمال کیا ہے، اگر صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی ہوتی تو وہ صدقات کی جگہ زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کرتا، لیکن قرآن میں غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک، زکوٰۃ کا مفہوم صدقات سے الگ ہے، اسلامی معاشرے کے ابتدائی مدارج میں (جب ہنوز اپنی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی) صدقات کا مفہوم خیرات ہی تھا، لیکن جب بعد میں، اپنا نظام حکومت قائم ہوگیا تو صدقات سے مراد وہ عطیات وغیرہ ہوگئے جو اسلامی حکومت، بعض ہنگامی ضروریات کے لیے طلب کرتی ہے۔''[1]

(۲) مفہوم زکوٰۃ میں تضاد و تناقض:

تعارض و تناقض کی دوسری مثال، زکوٰۃ کے مفہوم میں پائی جاتی ہے، ایک زمانہ تھا، جب زکوٰۃ کے متعلق، یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ، کل مقدار مال کا ایک ایسا حصہ ہے جو بطور فریضہ صاحبِ مال پر عائد ہے، ہر نوع کے مال میں، شرحِ زکوٰۃ، متعین فرمودۂ شارع ہے۔

''جمع شدہ مال پر، جس پر سال گزر جائے، چالیسواں حصہ، اللہ تعالیٰ کی راہ میں، جو قوم کی حمایت اور خلقِ خدا کی بہتری کی راہ ہے، نکال کر خرچ کیا جائے، تاکہ مال صرف اغنیاء ہی میں نہ پھرتا رہے بلکہ غرباء اور ضرورت

---

[1] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳۶

مندوں میں آ کر ایک طرح سے اشتراک اور اشتمال بھی ہو جائے، كَيْلَا يَكُونَ دُوْلَةً بَيْنَ الاَغْنِيَاءِ مِنكُمْ [۱]

خود پرویز صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

''مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ، حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا، اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی ان کے ذمہ تھی .... ایک کروڑ پتی مسلمان سے کم از کم اڑھائی لاکھ بطور زکوٰۃ وصول کیا جائے گا۔'' [۲]

لیکن اشتراکیت کے بچھڑے کی محبت، جب اُن کے رگ وپے میں سرایت کر گئی، تو اب زکوٰۃ کا مفہوم بھی یکسر بدل گیا، ماڈرن مفہومِ زکوٰۃ، اب یہ قرار پایا کہ افراد معاشرہ کے ہاتھوں سے، زائد از ضرورت ساری دولت، جب حکومت کی تحویل میں آئے گی تو یہ زکوٰۃ کہلائے گی۔

''مملکت میں، تمام کا سب افراد، ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کیے جائیں گے اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق، پوری تندہی سے انجام دیں گے، اس کے ماحصل میں سے، بقدر ضرورت کے لے کر، فاضلہ دولت اس نظام کی سنٹرل اتھاریٹی (مرکز ملت) کی تحویل میں دے دیں گے .... آپ آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی جملہ آمدنی (Revnue) کو کہا جائے گا۔'' [۳]

قرآن وہی، الفاظِ قرآن وہی، جو چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے زیر مطالعہ و تلاوت ہیں، لیکن ''مفکرِ قرآن'' کا مفہوم بدلتا رہا، اُن کے خیالات میں تغیر آتا رہا، اور ''مفکر قرآن'' کے فضائے دماغی میں اٹھنے والی ہر لہر، قرآنی مفہوم میں تغیر وتبدل ہی نہیں بلکہ تحریف وترمیم کا باعث بنتی رہی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگرچہ قرآن تو وہی ہے، مگر سمتِ کعبہ بدل چکی ہے۔

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۰ [۲] طلوع اسلام، جون ۱۹۳۹ء، صفحہ ۴۸

[۳] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۲۰۷ تا ۲۰۸

(۳) مفہوم صدقات۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ:

زکوٰۃ وصدقات کے ضمن میں، تضاد کی تیسری مثال، صدقات کے تغیر پذیر مفہوم میں واقع ہے، کبھی اس کا مفہوم ''خیرات وامداد'' بھی تھا۔

''تمہارے دعوائے ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہو گا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کیا کچھ دیتے ہو، (اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقہ کہتے ہیں)'' [1]

لیکن جب یہی لفظ ''صدقات'' پرویز صاحب کی تجدد پسندی کا نشانہ بنا تو اس کا جدید مفہوم، یہ قرار پایا۔

''سال میں بعض ہنگامی حالات، ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن کے لیے بجٹ میں گنجائش (Provision) نہیں ہوتی، مثلاً سیلاب، زلزلہ، وبا، جنگ وغیرہ، ان کے لیے ملک میں خاص عطیّات کی اپیل کرنی پڑتی ہے، انہیں قرآن کریم نے صدقات سے تعبیر کیا ہے۔'' [2]

سوال یہ ہے کہ کیا سیلاب، زلزلہ، وبا، جنگ واقعی ایسے حوادث ہیں، جو ہر سال باقاعدگی سے آیا کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے، تو پھر تو ان کی گنجائش (Provision) بجٹ ہی میں ہونی چاہیے، لیکن اگر یہ ہنگامی اور اتفاقی نوعیت کے واقعات ہیں، جو کبھی کبھار، سالوں کے بعد رونما ہوتے ہیں، تو پھر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآن، ہنگامی اور اتفاقی امور سے نپٹنے کے لیے، عملہ مقرر کرنے کا، اور ان کی تنخواہ تک کا ذکر، یہ کہہ کر کر ڈالتا ہے کہ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ ..... وَالعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا .... (۹/۶۰) لیکن روز مرہ کے معاملات کو چلانے کے لیے، کسی عملہ یا ان کی تنخواہ کا ذکر تک نہیں کرتا؟ کیا قرآن کی یہی عادت ہے کہ وہ پگڈنڈیوں پر پیش آنے والے مسائل سے تو تعرض کرے، لیکن شاہراہوں کے مسائل سے اغماض برتے؟

---

[1] شاہکار رسالت، صفحہ ۳۳۵ [2] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۲

پھر حرام ہے، جو کبھی، ''مفکر قرآن'' نے، اس بات پر غور کیا ہو، کہ جب ضرورت سے زائد ساری آمدنی، ''زکوٰۃ'' بنکر حکومت کی تحویل میں چلی گئی تو ہنگامی حالات کے یہ عطیّات، آئیں گے کہاں سے؟ لوگوں کے پاس ''نظام ربوبیت'' نے جو کچھ باقی رہنے دیا ہے، وہ تو ہے ہی ان کی ضروریات کے بقدر، اب وہ عطیّات دیں گے کہاں سے؟

(۴) صدقات (کے موقع و محل) میں تضاد کا ایک پہلو:

صدقات کی ادائیگی کا موقع و محل کیا ہے؟ نظامِ ربوبیت کے نفاذ کے بعد، یا اس سے قبل؟ ''مفکر قرآن'' نے اس کے دو متضاد جواب دیئے ہیں۔

(الف) ادائیگیٔ صدقات کا موقع و محل، ''نظام ربوبیت'' کے قیام سے قبل کا ''عبوری دور'' ہے۔

''قرآن کریم میں صدقہ و خیرات کے ذریعہ، غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے کے، یا ترکہ اور وراثت وغیرہ کے سلسلے میں، جو احکام آئے ہیں، ان کا تعلق، انہی عبوری ادوار سے ہے، مکمل دین میں تو صورت یہ ہوگی کہ نہ کسی کے پاس، ضرورت سے زائد فاضلہ دولت ہوگی، اور نہ کوئی فرد، اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم، لہٰذا، دوسروں کی مدد کا محتاج ہوگا اسی دور کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَسْئَلُونَكَ مَاذا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)''[۱]

(ب)...... ادائیگیٔ صدقات کا موقع و محل، مکمل دین (نظام ربوبیت) کے نفاذ و قیام کے بعد بھی، ہے۔

''اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ ''ایتاء زکوٰۃ'' ہے، یعنی تمام افراد معاشرہ کو سامان نشو و نما بہم پہنچانا۔ اس مقصد کے پیش نظر، اس کی تمام آمدنی زکوٰۃ یعنی ذریعۂ نشو و نما کہلا سکتی ہے۔''

''اب آگے بڑھیئے، ہم دیکھتے ہیں کہ سال میں، بعض ہنگامی حالات ایسے بھی

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۲، صفحہ ۳۶۳

پیدا ہو جاتے ہیں جنکے لیے بجٹ میں گنجائش (Provision) نہیں ہوتی، مثلاً سیلاب، زلزلہ، وباء، جنگ وغیرہ، ان کے لیے ملک سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے، انہیں قرآن کریم نے صدقات سے تعبیر کیا ہے۔'' [1]

حقیقت یہ ہے کہ کہیں صدقہ کا مفہوم، کچھ بیان کیا گیا ہے، اور کہیں کچھ، ہر مفہوم کے ساتھ، اس کا موقع و محل بھی بدل جاتا ہے، مفہومِ صدقات، اگر ''خیرات و مالی مدد'' ہو تو پھر اس کا حکم، ''نظام ربوبیت'' کے نفاذ سے قبل کے ''عبوری دور'' سے وابستہ ہو جاتا ہے، اور اگر اس کا مفہوم ''ہنگامی حالات کے عطیات'' ہوں، تو پھر یہ مکمل دین کے نفاذ کے بعد کے دور سے وابستہ ہو جاتا ہے، اس صریح تضاد کے رفع و ازالہ کے لیے، یہ توجیہ کی گئی کہ صدقات کے مفہوم کا اختلاف موقع و محل کے اختلاف کو مستلزم ہے حالانکہ قرآن وہی اور قرآن کے الفاظ وہی لیکن ان کا مفہوم، بدلتے ہوئے ذہن کے تابع رہ کر تغیر پذیر رہتا ہے۔

(۵) آیت (۹/۶۰) مصارف زکوٰۃ یا مصارف صدقات؟:

سورۃ التوبہ کی آیت (۶۰) میں مذکور مصارف، مصارفِ زکوٰۃ ہیں؟ یا مصارفِ صدقات؟ پرویز صاحب کے لٹریچر میں، اس سوال کے بھی دو متضاد جوابات پائے جاتے ہیں۔

(الف)......آیت (۹/۶۰) میں مذکور مصارف، زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔

''حق تعالیٰ کا ارشاد ہے انما الصدقات للفقراء وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبهم ..... الآیہ (صدقات، فقراء، مساکین، زکوٰۃ وصولی وغیرہ کا کام کرنے والوں اور مؤلفۃ القلوب کے لیے ہیں) مؤلفۃ القلوب کو قرآن نے زکوٰۃ کے مصارف میں سے شمار کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ نبی ﷺ، بعض لوگوں کو محض تالیف قلب کی خاطر، زکوٰۃ میں سے کچھ مہیا کرتے تھے۔'' [2]

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۲ [2] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۵۶

لیکن جب ''مفکر قرآن'' کی سمتِ قبلہ بدلی تو اس آیت کا مفہوم بھی بدل گیا، اور آیت میں مذکور، مصارف بھی متغیر ہوکر، صدقات کے مصارف قرار پا گئے۔

''ہمارے ہاں، صدقات کے انہی مصارف کو، زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ قرآن نے یہ مصارف صدقات کے بتائے ہیں، انہیں زکوٰۃ کے مصارف کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔'' [1]

''مفکر قرآن'' کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ جب بھی وہ قرآن کا کوئی بدلتا ہوا، جدید مفہوم پیش کریں، تو لوگ اسے معیار جان کر، ان علماء اور عامۃ الناس سے ضرور پوچھیں، جو ان کے جدید ترین مفہوم سے اختلاف کر رہے ہیں، لیکن اُس ''مفکر قرآن'' سے کچھ بھی باز پرس نہ کریں جس کا مفہومِ قرآن، دو ٹکے کی جنتری کی طرح، ہر سال بدل جاتا ہے۔

(۶) اڑھائی فیصد زکوٰۃ۔ قرآنی بھی اور غیر قرآنی بھی:

قرآن نے اٰتُوا الزَّکٰوۃ کا حکم دیا، اور رسول قرآن نے، سال بھر کی مالی بچت پر اڑھائی فیصد شرح سے، زکوٰۃ عائد فرمادی، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، زکوٰۃ کے اس مفہوم کو غیر قرآنی مفہوم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے ہاں "اِیتاء الزکوٰۃ" کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے (یعنی لوگ زکوٰۃ دیں گے) اور زکوٰۃ سے مراد، یہ لیا جاتا ہے کہ جمع شدہ مال و دولت سے، سال کے بعد، اڑھائی فیصد روپیہ نکال کر، غریبوں کو دے دینا......

"اِیتاء الزکوٰۃ" کا یہ مفہوم، قرآنی نہیں۔'' [2]

لیکن اس کے باوجود، ''مفکر قرآن'' یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اڑھائی فیصد کی شرح سے قائم، یہ ''غیر قرآنی زکوٰۃ'' خلافتِ راشدہ میں رائج تھی۔

''قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دیکر، اس کی شرح و قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا ہے تا کہ ہر

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۹

[2] طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳۹ + ستمبر ۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۶

زمانے کی اسلامی حکومت، اپنی اپنی ضروریات کے مطابق، اسے خود متعین کرتی رہے، قرونِ اولیٰ میں خلافت راشدہ نے، اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق اڑھائی فیصد مناسب سمجھا، اس وقت یہی شرح، شرعی تھی۔"[1]

بطور جملہ معترضہ:

یہاں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی یہ شرح، خلفاءِ راشدین نے متعین نہیں کی تھی، اسے خود رسول اللہ ﷺ نے، مامور من اللہ کی حیثیت سے، فرض منصبی جان کر مقرر کیا تھا، اور خلفاءِ راشدین (ہی نہیں بلکہ اب تک کے علماء امت نے) اسے قطعی ناقابل تغیّر جان کر، تسلیم کر لیا ہے، اس لیے کہ، جو فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہو، اس میں کسی مسلمان کا پھر کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب:۳۶)

"کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول، کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنیکا اختیار حاصل رہے۔"

آمدم برسر مطلب:

جملۂ معترضہ کے بعد، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اڑھائی فیصدی زکوٰۃ، اگر غیر قرآنی ہے (کیونکہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے) تو صحابہ کرام بالعموم اور خلفاءِ راشدین بالخصوص، اس "غیر قرآنی زکوٰۃ" سے کیوں چمٹے رہے؟ انہوں نے کیوں اس قدر مال و دولت جمع کیا (کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگئی) جبکہ قرآن، بقولِ پرویز صاحب، جمعِ مال ہی کے خلاف ہے؟ کیا "غیر قرآنی زکوٰۃ" سے چمٹی رہنے والی یہ حکومت، کسی صورت بھی "خلافتِ راشدہ" کہلائی جانے کی مستحق ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ یا تو "مفکر قرآن" کا تصورِ زکوٰۃ غیر قرآنی ہے؟ یا پھر خلفائے راشدین کا، جن کے ہاں اڑھائی فیصد زکوٰۃ رائج

---

[1] طلوع اسلام، مئی ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۳

تھی؟ اگر اُن کے ہاں یہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ، اپنا وجود رکھتی ہے، (اور بالیقین رکھتی ہے، جیسا کہ خود مفکر قرآن کو اس کا اعتراف ہے) تو پھر ''مفکر قرآن'' کا تصور زکوٰۃ، سراسر غیر قرآنی ہے، لیکن اگر، پرویز صاحب کا پیش کردہ نظریۂ زکوٰۃ قرآنی ہے، تو خلافت راشدہ کی حکومت قطعاً ''غیر قرآنی'' اور غیر اسلامی قرار پاتی ہے۔

(۷) کیا خلافت راشدہ۔ دور ملوکیت ہے؟:

بہر حال، اقتباس بالا سے یہ ظاہر ہے کہ خلافتِ راشدہ میں، شرحِ زکوٰۃ اڑھائی فیصد رائج تھی، اور زکوٰۃ کا یہ تصور کہ افراد ریاست کی زائد از ضرورت دولت، حکومت کی جملہ آمدنی تھی، خلافت راشدہ میں موجود نہ تھا، وہاں تو افراد اپنی کل مکسوبہ دولت کے مالک تھے اور سال بھر کے بعد، اپنی بچت پر، (نہ کہ آمدنی پر) اڑھائی فیصد شرح کے حساب سے، زکوٰۃ دیا کرتے تھے، اور نفلی صدقات، اور دیگر شرعی امور میں، انفاقِ اموال اور رضا کارانہ اخراجات، زکوٰۃ کے علاوہ تھے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب نے جب اشتراکیت کا بپتسمہ پایا، تو اڑھائی فیصد زکوٰۃ کے متعلق، انہیں انکشاف ہوا کہ:

> ''زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم، اس دور میں وضع ہوا تھا، جب خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوگئی تھی، اور قرآن کے معاشی نظام کی جگہ، نظام سرمایہ داری، پھر سے در آیا تھا، زکوٰۃ کا یہ مفہوم، دراصل نظام سرمایہ داری پر ''اسلامی ٹھپہ'' لگانے کے لیے تھا۔'' [۱]

ظاہر ہے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا یہ مروّجہ مفہوم، اگر دورِ ملوکیت ہی میں وضع ہوا تھا، تو خلافتِ راشدہ کا دور، بجائے خود، دور ملوکیت، قرار پا گیا، کیونکہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا نظام، خلافتِ راشدہ میں موجود تھا، اور نظام سرمایہ داری پر، یہ ''اسلامی ٹھپہ'' لگانے والے لوگ، آغوشِ نبوت اور گہوارۂ رسالت میں، تربیت پانے والے وہی صحابہ کرامؓ تھے، جن میں سے بعض کو خلفاءِ راشدین ہونے کا شرف و اعزاز بھی ملا۔

---

[۱] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۸۰ء، صفحہ ۵۹

باب ہفتم

"نظام ربوبیت" کا نفاذ، منزل بمنزل

"مفکر قرآن" صاحب، زندگی بھر، جہاں اشتراکیت کو "نظام ربوبیت" کے نام سے مشرّف بالاسلام کرنے میں کوشاں رہے ہیں، وہاں وہ امت مسلمہ کو یہ باور کرانے کی بھی ناکام سعی کرتے رہے ہیں کہ جناب رسالتمآب ﷺ نے اسی نظام کو بتدریج نافذ فرمایا تھا، جو اموال واراضی کی شخصی ملکیت کی نفی کے اصول پر قائم تھا، چنانچہ "مفکر قرآن" بایں الفاظ رقمطراز ہیں، کہ

> "قرآن، اپنے پیش کردہ نظام کو بتدریج نافذ کرتا ہے، یعنی معاشرہ، جس حالت میں ہوتا ہے، وہ اپنے نظام کی ابتداء، اُس کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہوا، اسے، منزل بمنزل، اخیر تک پہنچاتا ہے، اس نے ان منازل کے لیے الگ الگ ہدایات دی ہیں، انہی کے مطابق، اسلام کے صدر اول میں، یہ معاشرہ قائم ہوا تھا، ان مختلف منازل کے متعلق احکام و ہدایات کا سمجھ لینا ضروری ہے، کیونکہ اس عمل تدریج کے سامنے، نہ ہونے سے، قرآنی احکام کے متعلق، قسم قسم کی الجھنیں پیدا ہوتی ہے۔" [1]

یقیناً، قرآن نے اپنے نظام کو بتدریج نافذ کیا ہے، سابق نظام کی جگہ، نئے نظام کی عملی تنفیذ کا کام، وحیٔ خداوندی کی ہدایات پر، منزل بمنزل ہوا، جس مرحلے پر جس قسم کی ہدایات کی ضرورت تھی، ویسی ہی ہدایات نازل ہوئیں، لہٰذا قرآنی نظام کے تدریجی نفاذ کا علم، اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک انسان، قرآنی آیات وسور کے دورِ نزول کو نہ جان

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۸۱

لے، کیونکہ جس ترتیب وتدریج سے، قرآن نازل ہوا ہے، اسی ترتیب وتدریج سے، اس کی تعالیم وہدایات کا نفاذ، عمل میں آتا رہا ہے، ایک آدمی، جس قدر، قرآنِ پاک کی ایک ایک آیت یا ایک ایک سورت کا زمانۂ نزول جانتا ہوگا، اسی قدر اس کے لیے، اسلامی نظام زندگی کے تدریجی نفاذ کو سمجھنا آسان ہوگا، اس بدیہی حقیقت سے کوئی عاقل، انکار نہیں کرسکتا۔

تاہم اگر کوئی شخص، ہر آیت یا ہر سورت کا زمانۂ نزول نہیں بھی جانتا تو کم ازکم اسے اتنا علم تو ہونا ہی چاہیے، کہ قرآن کی کچھ سورتیں، قبل از ہجرت، مکی دور میں نازل ہوئی تھیں، اور کچھ سورتیں، بعد از ہجرت، مدنی دور میں اتری تھیں، مکی اور مدنی سورتوں کی یہ ترتیبِ نزولی ہی، بہت حد تک، قرآنی نظام کے تدریجی نفاذ کو، قابل فہم بنا دیتی ہے، صرف، اتنا جان لینا ہی، یہ سمجھ لینے کے لیے کافی ہے کہ اولین مرحلۂ نفاذ میں، وہی آیات کارآمد ہوسکتی ہیں، جو اولین مرحلہ میں نازل ہوئیں، نہ کہ وہ، جو آخری مرحلے میں نازل ہوئی تھیں، اسی طرح، آخری مراحل میں، وہی آیات وسور، اساس نفاذ بن سکتی ہیں، جو انتہائی مراحل میں نازل ہوئی تھیں، نہ کہ وہ، جو ابتدائی مرحلے میں نازل ہوئی تھیں۔

پہلی منزل:

اس وضاحت کے بعد، اب ہم ''مفکر قرآن'' کے ان تین مراحل ومنازل کا جائزہ لیتے ہیں، جن کے اندر، بقولِ ''مفکر قرآن''، قرآنی نظام نفاذ پذیر ہوا تھا، وہ پہلی منزل کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> ''قرآن نے پہلی سٹیج پر، جہاں ایک طرف، ضرورت مندوں کی ضروریات، پوری کرنے کی انفرادی طور پر، ترغیب وتحریض دی، اس کے ساتھ ہی، دوسری طرف، مالی معاملات میں، اصلاح کی ہدایات بھی دیں، اس نے کہا کہ دوسروں کا مال، باطل طور پر مت کھاؤ (۲/۱۸۸، ۴/۲۹)، اس سلسلہ میں، اس کی تصریح کردی کہ مذہبی علماء ومشائخ، لوگوں کا مال، باطل طور پر کھاتے ہیں، لہٰذا ان کو کچھ نہ دو، خود محنت کرکے کمائیں، کھائیں (۹/۳۴) یتیموں کے مال

کی حفاظت کریں (۴/۶، ۶/۵۳، ۱۷/۳۴)، اگر عورت بھی کچھ کمائے، تو مرد خواہ مخواہ، غاصبانہ طور پر، اس کے مالک نہ بن جائیں، عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی، مرد اپنی کمائی کا (۳/۲۸۲) مقروض اگر تنگدست ہو تو اسے قرضہ معاف کر دو (۲/۲۸۰)، اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرو (۲/۱۸۰، ۵/۱۰۶)، اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ متوفّٰی وصیت نہ کر سکا یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہیں ہوئی، تو ترکہ کی تقسیم، ان احکام کے مطابق کرو، جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں (۴/۷، ۱۱، ۴/۱۲)، اور جن کی وجہ سے، دولت، ایک جگہ مرکوز ہونے کی بجائے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔''[1]

پہلی منزل کے احکام کا دورِ نزول:

''مفکر قرآن'' نے اپنے خود ساختہ نظام ربوبیت کے نفاذ کی پہلی منزل پر، جن احکام و ہدایات کو، اساسِ نفاذ بنایا ہے، ان کے دورِ نزول پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

۱...... ''دوسروں کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ'' (۲/۱۸۸، ۴/۲۹)، یہ حکم، سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء، دونوں میں موجود ہے، اول الذکر سورۃ کا غالب حصہ، مدنی دور کی ابتداء میں نازل ہوا، اگرچہ اس کی بعض آیات ۹ ہجری میں بھی نازل ہوئی تھیں، مثلاً سود سے متعلقہ آیات۔ رہی سورۃ النساء، تو وہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی، تاہم اس کی بعض آیات، تقریباً ۵ ہجری میں بھی نازل ہوئی تھیں۔

۲...... ''مذہبی علماء و مشائخ، لوگوں کا مال باطل طور پر کھاتے ہیں'' (۹/۳۴)، یہ آیت، سورۃ التوبہ کے اس حصے میں ہے جو ۹ ہجری میں نازل ہوا تھا، اسی حصہٗ سورت کو، حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو دیکر، حج کے موقعہ پر، اعلانِ عام کے لیے بھیجا تھا۔ (تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۱۲۹) تاہم آیت میں خبر کا پہلو ہے نہ کہ امر کا۔

۳...... ''یتیموں کے مال کی حفاظت کرو'' (۴/۶، ۶/۱۵۳، ۱۷/۳۴)۔ یہ حکم، ''مفکر قرآن''

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۸۲

کے تینوں حوالوں کے مطابق، سورۃ النساء، سورۃ الانعام اور سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے، سورۃ النساء کا دورِ نزول، اوپر مذکور ہو چکا ہے، رہی سورۃ الانعام اور سورۃ بنی اسرائیل، تو وہ دونوں، مکی دور میں نازل ہوئی تھیں، جبکہ ابھی اسلامی حکومت کا وجود بھی قائم نہ ہو پایا تھا، اسلامی مملکت، کب وجود پذیر ہوئی تھی؟ خود پرویز صاحب ہی کا فرمان ہے کہ:

''ہجرت کے بعد، مدینہ میں، اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔''[1]

۴......عورت، اپنی کمائی کی خود مالک ہوگی اور مرد اپنی کمائی کا آپ مالک ہوگا'' (۲/۲۸۲) پرویز صاحب کے دیئے ہوئے حوالہ میں سرے سے یہ مضمون موجود ہی نہیں ہے، سورۃ النساء کی ایک آیت میں، البتہ، یہ مضمون موجود ہے، سورۃ النساء کا دورِ نزول اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

۵......''مقروض، اگر تنگدست ہو، تو اسے قرضہ معاف کر دو'' (۲/۲۸۰)، یہ حکم، سورۃ البقرہ، سود کی آیات کے ساتھ، ۹ ہجری میں نازل ہوا تھا۔

۶......''اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرو'' (۲/۱۸۰، ۵/۱۰۶)۔ یہ حکم، دونوں مذکورہ حوالوں کے مطابق، سورۃ البقرہ اور سورۃ المائدہ میں موجود ہے، سورۃ البقرہ کا دورِ نزول، اوپر مذکور ہو چکا ہے، جبکہ سورۃ المائدہ، ۶ ہجری کے آخر میں، یا ۷ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی تھی، جب اہل ایمان، مکہ سے عمرہ کیے بغیر، اس شرط پر مدینہ لوٹ گئے تھے کہ وہ اگلے سال آئیں گے، مگر اگلے سال، ان کے عازمِ سفر ہونے سے پہلے یہ سورۃ نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات، جنگِ بدر سے بھی پہلے، اپنے نزول کا امکان رکھتی ہیں۔

دوسری منزل:

اس کے بعد، اب ان احکام و ہدایات کو ملاحظہ فرمائیے، جو پرویز صاحب، کے

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۱۲۹

نزدیک، دوسری منزل سے وابستہ ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''منزلِ اول میں، ضرورت مندوں کی امداد کے لیے، اپیل کی گئی تھی، جس کے معنٰی یہ تھے کہ وہ تم سے، اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے ہیں، تم انہیں بطور امداد کچھ دو، لیکن اب کہا کہ تمہارے مال و دولت میں ضرورت مندوں کا حق ہے، یعنی وہ اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر، بطور استحقاق لے سکتے ہیں۔ (............)

قرآن کریم نے بڑے تہدید آمیز انداز میں کہا کہ دولت کا اکتناز، یعنی اسے جمع کر کے رکھنا، سنگین ترین جرم ہے، اس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں، جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے، بُری طرح جلتے اور جھلستے ہیں۔''[1]

اسی مرحلہ میں، بقول پرویز صاحب، ارضی حد بندی کا آغاز ہوا، چنانچہ وہ، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

''اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا اور جو لوگ ''بے حدوحساب'' زمین کے رقبوں کے مالک بن بیٹھے تھے، ان کی ملکیت کی تحدید (حد بندی) کرنی شروع کر دی، ظاہر ہے کہ اس کے لیے معیار یہی ہو گا کہ ایک شخص کے پاس، اسی قدر رقبۂ اراضی رہے جسکی پیداوار، اُسکی اور اس کے اہل وعیال کی پرورش کے لیے کافی ہے، اس طرح، اس نے زمین کی ذاتی ملکیت کے ختم کرنے کے عملی پروگرام کی ابتداء کر دی، سورۃ الرعد میں ہے کہ داعیٔ انقلاب، حضور بنی اکرم ﷺ کے دل میں، یہ خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کے لیے، میں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی ہے کیا اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جائے گی؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ...... ''تم اس کی فکر نہ کرو کہ اس کی تکمیل تمہاری زندگی میں ہوگی یا تمہاری وفات کے بعد، تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ، یہ مکمل ہو کر رہے گا خواہ تمہاری

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۸۵ تا ۲۸۶

زندگی میں، خواہ اس کے بعد، تم دیکھتے نہیں کہ:

''ہم کس طرح، زمین کے رقبوں کو، ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے چلے آ رہے ہیں، یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہو گی)، اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلوں کو لوٹا نہیں سکتی، ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔'' (۱۳/۴۱)

اور سورۃ الانبیاء میں کہا کہ:

''انہیں اور ان کے آباء واجداد کو زمین، متاع حیات حاصل کرنے کے لیے ملی تھی، اس پر زمانہ گزر گیا تو انہوں نے اس پر قبضۂ مخالفانہ جما لیا، اب ہم آہستہ آہستہ اسے، ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں، ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی، یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔'' (۲۱/۴۴)

یوں اس دوسری منزل میں، اس نظام کے عملاً قیام کی ابتداء کر دی گئی۔''[1]

دوسری منزل کے احکام کا دورِ نزول:

آئیے، اب ہم یہ دیکھیں کہ اس مرحلہ و منزل میں، نفاذ پذیر ہونے والے احکام و ہدایت کا زمانۂ نزول کیا تھا؟

۱...... ''اہل حاجت بطور امداد نہیں، بطور استحقاق لیتے ہیں۔'' اس کا ماخذ، سورۃ الذّاریات اور سورۃ المعارج کی دو آیات ہیں، یہ دونوں سورتیں، ہجرت سے تقریباً آٹھ سال قبل نازل ہوئی تھیں، جبکہ اسلامی نظام کے نفاذ کی دوسری منزل، تو درکنار، سرے سے اس نظام کی کامیابی کے امکانات ہی ناپید تھے، اس وقت داعیٔ انقلاب ﷺ کی دعوت کا مقابلہ، تکذیب وجحود، استہزاء واستخفاف، طنز وطعن، اور جھوٹے الزامات کی بوچھاڑوں کے ساتھ، ہو رہا تھا، مگر ابھی ظلم وستم کی چکی چلنی شروع نہیں ہوئی تھی، ان حالات میں یہ کہنا کہ اسلامی نظام کا نفاذ، منزلِ اول سے گزر کر، دوسری منزل میں پہنچ

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۹۰ تا ۲۹۱

گیا تھا، قطعی بے بنیاد بات ہے جسے واقعات کی دنیا سے کوئی علاقہ وسروکار نہیں ہے، یہ صرف ''مفکرِ قرآن'' کے اپنے ذہن کی خلاّقی کا کرشمہ ہے۔

۲...... ''اکتناز دولت کی ممانعت کا حکم۔'' یہ سورۃ التوبہ کے اس حصہ میں واقع ہے جو نو ہجری میں نازل ہوا تھا۔

۳...... ''رقبۂ اراضی کی حد بندی''۔ یہ حکم، ''مفکرِ قرآن'' نے سورۃ الرعد اور سورۃ الانبیاء کی دو آیات سے نچوڑا ہے، سورۃ الرعد مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی تھی، اگرچہ بعض لوگوں نے اسے مدنی سورت بھی سمجھا ہے، لیکن اس کا مضمون پکار پکار کر، اس کے مکی سورت ہونے کی گواہی دے رہا ہے، اور سورۃ الانبیاء کا نزول، مکی دور کا درمیانی عرصہ ہے، یعنی یہ دونوں سورتیں، جنکی آیات کو، ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے، نظامِ اسلام کے نفاذ کی دوسری منزل میں لا کر ٹانک دیا ہے، اس وقت نازل ہوئی تھیں، جبکہ اسلامی حکومت کی ابھی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی (تحدید اراضی کی دونوں آیات کا اصل مفہوم، آگے آ رہا ہے)۔

تیسری منزل:

اسلامی نظام کے نفاذ کی تیسری منزل کے متعلق پرویز صاحب فرماتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے اور قطعی طور پر طے ہو گیا، سورۃ البقرہ میں ہے یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ''اے رسول! یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں، ان کا اپنا حق کس قدر، اور دوسروں کا کس قدر ہے؟ کہا گیا قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)، ان سے کہہ دو، اس میں تمہارا حق صرف اس قدر ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں، باقی سب کا سب، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے۔'' [۱]

---

[۱] نظامِ ربوبیت، صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۴

''مفکرِ قرآن'' کی قطعی بے اصل بات:

اس کے بعد آگے چل کر، پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ ان احکام کی بنیاد پر (جو بقول اُن کے، زمین کی ذاتی ملکیت کے خلاف ہیں۔ ۱۱/۴۱، ۱۰/۵۵) افراد کو زمین کی ملکیت سے قاطبۃً، بے دخل کر دیا گیا، حالانکہ یہ ''مفکرِ قرآن'' کا، دلیل سے عاری، قطعی بے اصل دعویٰ ہے، کیونکہ عہدِ نبوی تو رہا ایک طرف، خلافتِ راشدہ تک میں، اموال و اراضی کی شخصی ملکیت کا اصول رائج رہا ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مذکور واقعات سے ظاہر ہے، اور بعض واقعات، آئیندہ صفحات پر بھی آ رہے ہیں، تاہم فوری حوالہ کے لیے درجِ ذیل واقعات بھی، ملکیتِ اراضی کا واضح ثبوت پیش کرتے ہیں۔

۱...... ''(خود نبی کریم ﷺ نے غزوہ خیبر میں) یہود کی زمین، ان سے لے لی، اور اس کا نصف بیت المال میں رکھ لیا گیا تا کہ ضروریاتِ مملکت پوری کی جائیں اور دوسرا نصف مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔'' [1]

۲...... ''خلیفۂ اول، جناب ابوبکر صدیق ؓ کی ملکیت میں کئی قطعاتِ اراضی تھے، ''جب ان کی وفات کا وقت آیا تو وصیت کی کہ میری فلاں زمین بیچ کر، وہ ساری رقم، جو آج تک بیت المال سے وصول ہوئی ہے، واپس کر دی جائے، ان کا خیال غالبًا یہ تھا کہ جو رقم میں نے لی ہے، اس کے مطابق، امت کی خدمت نہیں کر سکا۔'' [2]

۳...... ''عہدِ فاروقی میں، صرف عراق کی زمینوں کے سوا، باقی جملہ مفتوحہ ممالک کی اراضی وغنائم کا تقسیم کیا جانا بھی، اس امر کا بین ثبوت ہے کہ عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں شخصی ملکیتِ مال واراضی کا اصول قائم تھا۔'' [3]

ان واقعات کے باوجود، یہ کہنا کہ ''عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں، افرادِ مملکت کو، اموال واراضی کی شخصی ملکیت سے قاطبۃً بے دخل کر دیا گیا تھا'' ''مفکرِ قرآن'' کی بے سروپا

---

[1] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۶۵ تا ۵۶۶ [2] تاریخ الامت از اسلم جیراجپوری، جلد۲، صفحہ ۴۷
[3] ملخص عبارت از شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۷۹

بات ہے۔

تیسری منزل کے احکام کا دورِ نزول:

بہرحال، اس تیسری منزل میں، ''مفکر قرآن'' صاحب نے، صرف دو ہدایاتِ قرآنیہ کو تکمیلِ کار کی بنیاد بنایا ہے، اب ان ہدایات کے دورِ نزول کو ملاحظہ فرمائیے۔

۱...... ''فاضلہ دولت کی انفرادی ملکیت کی نفی'' (۲/۲۱۹)، صحابہ کرامؓ کی طرف سے یَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ کا سوال، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قُلِ الْعَفْوَ کے الفاظ میں، جواب، سورۃ البقرہ کے اس حصہ میں واقع ہے، جس کا دورِ نزول، مدنی دور کا بالکل ابتدائی زمانہ ہے۔

۲...... ''زمین کی شخصی ملکیتوں کا خاتمہ'' (۵۵/۱۰، ۴۱/۱۱)، یہ دونوں آیات، سورۃ حم السجدہ اور سورۃ الرحمان میں ہیں، رہی سورۃ الرحمٰن، تو وہ مکی دور کے بالکل ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی تھی، اگرچہ بعض لوگوں کو، اس کے مدنی ہونے کا شبہ ہوا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ نہ صرف، یہ کہ، مکی سورت ہے، بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دور کی سورت ہے، یہ محض ''مفکر قرآن'' کے ذہنی تخیل کا کرشمہ ہے کہ جو آیات اُس دور میں نازل ہوئی تھیں، جبکہ اسلام کی کامیابی کے آثار، دور دور تک بھی دکھائی نہیں دیتے تھے، انہیں نظامِ اسلامی کے نفاذ کے تیسرے مرحلے کے ساتھ منتھی کر دیا گیا ہے۔

اب، ان مراحل ثلاثہ کے جملہ احکام و ہدایات کے دورِ نزول پر، ایک نظر ڈال لیجیے۔

مرحلہ/منزلِ نفاذ	حکم و ہدایت، جو نازل ہوا	قرآنی ماخذ	زمانہ نزول	اشارات
پہلی منزل	۱۔ دوسروں کا مال بالباطل نہ کھاؤ	البقرہ النساء	۲ھ میں اور کچھ ۹ھ میں ۳ھ تا ۵ھ میں	متعلقہ حکم ۲ھ میں اُترا تھا
	۲۔ علماء و مشائخ ناجائز مال کھاتے ہیں	التوبہ	۹ھ	یعنی جو حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا وہ پہلی منزل میں نافذ بھی ہو گیا ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

	۳۔یتیموں کے مال کی حفاظت کرو	النساء	۳ھ تا ۵ھ	
		الانعام	مکہ کا آخری دور	
		بنی اسرائیل	مکہ کا آخری دو	
	۴۔عورت اور مرد حق ملکیت رکھتے ہیں	البقرہ	۲ھ اور بعض ۹ھ میں	حوالہ غلط دیا ہے صحیح حوالہ سورۃ النساء ہے جس میں شخصی ملکیت کا اثبات ہے
	۵۔تنگدست مقروض کو قرض معاف کردو	البقرہ	یہ حکم ۹ھ میں اترا تھا	گویا یہ اپنے نزول سے قبل ہی نافذ ہو گیا یا یہ کہیے کہ پہلی منزل ۹ھ تک وسیع ہے
	۶۔ترکہ میں وصیت کرو	البقرہ	یہ حکم ۲ھ میں اُترا	کیا پہلی منزل ۶ تا ۷ھ تک ممتد ہے؟
		المائدہ	آخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ	کاش وہ ان مراحل کے سن وسال بھی واضح کر دیتے اور بات کو مبہم نہ رکھتے۔
دوسری منزل	۱۔اغنیاء کے مال میں، اہل حاجت کا حق	الذاریات	۷ تا ۸ سال قبل از ہجرت	گویا اللہ تعالیٰ نے، وقت نفاذ سے، سال سالہا قبل اور بے وقت نازل کیے جانے والے حکم کو برسوں گوشۂ خمول میں رکھا۔
		المعارج	۷ تا ۸ سال قبل از ہجرت	
	۲۔اکتناز مال کی ممانعت کا حکم	التوبہ	۹ھ	یا تو یہ کہیے کہ دوسری منزل کا دور ۹ھ تک رہا، یا پھر یہ مانیے کہ اس حکم کو نزول سے قبل ہی نافذ کر دیا گیا۔
	۳۔ارضی ملکیتوں کی تحدید	الرعد	ڈیڑھ، ۲ سال قبل از ہجرت	قبل از ہجرت، بے وقت نازل ہونے والا یہ حکم، برسوں گوشۂ خمول میں پڑا رہنے کے بعد، نافذ ہوا۔
		الانبیاء	ڈیڑھ، ۲ سال قبل از ہجرت	

تیسری منزل	۱۔ فاضلہ دولت کی ملکیت کی نفی	البقرہ	مدنی دور کے آغاز میں اُترا	گویا یہ حکم بے وقت اور قبل از وقت اُترا اور آخری منزل نفاذ آنے تک بیکار پڑا رہا۔
	۲۔ ارضی ملکیت کی نفی کا پروگرام اختتام کو پہنچا	الرعد	ڈیڑھ، ۲ سال قبل از ہجرت	گویا علیم و حکیم خدا نے یہ حکم، اس وقت نازل کیا جب اہل ایمان محروم اقتدار تھے، اس طرح تقریبا دس سال تک، یہ حکم تعطل کا شکار رہا اور گوشۂ خمول میں پڑا رہا۔
		الانبیاء	ڈیڑھ، ۲ سال قبل از ہجرت	

چند بدیہی نتائج:

''مفکر قرآن'' کی ان طبعزاد منازل میں، اساسِ نفاذ بننے والے احکام و ہدایات کے زمانۂ نزول پر ایک اچٹتی سی نظر بھی اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ

۱...... تینوں منازل میں بعض ایسے احکام بھی، اسلامی نظام معیشت کے نفاذ کی اساس بنائے گئے ہیں، جو مکہ مکرمہ میں، اس وقت نازل ہوئے تھے جبکہ (مدینہ منورہ میں) اسلامی حکومت کی ابھی داغ بیل ہی نہیں پڑی تھی، مثلاً یتیموں کے مال کی حفاظت سے متعلقہ احکام، جو سورۃ انعام اور سورہ نبی اسرائیل میں موجود ہیں، اگر یہ احکام واقعی، اپنے نفاذ کے لیے ریاست کی قوتِ قاہرہ کے محتاج ہیں، تو پھر ریاست کے وجود کی بناء پڑنے سے سالہا سال قبل، ان کا نازل کر دیا جانا، ایک ایسی خلافِ حکمت بات ہے جس کی توقع، خالقِ حکمت سے نہیں کی جا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اموال یتامیٰ کے سلسلہ میں، ان احکام و ہدایات کی تعمیل، وجود ریاست کے بغیر بھی ممکن ہے، خدا و رسول اور آخرت پر ایمان ہی......بشرطیکہ یہ ایمان،

قلب و دماغ میں خوب راسخ ہو چکا ہو......ان کے نفاذ کی مکمل ضمانت فراہم کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکی دور ہی میں نازل فرما دیا اور اسلامی حکومت کے وجود پذیر ہونے کا انتظار نہ کیا، کیونکہ یہ ہدایات و احکام، محض اُن اخلاقی بنیادوں پر ہی نافذ ہو جاتے ہین جو اسلامی عقائد فراہم کرتے ہیں، اس لیے ''مفکر قرآن'' کا مکی دور کے ان احکام کو کھینچ تان کر، مدینہ میں نفاذ اسلام کی پہلی یا دوسری منزل سے وابستہ کر ڈالنا، نہ صرف یہ کہ ایک بیجا تکلف ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ، خدا کی حکمتِ کاملہ پر عدم اعتماد کا اظہار بھی ہے، جس نے یہ احکام سالہا سال قبل از وقت، بلکہ ''بے وقت'' نازل کر ڈالے۔

۲......بعض ایسے احکام کو منزلِ اول یا منزلِ ثانی میں نافذ شدہ قرار دیا گیا ہے، جو ابھی نازل ہی نہیں ہوئے تھے، مثلاً سورۃ التوبہ کے احکام، جو ۹ ھ سے قبل نازل ہی نہیں ہوئے تھے، کیا ان کا نفاذ، نزول سے بھی قبل ہو گیا تھا؟ ''علماء و مشائخ لوگوں کا مال، ناحق کھاتے ہیں، اس لیے انہیں کچھ نہ دو۔'' ذرا سوچیے تو سہی کہ یہ حکم (اگر واقعی یہ حکم ہے بھی تو) اپنے نفاذ کے لیے، ریاست کا ہی محتاج ہے؟ اِنَّ ہٰذَا الشَّیْءُ عُجَابٌ

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن نے صرف یہ کہا ہے کہ ''علماء و مشائخ لوگون کا مال ناحق کھاتے ہیں'' اس کے بعد، ''لہٰذا ان کو کچھ نہ دو'' قرآنی حکم نہیں ہے، بلکہ ''مفکر قرآن'' کا خود ساختہ اضافہ ہے، پھر یہ ''علماء و مشائخ'' بھی، امت مسلمہ کے افراد نہیں ہیں جو دور نزول قرآن کے وقت، اہل ایمان کے مالوں کو ناحق ہڑپ کیا کرتے تھے، بلکہ اہل کتاب میں سے تھے، جو یہود و نصاریٰ کا مال ناحق طور پر کھانے کے عادی تھے، قرآن نے ان کے لیے ''احبار و رہبان'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں جنکا مصداق، دورِ نزولِ قرآن میں، علماء و مشائخ از یہود و نصاریٰ تھے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے اسے امت مسلمہ سے وابستہ حکم قرار دیکر، نفاذِ اسلام کی پہلی منزل سے منتھی کر دیا ہے۔

رہا یہ امر کہ، احبار و رہبان سے مراد، اہل کتاب کے علماء و مشائخ ہیں، تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسکا اعتراف ''مفکر قرآن'' کو بھی کرنا پڑا ہے۔

''جب نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ حضورؐ! یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے، تو حضورؐ نے فرمایا ''کیا یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حلال بتا دیں، اور اسے حرام، جسے وہ حرام کہہ دیں؟ یہی اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللہ بنانا ہے۔'' [1]

ان ''احبار و رہبان'' سے یہود و نصاریٰ کے علماء اور مشائخ مراد نہ لینا اور ان کی بجائے امت مسلمہ کے اہل علم اور صوفیاء کرام مراد لینے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت، خود امت محمدیہ میں، اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں، ''مذہبی پیشوائیت'' کا وجود موجود تھا، جبکہ ''مفکر قرآن'' بڑے فخر و انبساط سے یہ اعلان کیا کرتے ہیں کہ

''جس نظام کی تشکیل محمد رسول اللہ والذین معه کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی تھی، اس میں ''مذہبی پیشواؤں'' کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا (حتّٰی کہ مولوی اور مولانا کی اصطلاحیں بھی دورِ ملوکیت کی ایجاد ہیں)'' [2]

اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ ''مفکر قرآن'' یہود و نصاریٰ سے متعلقہ آیات کو کس طرح ''احکام'' میں تبدیل کر کے، انہیں اپنے خود ساختہ نظریات کی خدمت کے لیے وقف کر لیا کرتے تھے۔

۳...... کچھ ایسی آیات کو بھی، نفاذِ اسلام کی اساس بنایا گیا ہے جو اگرچہ حکم کا کوئی پہلو نہیں رکھتی ہیں، مگر ''مفکر قرآن'' نے اپنے مدعاءِ مطلوب کی دُھن میں، ان آیات میں بھی حکم بلکہ قانون اور آئین کا پہلو پیدا کر دیا ہے مثلاً سورۃ الرعد اور سورۃ الانبیاء کی وہ آیات، جن سے اراضی کی ملکیتوں کی تحدید کا قانون نچوڑا گیا ہے، پھر یہ دونوں آیات بھی مکہ ہی میں نازل ہوئی تھیں، اور جب تک ''مفکر قرآن'' کے دعویٰ کے مطابق، دوسری یا تیسری منزل نہیں آئی، اس وقت یہ آیات، بیکارِ محض بن کر گوشۂ خمول میں پڑی رہیں، کیا یہی حکمتِ تدریجِ نزول اور مصلحتِ تدریجِ نفاذ ہے؟

---

[1] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۴۰ء، صفحہ ۳۴ [2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۷

پیکرِ باطل پر لباس خوشنما:

ہماری یہ بحث، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ ''نظامِ ربوبیت'' کے خوشنما لباس میں، جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ فی الواقعہ، مارکسیت ہی کا پیکرِ باطل ہے۔

یزداں کے تصور میں تراشا تھا جو پتھر
اس میں سے بھی ابلیس کا پیکر نکل آیا

اس پیکرِ ابلیس کو مشرف بالاسلام کر ڈالنے کے لیے، ''مفکرِ قرآن'' نے، قرآن ہی کے نام پر، آیاتِ قرآنیہ کو، جس بُری طرح، تختۂ مشق بنایا ہے، سلف و خلف میں اس کی مثال نہیں ملتی، اس مقصد کے لیے، استدلالاً یا استشہاداً پیش کی جانے والی آیات کے زمانہ نزول کو یکسر نظر انداز کیا گیا، اور الفاظِ قرآنیہ کو اصل سیاق و سباق سے اکھاڑ کر، اُن سے بے ہنگم دھینگا مشتی کرتے ہوئے، مفرداتِ قرآن کے گلے من مانے معانی مڑھے گئے، صدرِ اسلام میں ''نظامِ ربوبیت'' (جو دراصل مارکسیت ہی کا ''قرآنی'' ایڈیشن ہے) کے نفاذ کی ایک خود ساختہ ذہنی ترتیب قائم کی گئی، اور پھر اس ترتیب کے مطابق، قرآن مجید کے متفرق مقامات سے، مختلف قطعاتِ آیات کو جوڑ جاڑ کر ''نظامِ ربوبیت'' کی سہ منزلہ عمارت ایستادہ کر ڈالی گئی، اس ساری کاروائی کے دوران، اس بات کا شدت سے التزام برتا گیا کہ جہاں کوئی بات کھینچ تان سے بھی نہ بن سکے، وہاں مفہومِ آیات کی کتر بیونت سے کام لیا جائے، اس غرض کے لیے، اگر قواعدِ زبان کی مخالفت واقع ہو جائے، یا محاورۂ عرب کا خون ہو جائے، تو ''مفکرِ قرآن'' کی بلا سے، انہیں صرف اس بات سے غرض تھی کہ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کے الفاظ سے نچوڑا ہوا، ان کا ''نظامِ ربوبیت'' اور اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا کے جملہ سے کشید شدہ ''تحدیدِ ملکیتِ اراضی'' کے قانون کا جعلی سکہ، کسی نہ کسی طرح بازارِ علم میں چل جائے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو، یا درمیاں رہے

''نظامِ ربوبیت'' کی ساخت میں امورِ ثلاثہ کا شدید التزام:

قرآن کریم میں سے ''نظامِ ربوبیت'' کو کشید کرتے ہوئے ''مفکرِ قرآن'' نے تین باتوں کا شدید التزام کیا ہے۔

اولاً .... یہ کہ کسی مقام پر بھی، قرآنی آیات و سُور کا زمانۂ نزول، نہ درج ہونے پائے، کیونکہ اس سے ان کے خود ساختہ منازل و مراحل کے پرکھے جانے کے لیے ایک کسوٹی بہم پہنچ جاتی ہے، لہٰذا اس کا التزاماً ذکر ہی نہ کیا گیا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

ثانیاً ...... یہ کہ کسی مقام پر بھی، مراحل ثلاثہ میں سے، کسی مرحلے کے سنِ آغاز اور سالِ اختتام کا ذکر نہ آنے پائے۔ ہر جگہ اور ہر سہ منازل کو، ان کے دورِ وقوع کے اعتبار سے مبہم رکھا جائے تا کہ اگر کہیں ایسا ہو کہ نفاذ کے ان مراحلِ ثلاثہ کے بعد کا کوئی واقعہ، موقفِ پرویز صاحب کی تردید میں پیش کیا جائے تو ''مفکرِ قرآن'' کے پاس، یہ کہنے کے لیے ''جملہ حقوق محفوظ'' ہوں کہ...... ''یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہنوز، قرآنی نظام، اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا'' ......لیکن کسی مقام پر بھولے سے بھی، انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ''قرآنی نظام'' اپنی مکمل شکل میں، کس سن و سال میں قائم ہوا تھا، کیونکہ وہ جس سال کو مکمل نفاذ و قیام کا سال قرار دیں، اُس سال کے بعد کے، بہت سے ایسے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جو ایک طرف، ان کے موقف کے بطلان پر شاہد عدل ٹھہرتے ہیں، اور دوسری طرف، یہ بھی ثابت کر دیتے ہیں کہ نہ صرف دورِ نبوی میں بلکہ خلافتِ راشدہ تک میں مال و دولت، وسائلِ پیداوار اور زمین کی شخصی ملکیت کا اصول برقرار رہا ہے، اور اُس ''نظامِ ربوبیت'' کا خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی ہمیں کوئی سراغ نہیں ملتا جسے ''مفکرِ قرآن'' نے اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ اور قُلِ الْعَفْوَ کے الفاظ سے نچوڑ ڈالا ہے۔

ثالثاً ...... یہ کہ قرآن کریم کا مطیعِ فرمان بننے کے لیے نہیں بلکہ کتاب اللہ کو اپنا مطیعِ فرمان بنانے کے لیے، آیاتِ قرآنیہ کو ایسے معانی پہنائے جائیں کہ بقول علامہ اقبالؒ،

خداو جبرئیل و مصطفیٰ، ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیں، مشتے از نمونہ از خروارے، موضوع کی مناسبت سے، صرف دو آیات پیش کی جاتی ہیں،

تفسیرِ آیات یا تحریفِ آیات؟:

جنہیں ''مفکر قرآن'' نے مسخ و تحریف کا نشانہ بنایا ہے، یہ دونوں آیات مع ترجمہ پیشِ خدمت ہیں، ان آیات سے ارضی ملکیت کی تحدید کا قانون کشید کیا گیا ہے:

اَوَلَمْ یَرَوا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (الرعد: ۴۱)

''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کی (چاروں) طرفوں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں، اللہ ہی فیصلہ کرتا ہے، کوئی اس کے حکم کو پیچھے نہیں ڈال سکتا، وہ حساب لینے میں بہت شتاب ہے۔''

اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الغَالِبُوْنَ

(الانبیاء: ۴۴)

''کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو چاروں طرف سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں، پھر کیا یہ لوگ، غالب آجائیں گے؟''

ان آیات کا یہ سیدھا سادا ترجمہ ہے جو آپ کسی بھی قرآنِ مترجم میں دیکھ سکتے ہیں۔

ان آیات سے وسائل پیداوار اور ارضی ملکیتوں کی حد بندی کا قانون کشید کرنے کے لیے ''مفکر قرآن'' نے، الفاظ وحی سے، جس طرح، عقلی کشتی اور ذہنی دنگل لڑا ہے، اور آیات کے عام فہم مفہوم سے جان چھڑاتے ہوئے، ان سے مطلوبہ معانی برآمد کرنے کے لیے، جس طرح دور کی کوڑی لانے میں، موصوف نے اپنی ''ذہانت'' اور ''مہارت'' صرف کی ہے، وہ اس سلوک کو واضح کر دیتی ہے جو ''مفکر قرآن'' عمر بھر، خدا کی کتاب سے کرتے رہے ہیں، ان کے نزدیک، مفہوم آیات اب یہ ہے۔

''کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم کس طرح زمین (وسائل پیداوار) کو بڑے

بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر، ان کے مقبوضات کو کم کرتے چلے آ رہے ہیں (۲۱/۴۴) ...... یہ خدا کا فیصلہ ہے اور خدا جو فیصلے کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان فیصلوں کو ٹال سکے یا رد کر سکے، وہ محاسبہ کرنے میں بڑا تیز ہے۔ (۱۳/۴۱)'' [1]

یہ سورۃ الرعد کی آیت ۴۱ کا مفہوم ہے، اب ''مفکر قرآن'' ہی کے قلم سے سورۃ الانبیاء کی آیت ۴۴ کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے:

''کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم معاشی ذرائع (زمین) کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر، ان کی مقبوضات کو کس طرح کم کرتے چلے جا رہے ہیں (۱۳/۴۱) کیا اس کے باوجود، یہ سمجھتے ہیں کہ بالادست رہیں گے، اور ہمارا نظام ان پر غالب نہیں آ سکے گا۔'' [2]

چھوڑیئے اس بات کو کہ قواعد زبان کی رو سے یہ مفہوم ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اسے بھی نظر انداز کیجیے کہ اَطْرَافِھَا کا معنٰی لغاتِ عربیہ کی روشنی میں، ''بڑے بڑے سردار'' لیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟ اسے بھی جانے دیجئے کہ ان ''بڑے بڑے سرداروں'' سے مراد، اس زمانے کے ''مسلمان جاگیردار'' اور ''اہل اسلام زمیندار'' کیسے ہو گئے، کیونکہ نفیٔ ملکیت کا یہ قانون، تو اہل ایمان ہی پر نافذ ہو سکتا تھا، نہ کہ سردارانِ کفار پر۔ فی الحال، تو آپ صرف اس بات پر غور فرمائیں کہ جب کوئی شخص، خارج از قرآن، افکار و نظریات پر ایمان لے آتا ہے، اور وہ بھی پیشگی ایمان، تو اسے قرآن کے الفاظ میں، اپنا مفہوم داخل کرنے کے لیے، کس طرح اکھاڑ پچھاڑ، تبدیل و تغییر، مسخ و تحریف اور کتر بیونت سے کام لینا پڑتا ہے، یہاں تک کہ اسے اپنے مدعا کے اثبات کے جوش میں، اتنا بھی ہوش نہیں رہتا کہ وہ یہ دیکھے کہ اس سے قبل، وہ خود، انہی آیات کا اور انہی الفاظ کا کیا ترجمہ و مفہوم پیش کرتا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب زندگی بھر، اسی روش پر چلتے ہوئے، قرآنی

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۵۶۳ [2] مفہوم القرآن، صفحہ ۷۳۶

آیات کو اپنی نت نئی سخن سازیوں کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔

حقیقی مفہومِ آیات بقلمِ پرویز:

سورۃ الرعد اور سورۃ الانبیاء کی زیر بحث آیات کا، ایک مفہوم وہ ہے، جو، بقولِ پرویز صاحب، ارضی ملکیت کی تحدید کے قانون کا ماخذ و مصدر ہے، لیکن یہ ایک غلط اور وضعی مفہوم ہے جسے ''مفکر قرآن'' نے منسوب الی القرآن کر رکھا ہے، ان آیات کا حقیقی مفہوم وہی ہے جو دورِ نزولِ قرآن سے لے کر، اب تک ہر دور کے علماء کرتے رہے ہیں، اگر ان علماء سلف وخلف کے حقیقی مفہوم پر مشتمل اقتباسات کو پیش کیا جائے تو وابستگانِ طلوع اسلام، انہیں اس لیے درخورِ اعتناء نہ سمجھیں گے کہ علماء امت کا یہ مفہومِ آیات تو دراصل، اس عجمی سازش کا نتیجہ ہے جس کے تحت، قرآن کے عربی الفاظ میں عجمی مفاہیم داخل کیے گئے ہیں، اس لیے، ان ہر دو آیات کا ترجمہ، امت مسلمہ کے کسی جیّد سکالر کی طرف سے پیش کرنے کی بجائے، ''مفکر قرآن'' ہی کے قلم سے پیش کیا جا رہا ہے۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

اور اگر دل میں مری بات نہ بھی داخل ہو، تو بھی اتمام حجت، خود ان ہی کے ترجمہ سے ہو جائے۔

پرویز صاحب نے، ایک مقام پر آیت (۱۳/۴۱) کا ترجمہ بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

''پھر کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم اس سرزمین کا قصد کر رہے ہیں، اسے اطراف سے گھٹا کر (ظالموں پر اس کی وسعت تنگ کر) رہے ہیں وہ حساب لینے میں بہت تیز اور حساب لینے والوں میں، اس سے جلد حساب لینے والا کوئی نہیں ہے۔'' [1]

ایک اور مقام پر، آیت (۲۱/۴۴) کا مفہوم، یوں بیان کیا ہے۔

''اصل یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادوں کو (فوائد زندگی سے)

---

[1] معارف القرآن، جلد ۱، صفحہ ۴۷

بہرہ ور ہونے کے مواقع دیئے، یہاں تک کہ (خوشحالیوں کی سرشاریوں میں) ان کی بڑی بڑی عمریں گزر گئیں (اور اب غفلت ان کی رگ رگ میں رچ گئی ہے) مگر کیا یہ لوگ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہم زمین کو چاروں طرف سے، ان پر تنگ کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں؟ پھر کیا وہ اس مقابلہ میں غالب آ رہے ہیں؟'' [1]

اب غور فرمایئے کہ قرآنی آیات تو چودہ صدیوں سے وہی ہیں، لیکن ''مفکر قرآن'' نے مختلف اوقات میں، ان کے متفرق بلکہ متضاد مفاہیم بیان کیے ہیں ایک وہ وقت تھا کہ ان کا قلب و دماغ، اِس نام نہاد ''نظام ربوبیت'' کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں تھا تو وہ ان آیات کا کچھ اور مفہوم پیش کیا کرتے تھے، اور آج جبکہ مارکسزم ان کے قلب و دماغ کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے، تو اِن ہی آیات میں سے، ایک اور ہی طرح کا مطلب برآمد کیا گیا ہے، اس طرح، ''مفکر قرآن'' نے عمر بھر، قرآن مجید کو، العیاذ باللہ، مداری کی پٹاری بنائے رکھا کہ جس سے جب اور جیسا مفہوم چاہا، برآمد کر لیا۔

بناءِ فاسد علے الفاسد:

یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے، ''مفکر قرآن'' جناب پرویز صاحب نے آیت (۱۳/۴۱) اور آیت (۲۱/۴۴) میں اوّلاً تو اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا کا قطعی غلط مفہوم پیش کیا ہے، اور ثانیاً، اس غلط مفہوم سے بھی غلط استنتاج کیا ہے، تفصیل، اس اجمال کی یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے ارضی ملکیت کی تحدید کے پروگرام کی ابتداء اور آغاز کی اساس، ان ہی آیات پر رکھی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''قرآن کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں، اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا اور جو لوگ ''بے حد و حساب'' زمین کے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے، ان کی ملکیت کی تحدید کرنی شروع کر دی۔'' [2]

---

[1] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۶۶۲ تا ۶۶۳ [2] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۹۰

لیکن الفاظ آیات ، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ''تحدید ملکیت'' کا یہ عمل ، ان آیات کے نزول سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا، اسی لیے، تو اَوَلَمْ یَرَوا (کیا انہوں نے نہیں دیکھا؟) اور اَفَلَا یَرَوْنَ (پھر کیا وہ دیکھتے نہیں؟) کے الفاظ میں، انہیں دیکھنے اور غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، گویا اس کام کی ابتداء، نزول آیت سے پہلے ہی ہو چکی ہے، اور اب انہیں ، دیکھنے اور غور کرنے کی تاکید کی جا رہی ہے، اس طرح ، پہلے تو انہوں نے آیت کا ترجمہ و مفہوم قطعی طور پر غلط پیش کیا، اور پھر اس باطل مفہوم سے استدلال و استنتاج بھی غلط ہی کیا، اسے کہتے ہیں، بناءِ فاسد علی الفاسد۔

☆......☆......☆

باب ہشتم

کیا صدرِ اسلام میں ''نظامِ ربوبیت'' نافذ تھا؟

''مفکرِ قرآن'' نے اشتراکیت سے ذہنی مرعوبیت کے نتیجہ میں، قرآن کریم کی آیاتِ متفرقہ سے، معاشی تصورات کا جو مجموعہ نچوڑا ہے، اسے وہ کہیں ''قرآنی نظام'' اور کہیں ''قرآنی نظامِ معیشت'' اور کہیں ''نظامِ ربوبیت'' کہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہی وہ نظام ہے جو رسول اللہ ﷺ نے نافذ کیا تھا اور خلافتِ راشدہ میں بھی یہی نظام برقرار رہا تھا، آیئے، اس بات کا جائزہ لیں کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں کسقدر سچے ہیں، صدرِ اسلام کے بیشمار واقعات ہیں جو ''مفکرِ قرآن'' کے اس دعویٰ کے بطلان پر شاہدِ عدل ہیں، لیکن اگر ان واقعات کو، جو احادیث و آثار، اور تاریخ کے مستند مواد پر مشتمل ہیں، پیش کیا جائے تو پرویزی امت کے افراد، ان واقعات کو ردّ کرنے کے لیے، پرویز صاحب، کے رٹے رٹائے یہ الفاظ دہرادیں گے کہ:

> ''دین میں سند، نہ تاریخ کے مشمولات ہیں اور نہ مسلمانوں کے متواتر و متوارث عقائد و مسالک، سند ہے خدا کی کتاب۔'' [1]

اس لیے، اتمامِ حجت کے لیے، دعوائے پرویز کے جائزے کی بنیاد، صرف قرآن کریم اور کتبِ پرویز ہی پر رکھی جائے گی، کیونکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی جملہ کتب، قرآنی فکر ہی کی توضیح و تشریح پر مبنی ہیں، اور صدرِ اول کے صرف ان واقعات ہی کو اس جائزے میں لیا گیا ہے جو پرویز صاحب کی ''قرآنی بصیرت'' پر پورے اتر کر، ان کے لٹریچر میں درج ہو چکے ہیں۔

---

[1] نظامِ ربوبیت، صفحہ ۱۹۲

جائزے کی بنیاد اور کسوٹی:

لیکن سوال یہ ہے کہ جائزے کا معیار اور کسوٹی کیا ہوگی؟ جس کے مطابق یہ جانچ پڑتال کی جائے گی، یہ کسوٹی اور معیار بھی، پرویز صاحب ہی کا طے کردہ ہے، چنانچہ وہ اسلامی نظام معیشت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''قرآنی نظام میں، کسی کے پاس، نہ فاضلہ دولت رہتی ہے، اور نہ ہی اس کے استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے۔'' [1]

عہد نبوی میں قائم نظام معیشت کی ایک اہم خصوصیت، بقولِ پرویز صاحب یہ تھی کہ

''جو نظام، حضورؐ کے مقدس ہاتھوں قائم ہوا تھا، اس میں، ...... ، نہ کسی کے پاس فالتو درہم ہوتا تھا اور نہ ہی دینار۔'' [2]

فاضلہ دولت، عہد نبوی میں:

آیئے! ہم اس بات کا جائزہ لیں، کہ کیا واقعی، عہد رسالتمآبؐ میں، لوگوں کے پاس فاضلہ دولت نہ تھی؟ اور کیا واقعی ہر شخص، زائد از ضرورت مال سے دستکش تھا؟ اور کیا واقعی، فاضلہ دولت کے استعمال کا وہاں کوئی سوال نہ تھا؟ اور ہر فرد کا سب کی ملکیت، صرف رزقِ کفاف ہی کی حد تک محدود تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوی میں، ہمیشہ لوگوں کے پاس، ضرورت سے زائد دولت موجود رہی ہے، صحابہؓ میں تفاضل فی الرزق پایا جاتا تھا بعض صحابہؓ متمول اور صاحب ثروت تھے جبکہ بعض خستہ حال اور مفلس بھی تھے، خوشحال اور صاحب ثروت، اصحابِؓ رسولؐ، اپنی کل مکسوبہ دولت کے مالک تھے جس میں سے وہ اپنی ضریات زندگی بھی فراہم کرتے تھے، کاروبار میں بھی، اپنے فاضل سرمایہ کو صرف کرتے تھے، قرابتداروں کے حقوق کی ادائیگی بھی، وہ، اسی مال سے کرتے تھے، یہی زائد از ضرورت دولت، فی سبیل اللہ بھی خرچ ہوتی تھی، جس قدر ان کی مکسوبہ دولت بڑھتی تھی، اسی قدر، اس میں زکوٰۃ، صدقہ و خیرات، اور

---

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۶ء، صفحہ ۷ [2] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۸ء، صفحہ ۳۵

انفاق فی سبیل اللہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا، نکاح کی صورت میں، اپنی مالی حیثیت کے مطابق، بیویوں کو حق مہر بھی اسی فاضلہ آمدنی میں سے دیا جاتا تھا، اگر کوئی طالبِ قرض ہوتا، تو رضاءِ الٰہی کی خاطر، وہ قرض بھی اسی مال سے دیا جاتا تھا، اور اگر بتقاضائے بشریت، ایسی جنایت سرزد ہو جاتی جس میں مالی کفارہ عائد ہوتا ہے، تو یہ رقم بھی عفو المال ہی سے صرف ہوتی تھی، لوگوں کی گردنوں کو بندِ غلامی سے چھڑانے کے لیے زرِ مکاتبت بھی اسی زائد از ضرورت مالی اثاثوں میں سے ادا کیا جاتا تھا، مرنے کے بعد بھی، اگر کچھ دولت، باقی رہ جاتی تو وہ اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق، ورثاءِ میت کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی تھی، الغرض، مکسوبہ مال میں سے زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کا دیا جانا، بیویوں کو حق مہر ادا کرنا، طالبِ قرض کو قرض دینا، غلاموں کی غلامی سے رہائی کے لیے دولت کا خرچ کرنا، جنایات کے ارتکاب کی صورت میں مالی کفارے ادا کرنا، اور قانونِ میراث کی رو سے، میت کی مملوکہ دولت کا، اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جانا، یہ سب کچھ اسی ماحول اور معاشرہ میں ممکن ہے جہاں ملکیتِ مال کا حق رائج ہو، اور افراد کاسبین کے پاس، زائد از ضرورت دولت موجود ہو، اور لاریب، عہد نبوی کے معاشرہ میں، یہی فضاء پائی جاتی تھی، اگر حضور اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں، قائم فرمودہ ریاست کا رویّہ یہ ہوتا کہ لوگوں کے پاس، زائد از ضرورت مال رہنے ہی نہ دیا جاتا، تو نہ لوگ، کسی پر صدقہ و خیرات کرتے، نہ قرض دیتے، نہ بیویوں کو حق مہر دیتے، نہ آزادیٔ غلاماں کے لیے اپنی دولت صرف کرتے، اور اخلاقی فضائل، مثل سخاوت و فیاضی، ایثار و قربانی، ہمدردی و غمگساری وغیرہ کے سوتے خشک ہو کر رہ جاتے، پھر قرآن مجید کے اندر، ان احکام و ہدایات کا پایا جانا، خود، اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ملکیتِ مال و دولت، ایک طے شدہ قرآنی پالیسی ہے، خود پرویز صاحب، مختلف مقامات پر رقمطراز ہیں:

”اشتراکیت کے اصولِ نفیٔ املاک سے، اسلام کا معاشی، تمدنی اور عمرانی ہر قسم کا نظام منہدم ہو جاتا ہے، قرآن میں ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْراً

(۱۷/۲۶)

''قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا اور محتاج اور مسافر کو بھی، اور مال کو بے موقع فضول خرچی میں نہ اڑانا۔''

ظاہر ہے کہ ان حقوق کی ادیگی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کوئی چیز کسی کی ملکیت ہو، اگر ہر چیز غیر کی ملکیت ہو، اور کمانے والے کو صرف، اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے، تو وہ دوسروں کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے۔

یہی حال، ترکہ و وراثت کے احکام کا ہے جس پر ذاتی ملکیت کی عدم موجودگی میں، عمل ہو ہی نہیں سکتا، حکم ہے،

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ (۴/۳۳)

''اور ہر ایسے مال کے لیے جسے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، ہم نے وارث مقرر کر دیئے، اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں، ان کو ان کا حصہ دو۔''

دوسری جگہ ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِیْباً مَّفْرُوْضاً

''مردوں کے لیے حصہ ہے اس چیز میں سے جسکو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے، اس چیز میں جسے ماں باپ اور قرابتدار چھوڑ جائیں، وہ چیز تھوڑی ہو یا بہت، حصہ قطعی ہے۔'' [1]

''غلاموں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ جب چاہیں، اپنے مالکوں سے زرِ فدیہ طے

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۸

کرلیں، اس طے شدہ رقم کو، وہ اپنی کمائی سے جمع کریں یا مخیّر لوگوں سے بطور قرض یا احساناً لیکر مالک کو ادا کر دیں، اور اس طرح آزاد ہو جائیں، اسے مکاتبت کہتے ہیں خود مالک سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ ان کے زیرِ مکاتبت میں چندہ دے۔''[۱]

تحریر رقبہ کی یہ صورتحال، اسی معاشرہ میں موجود ہوسکتی ہے جس میں ذاتی ملکیت کا اصول کارفرما ہو، یا جس میں مال کی طرح، غلام بھی ضرورت سے زائد موجود ہوں تا کہ ان میں سے کسی کو احساناً یا کفّارۃً آزاد کیا جا سکے، یا جس میں فاضلہ دولت موجود ہو جس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جا سکے، یا ان کی آزادی میں مالی معاونت کی جا سکے، اگر کسی معاشرہ میں، افراد کے پاس فاضلہ دولت موجود ہی نہ ہو، تو احساناً یا بطور قرض، رقم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا، نیز زیرِ مکاتبت، غلام کی مدد بھی، اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ زائد ازضرورت دولت موجود ہو، پرویز صاحب، ایک مقام پر، اسلام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اس نے لوگوں کو ترغیب وتحریض دلائی کہ وہ غلاموں کو آزاد کرتے رہیں، اس کے لیے، اس نے تحریرِ رقبہ کو مختلف خطاؤں اور لغزشوں کا کفّارہ قرار دیا مثلاً قتل خطا، قسم کھانا، ظہار وغیرہ۔''[۲]

چنانچہ اسلام کی تحریر رقبہ کی ترغیب وتحریک کا یہ نتیجہ تھا کہ متموّل اور خوشحال صحابہؓ کی دولتیں، آزادئ غلاماں پر صرف ہونے لگیں، حضرت عائشہؓ نے انہتر (۶۹) غلام آزاد کیے، حضرت حکیم بن حزامؓ نے، سو غلام زمانۂ جاہلیت میں اور سو غلام زمانہ اسلام میں آزاد کیے، حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں، بیس غلاموں کو آزادی ملی، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے، جو نہایت خوشحال اور صاحب ثروت صحابی تھے، تیس ہزار کے لگ بھگ غلام آزاد کیے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار، حضرت ذوالکلاحؓ نے آٹھ سو، اور حضرت عباسؓ نے ستر غلام آزاد کیے، اگرچہ حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد کہیں سے مل نہ سکی، مگر یہ

---

[۱] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۰۷ [۲] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۰۶

ثابت ہے کہ انہوں نے کثیر التعداد غلاموں کو دولتِ حریت سے نوازا، بلالؓ بن رباح، عامرؓ بن فہیر، ابو فکیہہؓ، زنیرہؓ، لبینہؓ، نہدیہؓ، ام عُبَیس وغیرھم، کئی غلام اور لونڈیاں، ان ہی کے ہاتھوں آزاد ہوئے تھے، حضرت عثمانؓ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر جمعہ کو، ایک غلام آزاد کیا کرتے تھے، خود نبی اکرم ﷺ نے بہت سے غلاموں کو آزادی بخشی، حضرت زیدؓ بن حارثہ، ثوبانؓ، ابو رافعؓ، سلمانؓ فارسی، ابو کبشہؓ، یسارؓ اور رویفعؓ وغیرھم، آپؐ ہی کے دستِ مبارک سے نعمت حریت پائے ہوئے تھے، ان صحابہؓ کے علاوہ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت زبیرؓ وغیرھم نے بھی بکثرت غلاموں کو آزادی بخشی تھی۔

ظاہر ہے کہ افراد صحابہؓ میں آزادیٔ غلاماں کی یہ تحریک، اسی بناء پر رواں دواں تھی کہ ان کے معاشرے میں ذاتی ملکیت کا اصول رائج تھا اور صحابہؓ کے پاس، زائد از ضرورت، دولت بھی موجود تھی، جس کا ایک مصرف، آزادیٔ غلاماں بھی تھا۔

عہد نبوی میں ذاتی ملکیت پر دالّہ واقعات:

علاوہ ازیں، مال و دولت کی شخصی ملکیت کے آئینہ دار بہت سے واقعات خود عہد رسالتماب میں موجود ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

ا۔ کعب ابن مالک کا واقعہ:

حضرت کعبؓ بن مالک کے ساتھ، غزوۂ تبوک میں، بر بنائے تخلّف، جو کچھ پیش آیا، اسے پرویز صاحب نے بایں الفاظ پیش کیا ہے:

> ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا تو حضورؐ نے فرمایا ''اے کعب! مبارک ہو، آج کا دن تیرے لیے سب سے مبارک ہے'' میں نے کہا ''یا رسول اللہ! یہ آپؐ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟'' فرمایا ''خدا کی جانب سے'' میں نے فرطِ مسرت میں عرض کیا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ خدا کے اس احسان کے شکریہ میں، اپنا سب کچھ صدقہ کر دوں''، حضورؐ نے فرمایا ''کچھ اپنے لیے بھی

رکھ لو۔"[۱]

اس واقعہ میں چند امور بدیہی طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔

(الف) حضرت کعبؓ بن مالک، کے پاس اپنی ضروریات سے فزوں تر مال موجود تھا۔

(ب) اسلامی ریاست، جس کے "مرکز ملت" اس وقت، خود نبی اکرم ﷺ تھے، رعایا کی تمام مکسوبہ دولت، اُن سے اخذ نہیں کیا کرتی تھی، حالانکہ کعب اپنا سب کچھ صدقہ کرنے پر آمادہ تھے۔

(ج) غزوۂ تبوک سے تقریباً سات سال قبل، قُلِ العَفْوَ کا حکم نازل ہو چکا تھا، لیکن پھر آپؐ نے، اُن کے عفو المال سے تعرض نہیں کیا، اس کے باوجود، کہ بقولِ پرویز صاحب، "مرکز ملت" کی حیثیت سے آپؐ خُذِ العَفْوَ کے حکم کی تعمیل پر مامور و مکلّف تھے، اور اس کے باوجود بھی، کہ کعبؓ بن مالک، خود، اپنا سب کچھ بطور صدقہ دینا چاہتے تھے، لیکن آپؐ نے، انہیں "کچھ اپنے لیے رکھ لینے" کی تاکید فرمائی۔

(د) سب کا سب عفو المال، "مرکز ملت" کے حوالے کر ڈالنا، حضور اکرم ﷺ کی قائم کردہ ریاست کا کوئی قانونی اور آئینی تقاضا نہ تھا، بلکہ ایک رضا کارانہ فعل تھا، ورنہ اگر یہ کوئی قانونی تقاضا ہوتا، تو کعب بن مالک کے پاس سرے سے یہ دولت، موجود ہی نہ ہوتی، اور نہ ہی وہ کل مال کے صدقہ کر ڈالنے کا کوئی امکان پاتے۔

۲۔ تقسیم غنائم:

عہد نبوی، اور خلافت راشدہ میں، اموالِ غنیمت، ہمیشہ تقسیم ہو کر، افراد کی ذاتی ملکیت میں اضافہ کا موجب بنتے رہے ہیں کیونکہ مالِ غنیمت، ان کا واحد ذریعۂ آمدنی نہ تھا، پرویز صاحب تقسیم غنائم کے قانون کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

"اور جان رکھو، جو مال تمہیں مالِ غنیمت میں ملے، اس کا پانچواں حصہ، اللہ کے لیے، رسول کے لیے، (رسول کے) قرابتداروں کے لیے، یتیموں کے

---

[۱] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ۵۹۱ + معراج انسانیت، صفحہ۲۹۶

لیے، مسکینوں کے لیے، اور مسافروں کے لیے نکالنا چاہیے (اور بقیہ چار حصے، مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جا سکتے ہیں)، اور اگر تم، اللہ اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو، جو ہم نے فیصلہ کر دینے والے دن، اپنے بندے پر نازل کی تھی، جبکہ دو لشکر، ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے، تو چاہیے کہ اس تقسیم پر کاربند رہو، اور یاد رکھو، اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں۔

اور یہ خمس (پانچواں حصہ)، اللہ اور رسول کے لیے تھا، اس خمس کی تفصیل مصارف سے ظاہر ہے کہ یہ حصہ بیت المال میں جائے گا، اور وہاں سے ان اجتماعی امور میں صرف ہوگا جنکی ذمہ داری، حکومت پر عائد ہوتی ہے، ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد، مسلمانوں کا امام ہے۔'' [1]

اسی صفحہ پر نیچے حاشیہ میں، یہ عبارت بھی موجود ہے:

''غنیمت اور فے، دو اصطلاحات ہیں، مالِ غنیمت، وہ، جو مخالفین سے جنگ کے بعد، حاصل ہو، اور مالِ فے، وہ جسے مخالفین، جنگ کیے بغیر چھوڑ جائیں، مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ، بیت المال میں جمع ہوگا، اور باقی چار حصے، سپاہیوں میں تقسیم ہوں گے، مالِ فے، پورے کا پورا بیت المال میں جمع ہوگا۔'' [2]

کل مالِ غنیمت کے چار خمس (۴/۵) کی تقسیم، بجائے خود شخصی ملکیت کی دلیل ہے، غنائم کی یہ نبوی تقسیم اور قانونِ تقسیمِ غنیمت کا وجود، پرویز صاحب کے اس تصور کا واضح بطلان ہے جس کے مطابق، وہ کہا کرتے تھے کہ:

''قرآنی نظام میں، کسی کے پاس، نہ فاضلہ دولت رہتی ہے، نہ اس کے استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے۔'' [3]

عہدِ رسالتمآبؐ میں اور خلافتِ راشدہ میں، قرآنی قانونِ غنیمت کے مطابق، اموالِ غنیمت، مجاہدین میں تقسیم ہوا کرتے تھے۔

---

[1] + [2] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۶۲۴ — [3] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۶ء، صفحہ ۷

''رسول اللہ، اور خلافتِ صدیقی میں، قانون یہ تھا کہ مالِ غنیمت، مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔'' [۱]

''عربوں کے ہاں مالِ غنیمت، بہت بڑا ذریعۂ آمدنی تھا، اور ان کے معاشرہ کا رواج یہ تھا کہ جنگ میں، جو کچھ، کوئی، دشمن کا لوٹ لے، وہ اسی کا ہو جاتا تھا، قرآن کریم نے اس میں بھی اصلاح کی، اور کہا کہ مالِ غنیمت، انفرادی ملکیت نہیں ہوگا، اسے مرکز میں جمع کرنا ہوگا، مرکز اس میں سے ایک حصۂ اجتماعی ضروریات کے لیے الگ کر کے، باقی مال سپاہیوں میں تقسیم کرے گا۔ (۸/۴۱)'' [۲]

پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ صدر اسلام میں، جب تک باقاعدہ فوج کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا، ہر مجاہد فوجی تھا، وہ خود اپنی روزی کماتا تھا، اور ضرورت کے وقت، اسلامی سلطنت کا دفاع کیا کرتا تھا، مالِ غنیمت میں، جو کچھ پاتا تھا وہ اس کی مکسوبہ دولت پر اضافی مال تھا جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے۔

''قرونِ اولیٰ میں، مملکت کا ہر مسلمان سپاہی ہوتا تھا، جنگ کا نقارہ بجتے ہی، وہ شمشیر بکف، میدان میں پہنچ جاتا تھا، اور جنگ ختم ہوتے ہی، ایک عام شہری کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا، اور ملک کی پیداوار بڑھانے میں، برابر کا شریک ہوتا تھا، موجودہ دور کی طرح نہیں کہ ملک کی آمدنی کا بیشتر حصہ، تو ان پر خرچ ہو، لیکن ملک کی پیداوار میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔'' [۳]

الغرض، مالِ غنیمت کا تقسیم ہو کر، سپاہِ مجاہدین کی ملکیت میں آنا، اور ان کی مکسوبہ دولت میں اضافہ کرنا، بجائے خود عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں ذاتی ملکیت کی کھلی دلیل ہے۔

صحابہ میں تفاوت فی الرزق:

پرویز صاحب کے نزدیک...... صحابہؓ کے معاشرہ میں، نہ کسی فردِ مسلم کو، زائد از

---

[۱] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۷۹ [۲] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۳۳۹

[۳] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۷۰

ضرورت مال رکھنے کی اجازت تھی، اور نہ ہی ان کے پاس، حدّ حاجت سے بڑھ کر، مال موجود تھا، حضور اکرم ﷺ، خذا العفو کے حکم کے تحت، تمام افراد کا عفو المال، بیت المال میں ذخیرہ کرلیا کرتے تھے، اور لوگوں کے پاس، ضرورت کی حد تک ہی مال و دولت رہا کرتا تھا...... لیکن یہ حقیقتِ حال کی قطعی غلط تعبیر ہے، صحابہؓ کرام کے معاشرہ میں، تفاضل فی الرزق، موجود تھا، جو قرآنی منشا...... وَاللهُ فَضَّلَ بَعْضَكُم عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ...... کا منطقی تقاضا تھا، ان میں، امیر و غریب، خوشحال و خستہ حال، متمول اور مفلس غنی و فقیر، صاحب ثروت اور مفلوک الحال، ہر طرح کے افراد موجود تھے، خود پرویز صاحب نے بھی، صحابہؓ کے ہاں تفاوت فی الرزق کا اعتراف کیا ہے۔

> ''مالی تفوق کے اعتبار سے، خود دورِ صحابہؓ میں مختلف طبقات موجود تھے، حضرت زبیر بن عوام کے کاروبار میں، ایک ہزار مزدور روزانہ کام کرتے تھے، حضرت طلحہ کی روزانہ آمدنی کا اوسط، ایک ہزار دینار تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ ایک باران کا قافلہ، مدینہ آیا، تو اس میں سات سو اونٹوں پر صرف اشیاءِ خوردنی لد رہی تھیں، لیکن مسلمانوں میں ان ہستیوں کا نام، اگر آج تک سلام وصلوٰۃ کے ساتھ لیا جاتا ہے تو اس کی وجہ ان کی دولت و ثروت نہیں بلکہ ان کا وہ ایمان، تقویٰ، اعمال صالحہ، ایثار و قربانی ہیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے انہوں نے، نمونہ کے طور پر یادگار چھوڑا ہے، انہی متمول صحابۂ کبار کے ساتھ ساتھ، اصحاب صفہ جیسے مفلوک الحال حضرات کا نام بھی آج تک مسلمانوں کے لیے باعثِ افزائشِ ایمان و عمل ہے۔'' [1]

لیکن، جب پرویز صاحب کا دل و دماغ، اشتراکیت کے رنگ میں رنگا گیا، تو اِن ہی خوشحال اور صاحب ثروت صحابہؓ کا تذکرہ، ان کے لیے سوہانِ روح بن گیا، اور پھر لگے وہ ملاّ کو کوسنے، جس کی زباں پر کبھی ان صحابہ کی خوشحالی کا ذکر آ گیا، اور یہ فتویٰ داغ دیا کہ یہ

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۹

سب واقعات، ملوکیت اور سرمایہ داری کے دور کی پیداوار ہیں۔

''......لیکن ہمارا مُلّاً، رسول اللہ کی اس سنت کی طرف، کبھی توجہ نہیں دلاتا، وہ صرف یہی بتاتا ہے کہ میٹھا کھانا سنت ہے، یا اس قسم کی روایات بیان کرتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے پاس اتنے لاکھ دینار تھے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس، مال و متاع کے لدے ہوئے اتنے اونٹ تھے ...... کتب روایات میں ان بزرگوں کی طرف، جس قدر ایسے واقعات منسوب کیے گئے ہیں، جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہیں، وہ سب وضعی ہیں، اور ملوکیت اور سرمایہ داری دور کی پیداوار ہیں۔'' [1]

جس چیز کو، پرویز صاحب، ''خلافِ قرآن'' کہتے ہیں، وہ فی الوقعہ خلافِ قرآن نہیں ہوتی، بلکہ صرف، اس مفہوم کے خلاف ہوتی ہے، جسے وہ خود، قرآن کے گلے مڑھ دیتے ہیں، اور چونکہ ان کے ذہنی خیالات اور دماغی تصورات بدلتے رہتے ہیں، اس لیے، ایک وقت میں، مخصوص نظریات کے تحت، وہ جس چیز کو ''مطابق قرآن'' قرار دیا کرتے ہیں، دوسرے وقت میں، ان نظریات کے بدلتے ہی، وہی چیز، ''خلافِ قرآن'' قرار پا جاتی ہے، جب وہ، اشتراکیت پر ایمان نہیں لائے تھے، تو ذاتی ملکیت، اور اس کی اساس پر تفاضل فی الرزق مطابقِ قرآن تھا، لیکن اشتراکیت کا بپتسمہ پاتے ہی ذاتی ملکیت ناجائز، اور صحابہؓ کا وہی تفاضل فی الرزق، جو ۱۹۳۹ء میں ''موافقِ قرآن'' تھا، اب ان واقعات میں سے قرار پا گیا جو دور ملوکیت اور عہد سرمایہ داری میں وضع ہوئے تھے۔

بہرحال، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، بات یہ ہو رہی تھی کہ صدر اسلام میں، صحابہؓ کرام کے معاشرہ میں، ذاتی ملکیت کا اصول اور پھر تفاضل فی الرزق موجود تھا، اور معاشی تفاوت کے باوجود، ان کا معاشرہ طبقاتی نزاع سے بالاتر تھا، وحی پر قائم، اُس سماج میں، وہ طبقاتی تصادم قطعاً موجود نہ تھا جسے آج کل ''امیر غریب کی جنگ'' کہا جاتا ہے، اس لیے کہ

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۶۹

خوشحال اور متمول صحابہ، دولتِ زر سے کہیں زیادہ، دولتِ ایمان سے بہرہ ور تھے جس کی بدولت ، وہ ، حب مال کی پیدا کردہ برائیوں سے پاک تھے، بلکہ ایمان کی بدولت ، وہ ، فیاضی وسخاوت ، ہمدردی وغمگساری ، اور ایثار وقربانی جیسے اخلاقی فضائل سے آراستہ تھے، دوسری طرف مفلس اور مفلوک الحال صحابہ کا یہ حال تھا کہ ان کے ایمان نے ، ان کے دلوں کو، نہ صرف یہ کہ، اغنیاء کے خلاف، حسد، بغض، کڑھن اور جلن جیسے عیوب سے پاک کر دیا تھا، بلکہ ان میں، خودداری، غیرت اور قناعت واستغناء جیسے اخلاقی فضائل کو بھی مستحکم کر رکھا تھا، بقول اقبال:

گدائی میں بھی، وہ، اللہ والے، تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی اور دور صحابہؓ میں ، ذاتی ملکیت کے اصول کے رواج پذیر ہونے ، اور افراد کی انفرادی فاضلہ دولت کے باوجود، سماجی استحکام ، معاشرتی وابستگی ، اور اجتماعی یکجہتی ، اس قدر عروج پر تھی کہ چشم فلک نے کبھی، اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

ظاہر ہے کہ مالی تفوق کی اس فضاء میں، ضرورتوں کا دباؤ، قرض کے لین دین کے عمل کو مستلزم ہے، اور یہ عمل، اسی ماحول میں ممکن الوقوع ہے جس میں، نہ صرف یہ کہ، شخصی ملکیت کا اصول رائج ہو بلکہ لوگوں کے پاس فاضلہ دولت بھی موجود ہو، صحابہؓ میں باہم لین دین کا، سلسلہ جاری تھا، البتہ اگر کوئی (مقروض) شخص، اس حال میں مرجاتا کہ اس کے ذمہ، کسی کا قرض، واجب الاداء رہ جاتا ، تو اس صورت میں، بیت المال ، اس قرض کی ادائیگی کا ذمہ دار قرار پاتا۔

''اگر کوئی شخص ، ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو، اور وہ تنگدستی کی وجہ سے ، اس قرض کو ادا نہ کر سکا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہوگی ، حضورؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ:

میں مسلمانوں سے، ان کے اپنے افراد کی نسبت ، زیادہ قریب ہوں، سو ان میں

سے، جو مقروض وفات پا جائے، تو اس کے قرض کی ادائیگی، میرے ذمہ ہے
(ابو عبید، کتاب الاموال)'' [۱]

الغرض، یہ مالی لین دین اور قرض و اقراض کے معاملات، بجائے خود، انفرادی ملکیتِ مال اور تفاضل فی الرزق کی واضح دلیل ہیں۔

ایسے واقعات کو کوئی کہاں تک بیان کرے، ان میں سے ہر واقعہ، افراد کی نجی ملکیتِ مال اور فاضلہ دولت کی موجودگی پر دال ہے، اور لوگوں میں تفاضل فی المال اور تفاوت فی الرزق پر شاہد عدل ہے، قتل میں ادائیگیٔ دیت کا معاملہ ہو، یا میت کے ترکہ کی تقسیم کا، کفارۂ گناہ میں تحریر رقبہ کا مسئلہ ہو، یا مکاتبت کے ضمن میں زرتعاون دینے کا، قرض کے لین دین کی صورت حال ہو یا قرض کو بالکل معاف کر دینے کی شکل ہو، مجاہدین میں تقسیم غنائم کا سوال ہو، یا بصورتِ نکاح، ادائیگیٔ حق مہر کا، یہ سب امور فی الواقعہ، عہد رسالتماب (والذین معه) کے سنہری دور میں، فاضلہ دولت کی ذاتی ملکیت اور تفاضل فی المال کے ناقابل تردید ثبوت ہیں، ان تمام ٹھوس واقعات کی موجودگی میں، آخر ''مفکر قرآن'' کی یہ بے پرکی بات کیسے مان لی جائے کہ

''جو نظام، حضورؐ کے مقدس ہاتھوں قائم ہوا تھا، اس میں ...... نہ کسی کے پاس فالتو درہم ہوتا تھا، نہ دینار۔'' [۲]

اگر واقعتاً، حضورؐ کے مقدس ہاتھوں، قائم ہونے والے نظام میں، کسی کے پاس فالتو درہم و دینار نہ تھے، تو ہر جنگ کے موقع پر، صحابہؓ نے دفاع کے لیے، بڑی بڑی رقوم، جو بطور چندہ پیش کیں، وہ کہاں سے آ گئیں؟ کیا یہ ساری پونجی، معاذ اللہ، راہزنی اور ڈکیتی کی وارداتوں سے فراہم ہوئی تھی؟ غزوہ تبوک میں، صحابہؓ کی طرف سے، جو خطیر رقوم پیش کی گئیں، وہ آخر، انہوں نے، کس بینک پر ڈاکہ ڈال کر حاصل کی تھیں؟ اس جنگ میں، صحابہؓ کے فراخدلانہ مالی اعانات کا ذکر، خود پرویز صاحب، نے بایں الفاظ کیا ہے۔

---

[۱] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۸ [۲] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۸ء، صفحہ ۳۵

''یہ معرکہ، اخلاص و منافقت کی امتحان گاہ تھا، چنانچہ ایک طرف صحابہؓ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا، لے کر حاضر ہو گیا، حضرت عثمانؓ نے نو سو (۹۰۰) اونٹ، ایک سو گھوڑے، اور ایک ہزار دینار پیش کیے، حضرت ابو بکرؓ صدیق، اپنے گھر میں، اللہ اور رسول کی محبت کے سوا، کچھ بھی چھوڑ کر نہ آئے، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے چالیس ہزار درہم دیئے، حضرت عمرؓ، کئی ہزار کا نقد و جنس لے کر حاضر ہوئے، حضرت ابو عقیلؓ انصاری نے دو سیر چھوہارے لا کر دیئے، اور عرض کیا کہ رات بھر، کسی کے کھیت پر، مزدوری کر کے، چار سیر چھوہارے حاصل کیے، دو سیر بال بچوں کو دے آیا ہوں، اور دو سیر خدمت اقدس میں حاضر ہیں۔''[۱]

اس سے ہر شخص، اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ شخص، کس قدر جھوٹا ہے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں رائج معاشی نظام میں، نہ کسی کے پاس فالتو درہم ہوتا تھا اور نہ دینار، لوگوں کے پاس، صرف ضرورت کی حد تک مال محدود ہوتا تھا۔'' واقعہ یہ ہے کہ طلوع اسلام کی ٹکسال پر ڈھلنے والا، وہ کھوٹا سکہ، جسے ''نظام ربوبیت'' کا نام دیا گیا ہے، عہد نبوی میں، اپنا کوئی وجود نہ رکھتا تھا، وہاں خود، قرآن کریم کی روشنی میں، ایسا معاشی نظام رائج تھا، جس میں افراد کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل تھا، اور مال و دولت، زمین اور دیگر وسائلِ پیداوار، لوگوں کی انفرادی ملکیت میں موجود رہتے تھے، وہ اپنی مکسوبہ دولت کے آپ مالک تھے، جس میں سے وہ، ہر کارِ خیر میں انفاق کیا کرتے تھے، اور نخلِ اسلام کی آبیاری میں، بڑی فیاضی کے ساتھ، آب زر صرف کیا کرتے تھے، جیسا کہ خود، پرویز صاحب کا اقتباسِ بالا ظاہر کرتا ہے۔

چونکہ خدا کی راہ میں، صحابہؓ کے یہ فیاضانہ اخراجات، ان کی ذاتی ملکیتِ مال اور ان کے باہمی تفاضل فی الرزق پر دلالت کرتے ہیں، اس لیے، ''نظام ربوبیت'' کی راہ ہموار

---

[۱] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۵۸۰

کرتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' صاحب نے، یہ مناسب سمجھا کہ ان ''سرمایہ دارانہ اخراجات'' کا ذکر، نہ ہی کیا جائے، اس لیے معارف القرآن جلد چہارم کو، جب ''معراج انسانیت'' کے نام سے پیش کیا گیا، تو صحابہ کرامؓ کے اخلاص وایمان، اور ایثار وقربانی کے تفصیلی تذکرہ کو مکمل طور پر حذف کر دیا گیا، اور اقتباس بالا کا صرف یہ ابتدائی جملہ برقرار رکھا گیا کہ

''یہ معرکہ، اخلاص ومنافقت کی امتحان گاہ تھا، چنانچہ ایک طرف صحابہؓ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا، لیکر حاضر ہوگیا۔''[1]

پرویز کی فضاءِ دماغ میں اُٹھنے والی ہر لہر کے ساتھ، یوں حقائق میں تبدیلی واقع ہو جایا کرتی تھی، اور پھر وہ مطمئن ہو جایا کرتے تھے، کہ مسخِ واقعات سے ہماری تاریخ ''مطابق قرآن'' ہوگئی ہے۔

☆..........☆..........☆

[1] معراجِ انسانیت، صفحہ ۲۹۲

باب نہم

کیا خلافت راشدہ میں فاضلہ دولت کا وجود نہیں تھا؟

(الف) عہد صدیقی اور فاضلہ دولت کا وجود:

حقیقت یہ ہے کہ عہد صدیقی میں بھی، وہی معاشی اصول وضوابط کارفرما تھے، جو عہد نبوی میں نفاذ پذیر ہوئے تھے، جس طرح عہد رسالتماب میں ذاتی ملکیتِ زمین و زر کا اصول موجود تھا بالکل اسی طرح، عہد صدیقی میں بھی یہ اصول برقرار رہا، جس طرح عہد نبوی میں، معاشی تفاوت کی بناء پر، اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کر کے، خستہ حال لوگوں کی طرف لوٹائی جاتی تھی بالکل اسی طرح خلیفۂ اول کے دور میں بھی، یہ سلسلہ قائم رہا، حضرت ابوبکرؓ صدیق نے معاشی پالیسی ہی نہیں، بلکہ کسی بھی پالیسی میں، سرمو بھی انحراف یا تجاوز نہیں کیا تھا، جیسا کہ خود، پرویز صاحب، نے لکھا ہے:

> ''حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضورؐ کے خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ میں سنتِ رسول کا اتباع کروں گا۔'' [1]

خلیفۂ اول، ہر شعبۂ زندگی میں، حضور اکرمؐ کے طابق النعل بالنعل پیروکار تھے، ان کا مختصر سا عہد حکومت، نبی آخر الزماںؐ، ہی کی پالیسیوں کے تسلسل کا دور تھا، جس میں وہ خود بھی عامۃ الناس کے ساتھ، اضافی مال و دولت (بصورت زمین یا بشکلِ زر) کے مالک تھے، درج ذیل اقتباس، اس کی دلیل ہے۔

> ''حضرت ابوبکرؓ، منصب خلافت پر سرفراز ہونے سے پہلے، کپڑے کا کاروبار کرتے تھے، اور خاصے مرفہ الحال تھے، خلیفہ منتخب ہونے کے دوسرے دن،

---

[1] طلوع اسلام، مئی ۱۹۸۶ء، صفحہ ۵۹۔

حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ کپڑے کا گٹھا اٹھائے بازار کی طرف جا رہے ہیں، انہوں نے پوچھا ''آپ کدھر جا رہے ہیں؟'' جواب دیا کہ ''اپنے کام پر۔'' انہوں نے کہا کہ ''خلافت کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد، آپ کا وقت، آپ کا نہیں رہا، ملت کا ہوگیا ہے، اس لیے، آپ اسے ذاتی کام کے لیے نہیں صرف کر سکتے۔'' انہوں نے کہا کہ ''ایسا نہ کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟'' حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کا انتظام کرنا، امت کے ذمّے ہے''، چنانچہ سوال درپیش ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ یعنی حق الخدمت کیا ہونا چاہیے؟ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا کہ ''اسے میں خود اپنے لیے مقرر کروں گا'' چنانچہ آپ نے معلوم کیا کہ مدینہ میں ایک عام مزدور کی یومیہ اجرت کیا ہے؟ اس کے مطابق، آپ نے اپنا وظیفہ مقرر کیا، دوسری روایت میں ہے کہ اسے دیگر صحابہؓ نے مقرر کیا تھا اور معیار تھا قریش کے معمولی فرد کا معیار زندگی۔ کچھ بھی تھا، جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا، تو آپ نے اپنے اعزّہ سے کہا کہ ''میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے...... ہے، اس کے مطابق، ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں کہ نہیں، اس کے متعلق قیامت میں باز پرس ہوگی، میں چاہتا ہوں کہ اس کا حساب یہیں چکا دیا جائے، ایک مختصر سا قطعۂ زمین میرے پاس ہے، اسے فروخت کر دیا جائے، جسقدر رقم، میں نے بیت المال سے لی ہے، اسے واپس کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''[1]

اس اقتباس سے چند باتیں بالکل واضح ہیں۔

اولاً یہ کہ...... خلافت سے قبل، ابوبکرؓ کا ذریعہ معاش، پیشۂ بزازی تھا، جس کے باعث، وہ ''خاصے مرفہ الحال تھے''، جس کا معنیٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی دولت، ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی، یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ عہد نبوی میں، اسلامی حکومت، جس

[1] طلوع اسلام، جون ۱۹۸۱ء، صفحہ ۲۳ تا ۲۴

کے سربراہ خود، رسول اللہ تھے، لوگوں کے جملہ اموالِ مکسوبہ کو، اپنی تحویل میں لے کر، انہیں بقدر کفاف نہیں دیا کرتی تھی، بلکہ لوگ آزادانہ تجارت کرتے تھے، اور اپنی کمائی کے آپ مالک تھے، اسی بناء پر، وہ، خوشحال اور مرفہ الحال تھے۔

ثانیاً یہ کہ...... اجرت کا تعین، حکومت نہیں کیا کرتی تھی، بلکہ حکومت کی مداخلت کے بغیر، اہل معاملہ (آجر اور اجیر) خود، آزادانہ طور پر کیا کرتے تھے، اگر یہ کام، اس وقت کے ''مرکز ملت'' (رسول اللہ) نے طے کیا ہوتا، تو ابوبکرؓ، (جو سایہ کی طرح، حضورؐ کے ساتھ رہا کرتے تھے) سے مخفی نہ رہتا اور اگر خود ابوبکرؓ ہی نے طے کیا ہوتا، تو وہ عام مزدور کی یومیہ اجرت، دریافت کرنے کی زحمت نہ فرماتے، یہ صورتحال، صریح طور پر انفرادی ملکیت ہی کے معاشرہ میں پائی جا سکتی ہے، نہ کہ اس نام نہاد ''نظام ربوبیت'' میں، جسے ایک یہودی نژاد مفکر کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، ہندی نژاد سامری نے، از خود تراشا ہے، اور پھر اس کے نفاذ کو، بہتاناً، رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

ثالثاً یہ کہ...... اس وقت بھی معاشرہ میں معاشی تفاضل کی کیفیت موجود تھی، لیکن خلیفہ اول نے اپنے تقویٰ و تدین، اور خوفِ خدا کی بنیاد پر، اپنے حق الخدمت کا تعین، کسی اعلیٰ معیارِ زندگی کے حامل فرد کو سامنے رکھتے ہوئے نہیں کیا بلکہ، ایک عام مزدور کی اجرت کے مطابق کیا ہے، افراد معاشرہ میں باہمی تفاوت و تفاضل کی یہ صورت، اسی معاشرے ہی میں پائی جا سکتی ہے، جس میں ذاتی ملکیت کا اصول رائج ہو۔

رابعاً یہ کہ...... خود، ابوبکرؓ کی ذاتی ملکیت میں، بیت المال کی طرف سے ملنے والے، وظیفہ کے علاوہ بھی، ایک قطعۂ زمین موجود تھا، جو خود رسول اللہ کا عطا فرمودہ تھا، یہ زمین بھی، اس آمدنی کے علاوہ تھی، جو بار خلافت سنبھالنے سے قبل، کپڑے کے کاروبار سے انہیں حاصل ہوا کرتی تھی، لیکن پرویز صاحب کے مزعومہ ''قرآنی نظام'' میں، تو، زائد از ضرورت دولت کے رکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ:

''قرآنی نظام میں، ناجائز دولت تو ایک طرف، اپنی ضرورت سے زائد جائز

دولت رکھنے کی بھی اجازت نہیں۔'' [۱]

خامساً یہ کہ .... زمین کی یہ فروختگی بھی، نجی ملکیت کا ایک واضح ثبوت ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب کا یہ فرمان ہے کہ

''زمین کے متعلق خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خدا کی ملکیت ہے، اس لیے، کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کو، اس کا حق نہیں ہے کہ اسے اپنی ذاتی ملکیت میں لے لے۔'' [۲]

کچھ سمجھے آپ، کہ، اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ ابوبکرؓ، خدا کے اس فیصلے کے خلاف، زمین کو اپنی ذاتی ملکیت میں رکھتے ہوئے، نہ صرف یہ کہ، مرتے دم تک، خدا کی نافرمانی کرتے رہے، بلکہ کفر و شرک کا ارتکاب بھی، کیونکہ ''مفکر قرآن'' کے نزدیک:

''قرآن کریم کی رو سے، زمین (وسائل پیداوار) پر، ذاتی ملکیت کا تصور ہی باطل اور شرک کے مترادف ہے۔'' [۳]

غور فرمایئے، رسول خدا ﷺ کا وہ یار غار، جس نے غزوۂ تبوک میں، سب کچھ لا کر، حضورؐ کے قدموں پر رکھ دیا، جو، قبول اسلام میں اَسْبَقُ السَّابِقِیْنَ الْاَوَّلِیْنَ تھا، اور جسکی مساعیٔ جمیلہ سے، دیگر متعدد صحابہ مشرّف بالاسلام ہوئے، اور جسے رسول اللہؐ کی ہمہ وقت، ہمرکابی و رفاقت کا شرف حاصل رہا، اور جس کے متعلق، خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں دنیا میں سب کے احسانات کا بدلہ دے چکا ہوں، مگر ابوبکرؓ کے احسانات کا بدلہ، میں نہیں دے سکتا، اللہ ہی قیامت کے روز، ان کی نوازشات کا بھرپور بدلہ دے گا''، وہ، تو فہم قرآن سے اسقدر کورے اور نابلد تھے کہ عمر بھر، خدا کے نافرمان، اور مبتلائے کفر و شرک رہے، لیکن خود ''مفکر قرآن'' صاحب، جس کے سامنے ''ہمیشہ قرآن کھلا رہتا تھا''، اپنی کوٹھی کی ملکیت کو اپنے نام رجسٹری کروا کے، بعد از وفات، پسماندگان کے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے، اور آخر دم تک ''مفکر قرآن'' ہی رہے۔

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۲ [۲] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۵

[۳] طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۷

کسی کی شام بھی، رشک سحر ہے، سنتے ہیں
ہماری صبح بھی صورت طرازِ شام ہوئی

''مفکرقرآن'' کی تضاد گوئی:

یہاں، ''مفکرقرآن'' کی تضاد گوئی بھی ملاحظہ فرمائیے، ابوبکرؓ، خود خلفائے راشدین میں سے اولین خلیفہ ہیں، اور اپنی زمین کی فروختگی کا حکم دے رہے ہیں، اور وہ زمین بک بھی جاتی ہے، لیکن ہمارے ''مفکرقرآن'' بڑے حتم ویقین کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

''عہد نبوی اور عہد شیخین میں، قابل کاشت زمینوں کی خرید وفروخت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔'' [۱]

اب یہ بات، اللہ ہی جانتا ہے کہ ابوبکرؓ کی فروختگی زمین کی مثال کی خبر ''مفکرقرآن'' کو کس آسمانِ وحی سے ملی ہے۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ وہ ''مزاج شناس خدا'' تھے۔

نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن:

خلیفہ اول کی ملکیت میں واقع، یہ زمین، سانپ کے منہ میں چھچھوندر والے معاملے کی حیثیت رکھتی ہے، اگر وہ اسے ابوبکرؓ کی ذاتی ملکیت قرار دیں، تو یہ عمل ''خلافِ قرآن'' قرار پاتا ہے، اگر اس واقعہ سے انکار کرنا چاہیں، تو یہ بھی اب ممکن نہیں ہے، کیونکہ پرویز صاحب، اپنی بہت سی تحریروں میں اسے ذکر کر چکے ہیں، اور یہ واقعہ، اُن کی ''قرآنی بصیرت'' کی کسوٹی پر پورا اتر کر، ان کی تصنیفات میں جگہ پا چکا ہے، اس الجھن سے بچنے کے لیے جو تاویل گھڑی گئی ہے، ایک نظر اسے بھی دیکھ لیجیے۔

''جو زمین، حضرت ابوبکرؓ نے فروخت کی تھی وہ معاوضہ تھا، اس محنت کا، جو اسے آباد کرنے میں کی گئی تھی۔'' [۲]

یہ سخنسازی، نفسِ مسئلہ کو سوچے سمجھے بغیر، جواب دینے کی عادت کا کرشمہ ہے، اور عذر

۱۔ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۳

۲۔ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۸۹ء، صفحہ ۶۹

گناہ، بدتر از گناہ کے مصداق ہے۔

بندۂ خدا! آپ کا موقف یہ ہے کہ کسی کے پاس عفوالمال رہ ہی نہیں سکتا، اور ابوبکرؓ کے کپڑے کے کاروبار سے، انہیں اتنی وافر آمدنی میسر تھی کہ وہ ''خاصے مرفہ الحال تھے'' اس صورت میں تو انہیں زمین کی قطعاً ضرورت ہی نہ تھی اور ستم ظریفی یہ کہ، ہجرت کے بعد، یہ زمین، ان کو، رسول اللہ ﷺ کے ان مقدس ہاتھوں سے ملی تھی، جن کا ''نظام ربوبیت'' کے علم بردار ہونے کی حیثیت سے، (بقول آپ کے) قُلِ العَفْوَ اور خذا العَفْوَ کی رو سے، کام ہی یہ تھا کہ لوگوں کا زائد از ضرورت مال لے لیا کرتے، کجا یہ کہ وہ ابوبکرؓ، کو بصورت زمین، زائد از ضرورت مال دے کر، خود ہی انہیں ''باطل اور شرک'' میں پھنسا دیتے۔

ایک اور سخن سازی:

زائد از ضرورت زمین کے بارے میں، تین ہی صورتیں ممکن ہیں، جیسا کہ طلوع اسلام کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔

''جن لوگوں کے پاس، ضرورت سے زائد زمین تھی، ان کو رسول اللہ ﷺ نے تین باتوں کا اختیار دیا تھا، رافع بن خدیج کی یہ روایت پہلے گزر چکی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ...... ''جس کے پاس، اپنی ضرورت سے زائد زمین ہو، (۱) اسے وہ خود ہی کاشت کرے، یا (۲) کسی بھائی کو دے، یا (۳) اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔'' [۱]

اب ظاہر ہے کہ عہد نبوی میں ملنے والی یہ زمین، حضرت ابوبکرؓ کی معاشی ضروریات سے قطعی زائد تھی، وہ خود کاشت کر نہیں سکتے تھے، کیونکہ وہ تاجر پیشہ تھے اور کھیتی باڑی کے فن سے قطعی ناآشنا۔ یہ زمین، مفت بلا قیمت، کسی اور بھائی کو بھی نہیں دی، کہ اگر وہ ایسا کر چکے ہوتے تو قبل از موت، اسے بیچنے کی پوزیشن ہی میں نہ رہتے، لا محالہ، انہوں نے، اپنے تیسرے اختیار ہی کی بدولت، اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دیا۔

---

[۱] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۳

طلوع اسلام کا فرمان یہ ہے کہ...... ''ابوبکرؓ نے اس زمین کو بیچ کر، جو قیمت وصول کی، وہ معاوضہ تھا، اس محنت کا، جو اسے آباد کرنے میں، انہیں اٹھانا پڑی تھی'' ...... آخر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انہوں نے واقعی اس زمین کو غیر آباد حالت میں خرید کر، یا بطور مالِ غنیمت پا کر ہی، خود آباد کیا تھا؟ اور اب آبادکاری کی محنت ہی قیمت فروخت قرار پا رہی ہے۔

درایتاً، یہ ظاہر ہے کہ اپنی خلافت کے تقریباً اڑھائی سالہ دور میں، وہ اپنے اصل پیشۂ بزازی کی طرف، اگر توجہ نہ دے پائے تو کاشتکاری کی طرف کیا توجہ دے سکے ہوں گے، جبکہ وہ فن زراعت سے بھی ناآشنا تھے، پھر اگر، بقولِ طلوع اسلام، اس زمین کو آباد بھی کیا ہوگا، تو قبل از خلافت، اپنے دورِ خوش حالی ہی میں کیا ہوگا، خلافت کا منصب پا لینے کے بعد، تو انہیں صرف گزارہ الاؤنس ہی ملا کرتا تھا، جس میں سے اخراجاتِ آبادکاریٔ زمین کا نکلنا ناممکن تھا اور خوشحالی کے زمانہ کی آباد شدہ، اس زمین کو، اڑھائی سالہ دور خلافت کی شدید مصروفیات کی بناء پر، اگر زیر کاشت نہ رکھا گیا تھا، جیسا کہ حکومتی مصروفیات کا تقاضا تھا، تو پھر سے، اس زمین کا غیر آباد ہو جانا یقینی ہے، کیونکہ اتنی مدت میں، جھاڑ جھنکار، جڑی بوٹیوں اور گھاس پھونس سے اٹ جانا ناگزیر ہے، پھر اس محنتِ آبادکاری کا کیا معاوضہ ہوگا، جو یوں برباد ہو چکی ہو۔

پھر یہ بھی کیا عجیب توجیہ ہے کہ...... وہ قیمتِ زمین نہ تھی، بلکہ اس محنت کا معاوضہ تھی جو زمین آباد کرنے میں صرف کی گئی تھی...... ہم حیران ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی کیش بک (Cash Book) اور لیجر (Ledger) ادارۂ طلوع اسلام کے ہاتھ، کہاں سے لگ گئی جسے دیکھ کر یہ طے کر ڈالا گیا کہ وہ، زمین کی قیمتِ خرید نہ تھی، بلکہ معاوضۂ محنتِ آبادکاری تھا، اور وہ بھی پورا پورا، نہ کم، نہ زیادہ۔

طلوع اسلام کے نزدیک کچھ نہ کچھ کہہ دینا ہی جواب ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ جواب، کسی کو مطمئن کر دے یا اعتراضات و اشکالات کا نیا سلسلہ چھیڑ دے، چنانچہ وابستگانِ طلوعِ اسلام، حضرت ابوبکرؓ کی زمین کی قیمت کو، ان کی محنتِ آبادکاری کا معاوضہ قرار دے

کر، مطمئن ہو گئے کہ بات بن گئی ہے، لیکن یہ قطعاً نہ سوچا کہ اگر حضرت ابوبکرؓ، فروخت کنندہ تھے، تو زمین کا کوئی خریدار بھی ہوگا، سوال یہ ہے کہ خریدار کے پاس، ضرورت سے زائد وہ رقم کہاں سے آ گئی، جو قیمتِ خرید قرار پائی، جبکہ قرآنی نظام معیشت کے متعلق، آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ...... ''قرآنی نظام میں، ناجائز دولت تو ایک طرف، اپنی ضروریات سے زائد جائز دولت رکھنے کی بھی اجازت نہیں ....''

ہاں البتہ، زمین کے آباد اور کارآمد رہنے کی ایک صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ ابوبکرؓ، خود تو، امور خلافت کی گرانبار ذمہ داریوں کے باعث، کاشت کاری نہ کر پائے ہوں، مگر کسی کاشتکار کو یہ زمین، بٹائی یا ٹھیکے پر دے رکھی ہو، کیا یہ صورت، طلوع اسلام کو قابلِ قبول ہے؟

عہد صدیقی میں ذاتی ملکیت کی ایک اور دلیل:

عہد نبوی میں، اسلام کی کوئی مستقل فوج نہ تھی، لوگ، اپنی محنت، تجارت زراعت یا گلہ بانی کے ذریعہ، خود کماتے تھے اور بوقت ضرورت، شجرِ اسلام کی آبیاری کے لیے، اپنا خون پیش کیا کرتے تھے، جنگ میں، مال غنیمت ہاتھ آتا، تو آپ، اس کا ایک خمس، نادار اور خستہ حال افراد کی حاجت برآری کے لیے، بیت المال میں محفوظ کر دیتے اور بقیہ چار خمس، مجاہدین میں تقسیم فرما دیتے، کنوارے کو ایک اور شادی شدہ کو دو حصے دیئے جاتے، یہ کچھ ان کی پیشہ وارانہ آمدنی سے زائد، اور اس کے علاوہ تھا، جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ عہد نبوی کے معاشرہ میں ذاتی ملکیت کا اصول قائم تھا، اور لوگوں کے پاس، زائد از ضرورت، مال و دولت بھی موجود ہوتا تھا، تقسیم غنائم کے وقت، پیادہ کے مقابلہ میں، سوار کو دوگنا حصہ دیا جاتا تھا، اور یہ سب امور، پرویز صاحب کی تصنیفات میں بھی ثبت ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> ''یہ تھا وہ مقام، جب پہلی مرتبہ (۲ ھجری میں) روزے فرض ہوئے، اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے مقام پر آنا پڑا، اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی، آپ نے غور

فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟...... لِتُكَبِّرُ وا اللهَ عَلٰى مَا هَدٰا كُمْ (۲/)
''خدا کے پروگرام کے مطابق، ملک میں، اس کی کبریائی قائم کرنا۔'' اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز، وجود میں نہ آئی تھی، قرآن نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔'' [1]

''رسول اللہ، اور خلافتِ صدیقی میں، قانون یہ تھا کہ مالِ غنیمت، مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔'' [2]

''جنگ میں جو لوگ غلام بنا لیے جائیں، وہ مالِ غنیمت کا اسی طرح، ایک حصہ، شمار ہوتے تھے جیسے آلاتِ جنگ، نقود اور گھوڑے وغیرہ، بہر حال، ان کی مثال، بعینہٖ ان قابل قیمت چیزوں کی طرح ہوتی ہے جو فاتحین کے قبضہ میں آ جائیں، ان چیزوں کا حال، یہی ہوتا ہے کہ امام، ان کو دارالاسلام کی طرف منتقل کر لیتا ہے، پھر ان کا پانچواں حصہ، امام لے لیتا ہے تاکہ اسے عام مصالح پر خرچ کر سکے یعنی فقراء و مساکین کو دے دے، اور دوسرے نیکی کے مختلف مصارف میں خرچ کر دے، رہ گئے باقی چار خمس، تو وہ ان لوگوں پر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں، جو جنگ میں شریک رہے ہوں، غلاموں کے ساتھ بھی، یہی کچھ کیا جاتا ہے۔ ان کا پانچواں حصہ مصالح عامہ کے لیے ہوتا ہے، اور باقی جنگ کرنے والوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں، جنگ کرنے والوں پر تقسیم کرتے ہوئے، سوار اور پیادہ کے درمیان امتیاز رکھا جاتا ہے، یعنی بعض فقہاء کے قول میں، سوار کو دو حصے ملتے ہیں اور پیادہ کو صرف ایک حصہ ملتا ہے۔'' [3]

کیا یہ صورتحال، اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی نہیں کہ عہد نبوی اور دور صدیقی میں بھی، لوگ، اپنے مال و دولت کے آپ مالک تھے، اور انہیں مال غنیمت میں سے بھی

---

[1] طلوع اسلام، اگست ۱۹۸۰ء، صفحہ ۳۰ [2] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۸۳ء، صفحہ ۲۴
[3] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۸۲ء، صفحہ ۱۶

حصہ ملتا تھا، جوان کی اپنی کمائی کی فاضلہ دولت پر مستزاد ہوتا تھا۔

دورِ صدیقی میں ذاتی ملکیت کی تیسری دلیل:

پرویز صاحب، قانونِ وراثت کے متعلق فرماتے ہیں کہ

''قرآن کے وراثت کے احکام، اس دور سے متعلق ہیں، جب قرآنی نظام قائم نہ ہو، قرآنی نظام کی موجودگی میں، یہ احکام، اسی طرح پیچھے ہٹ جاتے ہیں، جس طرح پانی مل جانے کی صورت میں، تیمّم کے احکام ساقط العمل ہو جاتے ہیں۔'' [1]

مغالطہ آفرینی، پرویزی حیلوں میں سے، ایک اہم حیلہ ہے، پانی کے عدم حصول کی صورت میں، تیمّم کا قائم مقامِ وضو ہونا اور پانی مل جانے کی صورت میں، تیمّم کا ساقط العمل ہونا، خود شارع نے بیان فرما دیا ہے، کیا احکام وراثت کا کسی حالت میں بھی ساقط العمل ہونا، قرآن میں کہیں منقول ہے؟ اشتراکیت کو رولڈ گولڈ کر کے، ''نظامِ ربوبیت'' کے نام سے، اسے اصل قرآنی نظامِ معیشت قرار دینا، اور پھر اس کے نفاذ کی صورت میں، احکام وراثت کو ساقط العمل ٹھہرانا دینا، خالصتاً، سامری کی تسویلِ نفس کا کرشمہ ہے، آخر اسے شارع کے منصوص احکام سے کیا تعلق؟

لیکن خیر! ہم برسبیلِ تنزل، اسے مانتے ہوئے، مستفسر ہیں کہ ''مفکر قرآن'' نے کبھی یہ کیوں نہیں بتایا کہ قرآنی نظام، کب، کس سال، یا کس خلیفہ کے عہد میں مکمل طور پر قائم ہوا تھا؟ اور احکام وراثت، کب، کہاں اور کس دور میں ساقط العمل قرار پائے تھے؟ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قانونِ میراث، زمانہ نزولِ قرآن میں بھی، (جو رسول اللہ ﷺ کا اپنا دورِ حکومت تھا) نفاذ پذیر تھا، عہدِ صدیقی میں بھی، تقسیم ترکہ اسی قانون کے مطابق تھی، خلافتِ فاروقی میں بھی یہ قانون برقرار تھا، دورِ عثمانی میں بھی تقسیم ترکہ کی بنیاد، یہی قانونِ میراث تھا، پھر آخر یہ واضح تو کیا جائے کہ کس سال، اس نام نہاد ''نظامِ ربوبیت'' کا نفاذ، پایۂ تکمیل

---

[1] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۵۸ء، صفحہ ۶

کو پہنچا، اور ''احکام میراث، اسی طرح ساقط العمل ہو گئے، جس طرح پانی مل جانے کی صورت میں، تیمّم کے احکام، پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

جہاں تک، عہد نبوی کا تعلق ہے، قانون میراث، نازل ہوتے ہی نفاذ پذیر ہو گیا، اور نبی اکرمؐ کی وفات (بلکہ بعد از وفات) تک نافذ رہا، اس قانون کے نزول و نفاذ سے قبل بھی، ایک نوع کی وراثت جاری تھی، جو بعد از ہجرت، انصار و مہاجرین کے مابین مواخات، کے نتیجہ میں واقع ہوئی تھی۔

''یہ رشتۂ اخوت، ایسا استوار ہوا کہ انصار بھائی کی موت پر، اس کے ترکہ کا وارث، مہاجر بھائی قرار دیا جاتا تھا، لیکن جب بعد میں، اس کی ضرورت نہ رہی تو قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی کہ ترکہ میں، رشتۂ قرابت، مقدم ہونا چاہیے۔''[۱]

چنانچہ اس کے بعد، وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ کی روشنی میں، انصار و مہاجرین میں توارث کا سلسلہ ختم ہو کر، قرآن کے ذکر کردہ رشتہ داروں تک محدود ہو گیا۔

رہا خلافت صدیقی کا دور، تو اس میں بھی، یہی قانونِ میراث، تقسیم ترکہ کی بنیاد تھا، البتہ، اگر ترکہ میں، کسی رشتہ دار کا حصہ بیان کرنے میں، قرآن خاموش رہتا، تو پھر احادیثِ رسول کی طرف، رجوع کیا جاتا تھا۔ مثلاً

''حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی، انہوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا، حضرت مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ نے دادی کو سدس دلوایا ہے'' فرمایا ''کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے؟'' محمد بن مسلمہ نے کہا کہ ''میں شہادت دیتا ہوں''۔ اس وقت، اس کو ایک سدس دلوایا۔''[۲]

یہ واقعہ، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، قرآن ہی کے مطابق، تقسیم ترکہ

---

[۱] معارف القرآن، جلد۴، صفحہ ۳۷۸ [۲] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۳

کیا کرتے تھے، لیکن اگر کسی مسئلہ میں، وہ قرآن کا کوئی حکم نہ پاتے، تو پھر، وہ، احادیثِ رسولؐ، یا قضایائے رسولؐ کو تلاش کیا کرتے تھے، اس طرح، یہ واقعہ، جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ عہد صدیقی میں احکام میراث جاری و ساری تھے، وہاں وہ اس حقیقت پر بھی شاہد ہے کہ قرآن کی طرح، احادیثِ رسولؐ اور قضایائے نبی بھی، شرعی اور دینی حجت ہیں۔

یہی قانون دورِ فاروقی مین بھی نافذ تھا، اور حضرت عمر کا طرزِ عمل بھی بالکل وہی تھا جو حضرت ابوبکرؓ صدیق کا تھا۔

''امام مالکؒ نے موطا میں روایت کی ہے کہ ایک جدہ (یعنی نانی) حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں، اپنی میراث (یعنی نواسے کے ترکہ سے حصہ) مانگنے آئی، انہوں نے فرمایا کہ قرآن مجید میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اور حدیث میں بھی ہم کو تمہارا حصہ معلوم نہیں ہوتا، اس وقت واپس جاؤ، تا کہ ہم لوگوں سے دریافت کرلیں۔ انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ میرے سامنے رسول اللہ ﷺ نے نانی کو چھٹا حصہ دیا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ''کیا تمہارے علاوہ بھی، اس کی کوئی شہادت دے سکتا ہے؟'' حضرت محمد بن مسلمہ نے بھی کھڑے ہوکر یہی بات کہی، اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے چھٹا حصہ دلوایا، اس کے بعد دوسری جدّہ (یعنی حقیقی دادی) حضرت عمرؓ بن خطاب کی خدمت میں، اسی غرض سے حاضر ہوئی، تو انہوں نے فرمایا ''قرآن میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ تمہارے لیے نہ تھا بلکہ نانی کے لیے تھا۔'' [1]

قطع نظر اس کے کہ، اس روایت کو، عربی سے اپنے الفاظ میں، منتقل کرتے ہوئے، کسقدر لغزشوں کا صدور ہوتا ہے، یہ بات، بہرحال واضح ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح، حضرت عمرؓ بھی، قرآن کے بعد، سنت نبویہ سے تمسک کیا کرتے تھے، نیز یہ کہ دورِ فاروقی

[1] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۲۵

تک بھی، اسلامی قانونِ میراث نافذ العمل تھا اور وہ نام نہاد ''نظامِ ربوبیت'' مسلط نہیں ہوا، جسکی موجودگی میں، بقولِ پرویز، احکام میراث، ساقط العمل قرار پا گئے تھے۔

رہا عہدِ عثمانی، تو اس میں بھی قرآنی قانونِ میراث، نافذ العمل تھا، جیسا کہ حضرت ابوذرؓ کی درج ذیل تقریر سے واضح ہے۔

''مال دار لوگو! ضرورت مندوں کی خبر گیری کرو، اور ان لوگوں کو، جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آگ کی سلاخوں سے داغ دیئے جانے کی وعید سنا دو، جس سے ان کے چہروں، پہلوؤں اور کمروں کو داغا جائے گا۔ اے مال جمع کرنے والے! یاد رکھ، مال میں تین آدمی شریک ہیں (i) تقدیر، جو تجھ سے پوچھے بغیر، اپنے فیصلے صادر کر دیتی ہے (ii) وارث، جو اس کا منتظر ہے کہ تو کب آنکھیں بند کرے، اور وہ اس مال کو لے جائے (iii) خود تو، اگر ایسا کر سکتا ہے کہ ان دونوں سے بازی لے جائے تو ضرور ایسا کر۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''تم نیکی اور بھلائی کو کبھی نہیں پا سکتے، جب تک تم، اپنی مرغوب و محبوب چیزوں کو، سب کے لیے عام نہ کر دو۔''[۱]

ظاہر ہے کہ وارث کا، مالِ مورث کے لیے منتظر رہنا تو اسی معاشرے میں ممکن ہے جس میں قانون میراث جاری ہو، اور بقول طلوع اسلام، عہد عثمانی میں، وارث، اپنے متوفّی مورث کی میراث کو پا لینے میں اس قدر حریص تھے کہ وہ صاحب ترکہ کی آنکھیں بند ہونے کے منتظر رہتے تھے، تو از راہ انصاف بتائیے کہ وہ دور کب آیا؟ جب ''نظامِ ربوبیت'' مکمل طور پر نافذ ہوا تھا، اور احکام وراثت ساقط العمل ہو گئے تھے، حقائق، اس کے برعکس، یہ واضح کرتے ہیں کہ قانونِ میراث، عہدِ نبوی، خلافتِ ابی بکرؓ، زمانۂ فاروقی اور دورِ عثمانی میں بھی نافذ تھا، یہ بجائے خود، شخصی ملکیتِ مال کو مستلزم ہے۔

---

[۱] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۶۵

(ب) کیا عہد فاروقی میں ''نظام ربوبیت'' لوگوں پر مسلط تھا؟:

عہد نبوی اور دور صدیقی کی طرح، ہم خلافتِ فاروقی میں بھی، ایسا معاشرہ پاتے ہیں، جس میں لوگوں کا نجی ملکیت کا حق بھی محفوظ تھا، اور ان کے پاس فاضلہ دولت بھی موجود تھی، اس دولت میں سے لوگ، زکوٰۃ کے علاوہ، صدقہ و خیرات بھی دیا کرتے تھے، عورتوں کو ان کا حق مہر بھی دیا جاتا تھا، قرض و اقراض کے علاوہ، مالی اعانت بھی اسی عفو المال میں سے ادا ہوتی تھی، اس پر مستزاد یہ کہ، انہیں مال غنیمت میں سے بھی ملا کرتا تھا جو ان کی معمول کی کمائی کے علاوہ، فاضلہ دولت میں سبب اضافہ تھا، اور عند الموت، اگر ان فیاضانہ اخراجات کے بعد بھی، کچھ زر نقد یا بصورت جنس، کچھ مال رہ جاتا، تو قانونِ وراثت کی ٹھوکر سے، وہ، دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں بکھر جاتا، یہ سب امور اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ صدر اول کے معاشرہ میں، لوگوں کے پاس، فاضلہ دولت بھی موجود تھی، اور انہیں ذاتی ملکیت کا حق بھی حاصل تھا، ہم دور فاروقی کو نسبتاً تفصیل سے بیان کریں گے، کیونکہ، پرویز صاحب، اکثر و بیشتر، یہ کہا کرتے تھے، کہ:

> ''میں نے اسلام کا عملی نظام، اس کی جزئیات کے ساتھ، حضرت عمرؓ سے سمجھا ہے۔'' [1]

اور اس لیے بھی، کہ ان کے نزدیک:

> ''اسلامی نظام کا آغاز، حضور نبی اکرم کے عہد ہمایوں میں ہوا، اور وہ تکمیل تک دور فاروقی میں پہنچا۔'' [2]

لیکن دورِ فاروقی کے دس سالوں میں کب، کس سال؟ یہ کبھی نہیں بتائیں گے، تاکہ کہیں اس کے بعد کا کوئی واقعہ، اس ڈھول کا پول نہ کھول دے، نیز، اس لیے بھی، ہم عہد فاروقی کے ان واقعات کو قدرے تفصیل سے پیش کریں گے کہ ان کا دورِ حکومت ''نظام ربوبیت'' کو پرکھنے کے لیے، ایک ایسا معیار ہے جس کے متعلق، پرویز صاحب یہ کہا کرتے

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۵ [2] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۸۲ء، صفحہ ۱۱

تھے، کہ جب یہ نظام نافذ ہو جاتا ہے تو:

''اس وقت ذرائع پیداوار، یا فالتو دولت، پرائیوٹ پراپرٹی رہتے ہی نہیں۔''[1]

لہٰذا، ہم مجبور ہیں کہ پرویز صاحب کے، ان دعاوی کا جائزہ، خود ان ہی کی تحریروں کی روشنی میں لیا جائے۔

مندرجہ ذیل واقعات، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ دور فاروقی میں بھی لوگوں کی گردنیں، اس نام نہاد ''نظام ربوبیت'' کے تسلط سے آزاد تھیں، ذاتی ملکیت کا اصول رائج تھا، لوگوں کے پاس، زائد از ضرورت دولت، موجود تھی (جس کے متعلق ''مفکر قران'' یہ ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے کہ وہ سب تحویل مملکت میں رہا کرتی تھی)

ا۔ بڑھیا اور حق مہر:

دور فاروقی کا یہ ایک معروف واقعہ ہے کہ

''جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ، اپنی بیویوں کا مہر مقرر کرنے میں، بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں، تو آپ نے ایک اجتماع میں، اس کا ذکر کیا، اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے، اس پر، ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ ''یہ کیا؟'' اللہ نے فرمایا ہے کہ **وَاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـئًا** (۴/۲۰) ''اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو، تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو،'' حضرت عمرؓ یہ سنکر بول اٹھے، کہ ''عورت نے سچ کہا، عمر غلطی پر تھا۔''[2]

حضرت عمرؓ، مہر کی ایک خاص مقدار مقرر کر کے گویا ''نظام ربوبیت'' ہی کی طرف، ایک قدم اٹھایا چاہتے تھے، مگر بڑھیا آڑے آ گئی، اور دلیل یہ پیش کی کہ جب مہر کی صورت میں، عورت کی طرف، ڈھیروں مال آنے کا دروازہ، خود اللہ تعالیٰ نے کھلا رکھا ہے تو آپ، مہر کی حد بندی کر کے، کیوں اس دروازہ کو بند کرنا چاہتے ہیں''، حضرت عمرؓ کو اپنی غلطی کا

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۶ [2] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۷۷

احساس بھی ہوا، اور انہوں نے اعتراف بھی کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ حق مہر میں، ڈھیروں مال کا بیوی کو ملنا، کیا اس معاشرہ میں ممکن ہے جس میں لوگوں کے پاس، زائد از ضرورت دولت رہنے ہی نہ دی جائے؟ اور لوگوں کی ملکیتِ مال، صرف رزقِ کفاف ہی کی حد تک محدود ہو؟ اگر کوئی شخص، اپنے دماغ میں، پیشگی نظریات راسخ کیے بغیر، اس واقعہ کو دیکھے گا، تو وہ کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں لوگ، اپنی جائز مکسوبہ دولت سے بھی محروم کر دیئے جاتے تھے (ماسوا بقدر ضرورت مال کے)۔

واقعہ زیر نظر میں، لوگوں کا حق مہر میں، افراط اختیار کرنا، بجائے خود شخصی ملکیت میں واقع ہونے والے مال کی فراوانی کا ثبوت ہے اور پھر اس مال کا عورت کو بطور حق مہر ملنا، خود اس کی ذاتی ملکیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، حق مہر کا تعین، شوہر کی مالی حیثیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، تنگدست شوہر کی طرف سے حق مہر، اس کی گنجائش کے اعتبار سے اور خوشحال شوہر کی طرف سے، اس کی کشائش کے لحاظ سے۔ بقول پرویز:

> ''قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی، جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لیے علیٰ قدر وسعت ہونا چاہیے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۶، ۴/۲۰)
>
> مہر، عورت کی ملکیت ہوتا ہے، اور کسی کا حق نہیں کہ اسے، اس سے محروم کر دے، البتہ عورت، اپنی رضامندی سے، اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے۔ (۴/۴)
>
> اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا تو اسے، مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہیے۔ (۲/۲۳۶)''[1]

ظاہر ہے کہ جب حق مہر کا تعین، مرد کی مالی حیثیت کے مطابق ہوگا، اور ان کی خوشحالی یا تنگدستی کا لحاظ رکھا جائے، تو یہ صورتحال، اُسی معاشرے میں ممکن الوقوع ہے جس میں شخصی ملکیت کی بناء پر تفاضل فی الرزق موجود ہو، اگر تمام افراد معاشرہ کی مالی گنجائش، حد ضرورت

---

[1] طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۷

تک ہی محدود ہو تو سرے سے حق مہر ہوگا ہی نہیں کجا یہ کہ اس کے تعین کی زحمت اٹھانی پڑے۔

۲۔ فرزندِ عمرؓ کا واقعۂ شتر فروشی:

درج ذیل واقعہ بھی، اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ عہد فاروقی میں، پرویز صاحب کے ''نظام ربوبیت'' کا نام ونشان تک نہ تھا۔

''آپ کے بیٹے، حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ ''میں نے کچھ اونٹ خریدے اور انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیجدیا، وہ موٹے ہو گئے تو انہیں بازار میں فروخت کرنے کے لیے لے آیا، اتفاق سے اسی وقت، حضرت عمرؓ کا گذر ادھر سے ہوا، انہوں نے پوچھا کہ، ایسے فربہ اونٹ کس کے ہیں؟'' میں نے جواب دیا، تو پوچھا ''ایسے موٹے تازے کس طرح ہو گئے؟'' میں نے کہا کہ ''میں نے انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیجدیا تھا، تاکہ جو فائدہ دوسرے مسلمان اٹھاتے ہیں، میں بھی اٹھاؤں۔'' یہ سن کر آپ کو سخت غصہ آیا، کہا کہ ''عام مسلمانوں کا ذکر کیوں کرتے ہو، کہو کہ امیر المومنین کے بیٹے کے اونٹ تھے، اس لیے حکومت کی چراگاہ میں بھیجدیئے۔ سنو! اونٹ فروخت کرو، اور رأس المال رکھ لو، اور سارا منافع بیت المال میں جمع کرادو۔'' [1]

عبداللہ بن عمرؓ کا اونٹ خریدنا، اس امر کی قوی دلیل ہے کہ ان کے پاس، ضرورت سے زائد دولت موجود تھی، جو ان کی ذاتی ملکیت تھی، نیز اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ افراد معاشرہ، اپنے مکسوبہ منافع کے خود مالک ہوا کرتے تھے، اگر ضرورت سے زائد مال، اور اس کا منافع حکومت کی تحویل میں چلا جایا کرتا، تو عبداللہؓ بن عمرؓ، اونٹوں کی خرید وفروخت کا کاروبار ہی کیوں کرتے؟ اس سے ظاہر ہے کہ عہد فاروقی میں، ایسا کوئی معاشی نظام رائج نہ تھا جو افراد کا عفو المال اپنی تحویل میں لے لیا کرتا۔

حضرت عمرؓ کو، اپنے بیٹے کی حرکت پر جو اعتراض ہوا، وہ اس بناء پر نہ تھا کہ ان کے

---

[1] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۰

پاس زائد از ضرورت مال کیوں تھا؟ یا یہ کہ، ان کے نزدیک، ذاتی منافع کا کاروبار کرنا، بجائے خود ناجائز تھا؟ بلکہ اس بناء پر تھا کہ انہوں نے اپنے اونٹوں کو سرکاری چراگاہ میں کیوں چرایا تھا، اگر وہ کسی اور چراگاہ میں چرا کر، اپنے اونٹ بیچتے تو انہیں قطعاً اعتراض نہ ہوتا، نیز، اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمر کے پاس، وہ اونٹ بھی، اسی طرح ضرورت سے زائد مال تھے، جس طرح وہ دولت، جو ان اونٹوں کی قیمتِ خرید قرار پائی تھی، اگر یہ اونٹ، انکی ضرورت کے لیے ناگزیر ہوتے تو وہ ہرگز، ان کو نہ بیچتے، اس طرح، عبداللہ بن عمر کا ضرورت سے زائد اونٹ رکھنا، اور پھر انہیں منافع پر بیچنا، بجائے خود، نجی ملکیتِ مال کا واضح ثبوت ہے۔

۳۔ اپنی زمین سے پانی نہ گزرنے دینا:

عہد فاروقی کا یہ واقعہ بھی، مال و دولت کے علاوہ، شخصی ملکیتِ زمین کا بھی قطعی ثبوت ہے۔

> ''رسول اللہ کا فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال، اس کی رضامندی کے بغیر نہیں لیا جا سکتا، لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں، ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی، اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی، فلاح شخص کی زمین میں سے گزرے اور وہ اس کے لیے رضامند نہیں ہوتا، حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس کے راستے میں بالکل مزاحم نہ ہو'' [۱]

یہ واقعہ صریحاً اس بات کی دلیل ہے کہ دور فاروقی میں زمینیں بھی، ذاتی ملکیت میں ہوا کرتی تھیں، اسی لیے تو مزاحم شخص، دوسرے آدمی کے لیے، پانی کو گزرنے نہیں دیتا تھا، کیونکہ پانی کا کھال، اگر اس کی زمین میں سے گزرتا تو زمین کا کچھ حصہ کھال بننے میں صرف ہو جاتا، اور یہ نقصان اسے گوارا نہ تھا، ورنہ اگر زمین، اس کی ذاتی ملکیت نہ ہوتی تو وہ مزاحم

---

[۱] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۴۰

ہی کیوں ہوتا؟ میرے اس استدلال کے جواب میں، طلوع اسلام نے، جو تردیدی ''دلائل'' پیش کیے ہیں، ایک نظر اسے بھی دیکھ لیجیے۔

''حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، ایک شخص کی زمین میں سے، پانی گزار کر، دوسرے شخص کے کھیت تک پہنچانے کا حکم دیا گیا تو اس کا اصول یہی تھا کہ دونوں کے کھیت، خدا کی ملکیت ہیں، لہٰذا دونوں کو سیراب کرنیکا حق ہے، کسی ایک کاشتکار کو یہ حق نہ تھا کہ وہ، دوسرے کی زمین کو پانی سے محروم کردے، اس کے علاوہ، ایسے معاملات میں، عشری اور خارجی زمینوں میں، جو فرق کیا گیا ہے، اس کو بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے۔''[1]

یہ جواب، ایک طرف تو، بغیر سوچے سمجھے بول دینے کی عادت کا کرشمہ ہے، اور دوسری طرف، اس ذہنیت کا کرشمہ، کہ کچھ نہ کچھ کہہ دینا ہی جواب ہوتا ہے قطع نظر، اس کے کہ، جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ برمحل بھی ہے یا نہیں؟ میرے جس استدلال کے شوقِ تردید میں، یہ سخنسازی کی گئی ہے، اسے میں دوبارہ پیش کیے دیتا ہوں، تاکہ ہر شخص خود محسوس کر لے کہ میرے استدلال کے مقابلہ میں، اس سخنسازی کی کیا حیثیت ہے۔

یہ واقعہ، اس حقیقت کو آفتاب نیمروز کی طرح واضح کر دیتا ہے کہ نہ صرف دور نبوت میں، بلکہ خلافت راشدہ میں بھی، افراد معاشرہ کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل تھا، اور اس کا نظام معیشت، اسی اصل و اساس پر قائم تھا، اگر اسلام نے افراد کو، یہ حق ملکیت نہ دیا ہوتا، اور اراضی ملکیتِ ریاست ہوتی، اور اس پر کام کرنے والے کی حیثیت، محض سرکاری مزارع کی ہوتی تو پانی کی نالی نکالنے کا یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا، آپ خود سوچیے، اگر کسی لینڈ لارڈ کی ملکیت میں دو سو مربع اراضی ہو اور اس پر دو سو مزارع کام کر رہے ہوں، تو کسی مزارع کو آقائے زمین کی خواہش کی مزاحمت کرنیکی کیا ضرورت ہے؟ اگر

---

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ ۶۹

زمین واقعی کاشتکار کی ذاتی ملکیت میں ہو تو بلاشبہ، وہ، مزاحم ہوسکتا ہے، مگر جب زمین سرے سے اس کی ہے ہی نہیں، اور کوئی دوسرا شخص، اس کا مالک ہے، اور وہ مالک کی حیثیت سے کوئی کھال کیا، نہر بھی کھودنا چاہے، تو مزارع کس طرح مانع و مزاحم ہوسکتا ہے؟ عہد فاروقی کے اس واقعہ میں، ایک شخص کا دوسرے شخص کو، اپنی زمین میں سے، پانی کا راستہ دینے میں مزاحم ہونا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی اراضی کا مالک تھا، اس لیے، وہ کسی دوسرے کو، بذریعہ کھال، پانی فراہم کرنے کے لیے اپنی زمین کے نقصان کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھا، البتہ حضرت عمرؓ کے فیصلہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر، ذاتی ملکیت کے اصول کو قربان کیے بغیر، مالکِ زمین کو، اگر کچھ قربانی و ایثار سے کام لینا پڑے تو اسے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔'' [۱]

میرے اس استدلال کے مقابلہ میں، طلوع اسلام کی سخنسازی کا کیا وزن ہے؟ ہر شخص، خود دیکھ سکتا ہے۔

پھر یہ بھی کیا خوب کہا ہے کہ...... ''عشری اور خراجی زمینوں میں، جو فرق کیا گیا ہے، اسکو بھی ملحوظ رہنا چاہیے'' ...... اس پر میں، اس کے سوا، کیا کہہ سکتا ہوں کہ اوروں کو نصیحت، خود میاں فصیحت۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر طلوع اسلام، خود یہ فرق کھول دیتا تا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہو جاتی۔

۴۔مرگِ جوع کی دیت:

یہ واقعہ بھی، شخصی ملکیت کی واضح دلیل ہے، تفصیل واقعہ یوں ہے۔

''عہدِ فاروقی میں، ایک دفعہ، ایک بستی کے رہنے والوں نے، ایک پیاسے مسافر کو پانی نہ دیا، اور وہ پیاس سے مرگیا، تو حضرت عمرؓ نے خونبہا ادا کیا، اور اسے پھر بستی والوں سے وصول کیا، اس فاروقی فیصلہ کی رو سے قانون بن گیا

---

[۱] ماہنامہ محدث، دسمبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۵۷

کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص، بھوک پیاس سے مر جائے، تو اہل بستی پر، اس کی دیت (خون کی قیمت) لازم آتی ہے۔'' [1]

اگر بستی والوں پر وہ ''نظام ربوبیت'' مسلط ہو چکا ہوتا، جو زائد از ضرورت مال و دولت کو ان کے پاس نہیں رہنے دیتا، تو وہ، دیت کی رقم، کیسے فراہم کر سکتے تھے، بلکہ وہ الٹا خلیفہ سے یہ کہتے کہ...... ''آپ نے ہمیں ضرورت کی حد تک رزق دیا ہے، اس لیے ہم دیت کی رقم، کہاں سے فراہم کریں، لہٰذا جب تک یہ ''نظامِ ربوبیت'' ہم پر مسلّط ہے، آئندہ ہم سے ادائیگیٔ دیت کی توقع نہ رکھئے، آج کی طرح، مستقبل میں بھی، اگر ایسا جرم، ہم سے سرزد ہو، تو دیت، آپ خود ہی بیت المال سے دے دیا کریں، جیسا اب آپ نے کیا ہے''...... تو خلیفہ ثانی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ لیکن باشندگانِ بستی نے دیت فراہم کی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاشرے میں، نہ صرف یہ کہ ذاتی ملکیت کا اصول رائج تھا، بلکہ افرادِ معاشرہ کے پاس، زائد از ضرورت دولت بھی موجود ہوتی تھی، جس میں سے، بصورتِ جرم و جنایت، وہ دیت ادا کرتے تھے، ایسی صورت میں، مرگِ عطش و جوع کے باعث دیت کو، مستقل قانون کی شکل دینا، گویا ذاتی ملکیت کی بناء پر، فالتو مال و دولت کے رکھنے کو دائمی پالیسی قرار دینے کے ہم معنیٰ ہے۔

۵۔ سرکاری رقم سے تجارت اور نفع:

عہد فاروقی کے اس واقعہ کی تفصیل، طلوع اسلام میں بایں الفاظ درج ہے:

''حضرت عمرؓ کے بیٹے، عبدؓ اللہ اور عبیدؓ اللہ، جہاد سے واپس آ رہے تھے، راستہ میں بصرہ کے گورنر، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ملے، انہوں نے کہا ''میں نے کچھ روپیہ، بیت المال میں داخل کرنے کے لیے بھیجنا ہے، وہ لیتے جاؤ، میں وہ روپیہ تمہیں بطور قرض دیئے دیتا ہوں، تم اس سے کچھ عراقی مال خرید لو، مدینہ جا کر مال بیچ دینا، اصل بیت المال میں جمع کرا دینا، اور منافع، خود رکھ لینا۔''

---

[1] طلوع اسلام، جون ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱۴

انہوں نے ایسا ہی کیا، حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں کی طلبی ہو گئی، دریافت کرنے پر، انہوں نے کہا کہ ''گورنر نے یہ روپیہ انہیں ادھار دیا تھا، اس سے انہوں نے کاروبار کیا ہے''۔ آپؓ نے فرمایا کہ ''کیا گورنر نے سارے لشکر کو اسی طرح ادھار دیا تھا یا صرف تم دونوں کو؟'' انہوں نے کہا کہ ''سارے لشکر کو تو نہیں دیا تھا۔'' اس پر آپؓ نے فرمایا کہ ''پھر اس نے تمہارے ساتھ یہ ترجیحی سلوک، اس لیے کیا کہ تم امیر المومنین کے بیٹے ہو، جاؤ، مال اور نفع، دونوں بیت المال میں جمع کردو''......مجلسِ مشاورت کے بعض رفقاء نے مداخلت کی تو بصد مشکل، آپؓ، اس پر راضی ہوئے کہ نصف منافع انہیں دے دیا جائے۔'' [1]

اگر فی الواقعہ، دور فاروقی کے معاشرہ پر، وہ ''نظام ربوبیت'' پایۂ تکمیل کو پہنچ کر، اپنی گرفت، مضبوط کر چکا ہوتا، جس کے باعث، لوگوں کے پاس، روز مرّہ کی اشیاءِ مستعملہ کے علاوہ، کوئی سروسامان اور کوئی مال و متاع باقی نہیں رہنے دیا جاتا، تو اس کا علم، ہر کس و ناکس کو ہونا چاہیے تھا، لیکن یہاں حال یہ ہے کہ نہ گورنر کو، اس کا علم ہے، نہ فرزاندانِ خلیفہ کو، اور نہ ہی خود خلیفہ عمرؓ کو (جن سے ہمارے ''مفکر قرآن'' نے اسلام کا عملی نظام، اس کی جزئیات کے ساتھ سمجھا ہے)، ان حکمرانوں میں سے کسی کو بھی، اس بات کا علم نہیں کہ ہم خود، ایک ایسا ''قرآنی نظام'' نافذ کر چکے ہیں، جس میں منافع کما کر، ذاتی ملکیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اور خلیفۂ وقت اگر، گرفت کرتے بھی ہیں تو اس پہلو سے نہیں کہ تجارت کے ذریعہ نفع کیوں کمایا؟ بلکہ اس پہلو سے کہ سرکاری رقم کو اس مقصد کے لیے کیوں استعمال کیا گیا۔ اگر ''مفکر قرآن'' کے مزعومہ ''نظامِ ربوبیت'' کا شکنجہ لوگوں کی گردنوں پر کسا جا چکا ہوتا، تو نہ ابوموسیٰ اشعری، سرکاری رقم سے اکتساب نفع کی ترغیب دیتے، اور نہ ہی فرزندانِ عمرؓ قانوناً ایسا کر پاتے، اور نہ ہی حضرت عمرؓ، اس نفع کو جائز سمجھ کر، اس کا نصف بیت المال میں رکھتے اور دوسرا نصف، اپنے بیٹوں کے لیے جائز قرار دیتے، اس طرح یہ واقعہ، نہ

---

[1] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۰

صرف یہ کہ دورِ فاروقی میں، ذاتی ملکیت کے اصول کے رواج پذیر ہونے، اور افراد کے پاس، فاضلہ دولت کے وجود کو ثابت کرتا ہے بلکہ مضاربت کو بھی ثابت کرتا ہے، جس میں ایک فریق (بیت المال) کا زرِ دولت، دوسرے فریق (فرزندانِ عمرؓ) کی محنت کے نتیجہ میں منافع پیدا کرتا ہے، اور وہ دونوں فریقوں میں مساوی مساوی تقسیم ہو جاتا ہے۔

۶۔ آزاد شدہ غلام اور شخصی ملکیت:

پرویز صاحب، ایک آزاد شدہ غلام، سعید کا واقعہ، بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:

''حضرت عمرؓ کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ حکومت کے واجبات کی ادائیگی، اس وقت لازم آتی ہے، جب متعلقہ شخص، حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفیض ہو چکا ہو، اس ضمن میں ایک آزاد شدہ غلام، سعید کا بیان کردہ واقعہ، بصیرت افروز ہے، ان کا بیان ہے کہ میں، اپنی آزادی حاصل ہونے کے بعد، حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لیے، حضرت عمرؓ کے پاس آیا، تو آپ نے فرمایا ''کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟'' میں نے کہا ''نہیں! ابھی تو کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔'' اس پر آپ نے فرمایا کہ ''پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ، جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لے کر آنا۔'' [1]

یہ واقعہ صاف بتا رہا ہے کہ سعید، اپنی روزی آزادانہ طور پر کما رہا تھا، اپنی آمدنی میں سے حکومتی واجبات ہی ادا کر رہا تھا، وہ سارے کا سارا زائد از ضرورت مال نہیں دے رہا تھا، لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ اپنے پورے عفو المال کو حکومتی واجبات کے طور پر جمع کروا رہا تھا، تو پھر خود خلیفہ کا اسے مال واپس کر دینا، یہ معنٰی رکھتا ہے کہ وہ، سعید کو، اس کی ضرورت سے زائد مال دے رہے تھے، اور لوگ، اس دور میں ''نظامِ ربوبیت'' کا نشانہ نہیں بنے ہوئے تھے، اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمرؓ، سعید کو بھی، یہ واجبات واپس نہ کرتے۔

---

[1] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۳۶۸

۷۔ دیا ہی کیا ہے جو چھینا جائے؟:

بقول پرویز صاحب، حضرت عمرؓ، اپنے قریبی احباب کو کم مراعات دیا کرتے تھے، اس کی وضاحت میں، وہ یہ واقعہ درج کرتے ہیں۔

''ایک دفعہ، آپؓ نے کسی رفیق سے کہا کہ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں، اور تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں'' انہوں نے کہا کہ ''خدا کے لیے مجھے بخشئے، ایسا نظر آتا ہے کہ جو مراعات مجھے اس وقت حاصل ہیں، ان میں سے کچھ چھیننے کا ارادہ ہے''، اللہ اکبر۔ سربراہِ مملکت سے جس قدر قریبی تعلق، اتنی ہی کم مراعات۔'' [۱]

سوال یہ ہے کہ ''نظام ربوبیت'' کے نفاذ پذیر ہونے کے باعث، ہر شخص کو ملتا ہی قدرِ ضرورت کی حد تک تھا، تو پھر اس سے لیا کیا جا سکتا تھا؟ اور رزق کفاف کے علاوہ وہ مراعات تھیں کیا، جو لوگوں کو ملا کرتی تھیں؟ اور جن کے چھینے جانے کا خوف، رفیقِ عمرؓ کو لاحق ہو رہا تھا؟ اور اگر واقعتاً، انہیں حد ضرورت سے بڑھ کر بھی، کچھ مراعات حاصل ہو رہی تھیں، تو پھر ''نظام ربوبیت'' کے نفاذ کا دعویٰ بے بنیاد ٹھہرتا ہے، حق یہی ہے کہ رزقِ کفاف سے بڑھ کر، اگر کسی کے پاس کچھ تھا، تو وہ ان کی مکسوبہ دولت تھی، جسکی ملکیت، انہیں حاصل تھی۔

۸۔ اولیاتِ عمر اور زکوٰۃ:

جن نئے امور کے بارے میں، حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ حکومت میں فیصلے کیے، انہیں اولیات عمرؓ کہا جاتا ہے، ان میں سے ایک زکوٰۃ سے متعلق بھی ہے، چنانچہ پرویز صاحب رقمطراز ہیں۔

''دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر، زکوٰۃ (حکومت کا ٹیکس) عائد کیا۔'' [۲]

''مفکر قرآن'' کی اس عبارت میں، سب سے پہلی بات جو کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کو حکومتی ٹیکس قرار دیتے ہیں، حالانکہ زکوٰۃ، کوئی ٹیکس نہیں ہے بلکہ ''مالی عبادت'' ہے،

---

[۱] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۱ [۲] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۸۰

ٹیکس اور عبادت میں، بنیادی تصور کے لحاظ سے، نیز اخلاقی روح کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، کارندگانِ حکومت اور زکوٰۃ دہندگان میں، اگر ''عبادت'' کی بجائے ''ٹیکس'' کی ذہنیت پیدا ہو جائے تو یہ، اُن اخلاقی اور روحانی فوائد کو بالکل ہی ضائع کر دے گی جو زکوٰۃ کا مقصود اصلی ہیں، یہ بہر حال، ایک جملہ معترضہ ہے۔

پرویز صاحب کے اقتباسِ بالا کی رو سے، دریائی پیداوار اور گھوڑوں کے بارے میں، جو کچھ عائد کیا گیا، اسے اگر، علماء کرام کے نقطۂ نظر سے زکوٰۃ کہا جائے، تو وہ بھی کل مکسوبہ دولت کا ایک قلیل جزو (اڑھائی فیصد) ہوتا ہے، اور اگر اسے دور حاضر کی زبان میں، ٹیکس کہا جائے، تب بھی وہ مال مکسوب کا مختصر حصہ ہی قرار پاتا ہے، ٹیکس دینے کے بعد، بقیہ رقم، افراد کی ذاتی ملکیت ہی ہوا کرتی ہے، الغرض، زکوٰۃ ہو یا ٹیکس، یہ بجائے خود، افراد کی ذاتی ملکیت کا واضح ثبوت ہیں، خود پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ، اگرچہ زکوٰۃ و انفاق فی سبیل اللہ سے، ایک طرف، خستہ حال افراد کی پرورش کا سامان بہم پہنچتا ہے، تو دوسری طرف، معطیٔ مال اور مُنفق فی سبیل اللہ کا اپنا قلب، حبّ مال کی خباثت سے پاک ہو کر، اس میں ایثار و قربانی کے جذبات، پروان چڑھتے ہیں، لیکن

''یہ دوسرا مقصد، اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان، ارادہ و اختیار کے باوجود، اپنی پاک کمائی اور جائز ملکیت میں سے بہ خوشی خرچ کرے۔''[1]

لہٰذا، اگر حضرت عمرؓ نے دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کی تھی، (اور فی الواقعہ کی تھی) تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دورِ فاروقی میں، افراد معاشرہ کے ہاں، فاضلہ دولت کا وجود اور ذاتی ملکیت کا حق، موجود و محفوظ تھا۔

۹- واقعہ حاطب ابن ابی بلتعہ:

یہ واقعہ بھی، اپنی جملہ جزئیات کے ساتھ، نفاذ ''نظام ربوبیت'' کی نفی کرتا ہے:

''حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ، بڑی اہمیت رکھتا ہے، انہوں نے

---

[1] تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۷ + طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۱

ایک شخص کا اونٹ چُرا کر ذبح کر کے کھالیا، ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہوگیا، آپؓ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے، ان سے پوچھا کہ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟۔'' انہوں نے کہا کہ ''حاطب ہم سے کام تو سخت لیتا ہے، لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا، ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔''

''یہ سن کر آپؓ نے غلاموں کو تو معاف کر دیا، اور حاطب کو بلا کر کہا کہ ''چاہیے تو یہ تھا کہ چوری کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے، کہ اس جرم کے مرتکب، تمہارے غلام نہیں، بلکہ تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے، لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں، اس دفعہ تو اتنی ہی سزا کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت، اس کے مالک کو ادا کر دو، اگر آئندہ، تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہوگئی تو پھر تمہارے لیے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔'' [۱]

اس واقعہ سے، سب سے پہلی بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک بھی، چوری کی سزا (بغیر اس امتیاز کے کہ، چور نے پہلی مرتبہ چوری کی ہے یا وہ عادی مجرم ہے) قطع ید، یعنی ہاتھ کاٹنا ہی ہے، نہ کہ کچھ اور۔

باقی رہا نفسِ واقعہ، تو وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جس ''نظام ربوبیت'' کے نفاذ کو، بلکہ اس کی تکمیلی شکل کو، حضرت عمر کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ حقائق کے قطعی خلاف ہے، کیونکہ اگر واقعی، اس ''نظام ربوبیت'' کا پھندا، لوگوں کی گردنوں میں پڑا ہوا ہوتا، تو، ان کے پاس، زائد از ضرورت مال سرے سے موجود ہی نہ ہوتا، اور نہ ہی حضرت عمرؓ، ایسی صورت میں، حاطب کو یہ حکم دیتے، کہ ''مالکِ شتر کو اس کی قیمت ادا کر دو''۔ اور جب اس حکم کے نتیجہ میں، حاطب نے اونٹ کی رقم، مالک کو ادا کر دی، تو مالک کے پاس، وہ رقم عفو

---

[۱] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۴۵

المال ہی قرار پائی ہوگی، جو یقیناً ''نظام ربوبیت'' کے منافی ہے، سیدھی سی بات ہے کہ اگر اونٹ، مالک کے پاس، حدِ ضرورت تک محدود ہوتا تو اس کے مسروق اور مذبوح ہو جانے کے بعد، بیت المال ہی سے اونٹ دیکر اس کی' ضرورت پوری کر دی جاتی، لیکن، اگر مالک کے پاس، یہ اونٹ، پہلے ہی زائد از ضرورت ہونے کے باعث، اس کے عفو المال میں شامل تھا، تو ذبح ہونے کے بعد، اس کی وصول شدہ قیمت کی بھی یہی حیثیت تھی۔

خوراک کا راشن، بیت المال سے:

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے، سوال یہ ہے کہ لوگ، دورِ فاروقی میں، اپنی خوراک کیسے پاتے تھے؟ پرویز صاحب ''شاہکار رسالت'' میں، فہرستِ عنوانات کے صفحہ ۲۱ پر یہ عنوان قائم کرتے ہیں...... ''وظائف کے علاوہ، خوراک بھی، ہر ایک کو بیت المال سے ملتی تھی صفحہ ۳۹۸''، پھر متعلقہ صفحہ ۳۹۸ پر، یہ عبارت مرقوم ہے۔

> ''یہ نقد وظائف، خوراک کے علاوہ تھے، جو ہر ایک کو بیت المال کے مودی خانہ سے ملتی تھی، یہ طے کرنے کے لیے، کہ فی کس، کسقدر خوراک دی جائے، آپؓ نے معمول کے مطابق، عملی طریق اختیار فرمایا، آپؓ نے ایک جریب آٹا پکوا کر، اپنے سامنے لوگوں کو کھلایا اس سے تیس آدمی سیر ہو گئے، پھر اسی طرح شام کو پکوا کر کھلایا، اور جب اطمینان کر لیا کہ اتنا آٹا فی کس کافی ہوتا ہے، تو اس کے مطابق، ہر ایک کا راشن مقرر کر دیا، اسی کے مطابق، آپ نے اپنے عمال کو بھی ہدایات بھیجیں، اور اس کے ساتھ ہی تاکید کر دی کہ ''لوگوں کو خوراک، ان کے گھر پہنچاؤ، اور اتنا دو جس سے ان کا اور ان کے بچوں کا گزارا ہو سکے، یاد رکھو! مٹھی مٹھی دینے سے، لوگوں کے اخلاق، درست نہیں ہو سکتے۔'' [1]

لیکن زیرِ نظر واقعہ، یہ ظاہر کرتا ہے کہ حاطب، غلاموں سے کام تو پورا لیتا تھا، لیکن اپنی گرہ سے، جب انہیں خوراک دیتا تھا، تو وہ، ان کا پیٹ بھرنے کے لیے ناکافی ہوتی تھی،

---

[1] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۳۹۸

ظاہر ہے کہ اس معاشرہ میں، غلاموں کی ضروریات (مع خوراک) پوری کرنا، آقاؤں ہی کی ذمہ داری تھی نہ کہ ریاست کی۔ اگر واقعتاً، یہ خوراک، بیت المال ہی سے ملا کرتی، تو حضرت عمرؓ ضرور استفسار فرماتے، کہ جب بیت المال، تمہیں خوراک پوری دیتا ہے، تو تم اپنے غلاموں کی خوراک میں کمی کیوں کرتے ہو، لیکن واقعہ سے جو صورتحال ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنا آزادانہ کاروبار کرتے تھے، اپنی مکسوبہ دولت کے آپ مالک تھے، اسی دولت میں سے، وہ، اپنے جملہ اخراجات پورے کرتے تھے، اسی فاضلہ دولت میں سے، صاحبِ ثروت افراد سے، ایک مخصوص مقدارِ مال (زکوٰۃ) لے کر، بیت المال کے کارندوں کے ذریعہ، ان لوگوں کی طرف لوٹائی جاتی تھی، جو یا تو معاشی دوڑ میں حصہ لینے کے ناقابل تھے، یا حصہ لینے کے باوجود، پیچھے رہ جاتے تھے، ایسے اپاہج یا محروم المعاش یا قلیل الرزق لوگوں کی کفالت، بیت المال کیا کرتا تھا، ہر غنی و خوشحال، امیر و مرفہ الحال، اور صاحبِ ثروت شخص اور ہر کاسبِ رزق کو بیت المال، خوراک فراہم نہیں کرتا تھا، اور یہی وہ فضاء ہے جس میں افرادِ سوسائٹی کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہوتا ہے، اور پھر، وہ رضا کارانہ طور پر، ایثار و قربانی کرتے ہوئے، اپنے عفو المال میں سے، بیت المال کی اعانت کا دم بھرتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً، مزعومہ ''نظامِ ربوبیت'' کے ساتھ، عدم موافقت کو، خود ''مفکر قرآن'' نے بھی محسوس کر لیا تھا، چنانچہ، انہوں نے، اس عدم موافقت کو دور کرنے کے لیے، اور واقعات کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے، اس ''سقم'' کا اظہار بایں الفاظ کیا۔

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً، انتظام یہ تھا کہ ملازموں کے کھانے پینے کی ذمہ داری، ان کے مالکوں پر تھی، لیکن اس میں ایک سقم نظر آیا، یہ سقم، حاطم بن بلتعہ کے ملازموں کے واقعہ میں سامنے آیا، جو جرم و سزا کے فلسفہ کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔'' [۱]

---

[۱] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۸۴ء، صفحہ ۱۲

اس، اظہارِ سقم، کے بعد، پھر بات بنانے کی جس طرح کوشش کی گئی، اسے تو بعد میں دیکھیے، اس اقتباس میں، قطع نظر، اس کے کہ مذکورہ شخص کا نام حاطم نہیں بلکہ حاطب ہے، سب سے پہلے، اس بات پر غور فرمایئے کہ ''مفکر قرآن'' نے حاطب کے ''غلاموں ''کو'' ملازموں'' میں بدل دیا ہے، کیوں؟ اس کا جواب ہر اس شخص پر واضح ہے جو ان کے موقفِ غلامی سے آگاہ ہے، پھر، ازالۂ سقم کرتے ہوئے، بات یوں بنائی گئی ہے۔

''یہ سزائیں، اس وقت دی جا سکتی ہیں، جب ہر فردِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی، پوری ہو رہی ہوں، اس کے لیے، آپؓ نے تمام افرادِ معاشرہ کے وظائف مقرر کر دیئے، خوراک، ہر ایک کو بیت المال کے مودی خانہ سے ملتی تھی۔'' [1]

زیرِ نظر واقعہ میں غلاموں کے مالکوں پر، خوراک و طعام کی ذمہ داری کا جو ''سقم'' پایا جاتا تھا، اب اسے یوں دور کر دیا گیا کہ ہر ایک کو خوراک بھی بیت المال سے ملنے لگ گئی اور وظیفہ بھی۔ گویا پورا ''نظامِ ربوبیت'' نافذ ہو گیا، اور جب حضرت عمرؓ، دنیا سے تشریف لے گئے، تو گویا، نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت تھی اور نہ ہی ذاتی ملکیت تھی۔ یہ سب کچھ ''مفکر قرآن'' کی خلّاقیٔ ذہن کا کرشمہ ہے، ورنہ واقعات کی دنیا میں، اس کا کوئی وجود نہیں ہے، خود حضرت عمرؓ کے پاس، عند الموت، فاضلہ دولت (بصورت مکان) موجود تھی، جسکا ذکر، طلوعِ اسلام میں بھی کیا گیا ہے۔

''اپنے آخری وقت میں، بیٹے کو بلایا، اور کہا ''میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جس قدر، مسلمانوں کے بیت المال سے اپنے اخراجات کے لیے لیا ہے، اس کے بدلے، ان کی اتنی خدمت بھی کر سکا ہوں کہ نہیں، چھوٹا سا مکان، ذاتی ملکیت کا ہے، اسے فروخت کر کے، زرِ ثمن سے بیت المال کا حساب کر دو، تا کہ خدا کے حضور، کم از کم، اس ایک بار سے تو سبکدوش ہو جاؤں۔'' [2]

لیکن حیرت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اضافی مکان کو بیچ ڈالنے کی یہ وصیت کیسے کر

---

[1] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۸۴ء، صفحہ ۱۲ [2] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۸

ڈالی؟ جبکہ خود، اُن کے اپنے ہاتھوں، نافذ ہونے والے ''نظامِ ربوبیت'' نے یہ پابندی عائد کر رکھی تھی، کہ کوئی شخص، اپنی کوئی زمین بھی...... خواہ زرعی زمین ہو یا رہائشی...... فروخت نہیں کر سکتا۔

''زمین، فروخت نہ کرنے کا یہ شرعی حکم، زرعی اراضی تک منحصر نہ تھا بلکہ رہائشی زمینوں پر بھی، اس کا اطلاق ہوتا تھا، یعنی ان کی فروخت کی بھی اجازت نہ تھی، اگر کوئی شخص اپنا مکان فروخت کرنا چاہتا، تو وہ صرف، اسکا ملبہ فروخت کرنیکا حق رکھتا تھا، نہ کہ زمین۔'' [۱]

فروختگیٔ زمین کی ممانعت، اور ملبۂ زمین کو بیچنے کی اجازت کا یہ خود ساختہ اور نرالا اصول ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی شخص، اونٹ تو مفت دینا چاہتا ہو، مگر اس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی کو، اونٹ کی قیمت کے برابر، لیکن اس کے ساتھ ہی بیچنے پر مصر ہو۔ تاہم واقعہ زیرِ نظر میں، حضرت عمرؓ نے، آخری لمحاتِ حیات میں، جو وصیت کی تھی، وہ ملبۂ مکان کو فروخت کرنے کی نہیں، بلکہ زمین سمیت مکان ہی کو بیچنے کی تھی، پھر زمین اور ملبۂ زمین میں، اس تفریق کو پیدا کرنے کی دھن میں طلوعِ اسلام کو، یہ بھی یاد نہ رہا کہ عہدِ فاروقی میں، بقول اس کے، ''نظامِ ربوبیت'' کے نفاذ کے باوجود، خریدار کے پاس وہ فالتو دولت کیسے آ گئی، جو اُس نے، قیمتِ زمین کے طور پر پیش کی تھی؟ کیا یہ امر ''مفکرِ قرآن'' کے موقف کو قطعی بے بنیاد قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے؟

۱۰۔ شہادت عمرؓ، قتل عمد پر ادائیگی دیت:

شہادتِ عمرؓ، ایک سازش کا نتیجہ تھی، قتلِ عمرؓ کے بعد، ان کے خاندان میں کیا ردِّ عمل واقع ہوا، اسے پرویز صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''حضرت عمرؓ کے بیٹے، حضرت عبیدؓ اللہ کو جب اس سازش کا یقین ہو گیا تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ باپ کے قتل کے قصاص کے لیے، جوش میں

---

[۱] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۱ء، صفحہ ۵۲

اٹھے، تلوار ہاتھ میں لی، پہلے ہرمزان کو قتل کیا، پھر جفینہ کو، اس کے بعد، ابولولوٗ فیروز کی ایک صغیر السن بیٹی نظر آئی، تو اسے بھی قتل کر دیا، لوگوں نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا۔

ضمناً، حضرت عبید اللہؓ کا یہ اقدام، اسلام کے قانونِ عدل کی رو سے درست نہ تھا، چنانچہ بعد میں، ان پر مقدمہ چلایا گیا، حضرت علیؓ نے ان کے قتل کیے جانے کا مشورہ دیا، لیکن خلیفۃ المسلمین، حضرت عثمانؓ نے خود خوںبہا ادا کر کے معاملہ کا تصفیہ کر دیا۔'' [1]

اس واقعہ سے، سب سے پہلے، تو یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہ صریحاً، تہرے قتل کا مقدمہ تھا، جس میں خود خدائے قدوس نے، دیت کے معاملہ کو جائز رکھا ہے، عہدِ نبوی میں، قتلِ عمد میں دیت پر فیصلے ہوئے، عہدِ صدیقی اور دورِ فاروقی میں بھی دیت کا یہ قانون، عرفاً، شرعاً، عدالتاً برقرار رہا، اب شہادتِ عمرؓ کے ردعمل میں، قتل کے اس تہرے مقدمے میں، خلفیہ ثالث، حضرت عثمانؓ نے دیت ہی پر فیصلہ فرمایا، لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کو، اللہ تعالیٰ سے، رسولِ خدا سے، خلیفہ اول ابوبکرؓ سے، خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ سے، اور تیسرے خلیفہ، عثمانؓ وغیرھم، ان سب سے اختلاف ہے، اور ان سب کے علی الرغم، ہمارے ''مفکرِ قرآن'' قتلِ عمد میں دیت کے قائل ہی نہیں، مگر یہاں، اس واقعہ میں، انہیں مجبوراً، اقرار کرنا پڑا، خدا کسی کو ایسا مجبور نہ کرے۔

رہا نفسِ واقعہ، تو ظاہر ہے کہ تینوں مقتولین کی دیت، حضرت عثمانؓ نے، یا تو اپنی جیب سے ادا کی ہوگی یا پھر بیت المال سے۔ اگر پہلی صورت ہو تو صاف ظاہر ہے کہ ان کے پاس فاضلہ دولت موجود تھی، جس میں سے یہ رقم دیت ادا کی گئی، لیکن اگر دوسری صورت ہو، تو جن کے حوالے، خون بہا کی رقم کی گئی، ان کے پاس، یہ، فاضلہ دولت کی حیثیت اختیار کر گئی، کیونکہ بیت المال سے بقولِ پرویز، انہیں خوراک بھی مل رہی تھی، اور وظیفہ بھی۔ اب

---

[1] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۴۲۸

اگر دیت کی رقم، انہیں دی گئی، تو یہ رقم، ضرورت سے زائد مال ہی قرار پا سکتی ہے، جس سے یہ بات، پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے، کہ حضرت عمرؓ کی وفات تک بھی، لوگوں کی گردیں، الحمد للہ، اس نام نہاد ''نظامِ ربوبیت'' سے آزاد تھیں، جسے قرآن کے جعلی پرمٹ پر اشتراکیت سے درآمد کیا گیا ہے۔ تِلکَ عَشَرَة کاملة

صدرِ اسلام کے معاشی نظام کی خصوصیات:

حقیقت یہ ہے کہ عہدِ فاروقی کے بہت سے واقعات میں سے، یہ صرف دس واقعات ہیں، جو اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ صدرِ اسلام میں :-

۱...... ذاتی ملکیتِ مال و دولت اور نجی ملکیتِ اراضی کا اصول قائم تھا۔

۲...... لوگوں کے پاس، فاضلہ دولت، موجود تھی، جس میں سے وہ، صدقہ و خیرات، زکوٰۃ و فطرانہ، خون بہا کی ادائیگی، بصورتِ نکاح بیویوں کو رقمِ حق مہر کی سپردگی، آزادیٔ غلاماں میں انفاق، قرض کا لین دین، تقسیم ترکہ، اور نتیجتاً انتقالِ جاگیر و جائیداد، (خواہ زرعی ہو یا سکنی) بذریعہ بیع و شراء یا بذریعہ میراث، وغیرہ جملہ امور میں صرفِ مال کیا کرتے تھے، یہ سب کچھ، فاضلہ دولت، اور زائد از ضرورت مال کے وجود کو مستلزم ہے۔

۳...... بیت المال سے خوراک کا راشن، صرف ان لوگوں کو ملتا تھا، جو محروم الرزق یا قلیل المعاش تھے، (وَفِي اَموَالِهِم حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالمَحرُوم)، رہے، اغنیا، متمول، خوشحال اور صاحب ثروت لوگ، تو وہ اس امر کے محتاج نہ تھے کہ بیت المال سے، ان کو خوراک و غذا فراہم کی جاتی، اور وہ بھی حد کفاف کی حد تک۔ بلکہ ایسے مرفہ المال اور کثیر المال لوگ، تو خود، بیت المال کی خوشحالی اور اس کے استحکام کا سبب تھے۔

۴...... رہا وہ ''نظامِ ربوبیت'' جسے ''مفکر قرآن'' کے سامری دماغ نے، محض تسویلِ نفس کے زور پر، ایجاد کیا، اور صدرِ اسلام میں، اس کے نفاذ کا ڈھنڈورا پیٹا، تو وہ واقعات کی دنیا میں، اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا، عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں، خوردبین لگا کر

دیکھنے سے بھی، اس کا سراغ نہیں ملتا۔

(ج) عہدِ عثمانی:

ہمارا جی چاہتا ہے کہ ایسے دلائل و واقعات، ہم عہدِ عثمانی کے بارے میں بھی پیش کریں، جن سے ''مفکر قرآن'' کے خلافتِ راشدہ میں ''نظامِ ربوبیت'' کے ڈھول کا پول کھل جاتا، مگر ایسا کرنے سے، ہم صرف اس لیے گریزاں ہیں کہ ''مفکر قرآن'' نے اپنے اندھے مقلدین کو یہ باور کروا رکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا دورِ خلافت ہی وہ زمانہ ہے، جس میں، سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمینداری کا آغاز ہوا، جو بالآخر ''نظامِ ربوبیت'' کے تدریجی خاتمے پر منتج ہوا۔

> ''حضرت عثمانؓ کے عہد تک زمینیں، خود مملکت کی ملکیت ہوا کرتی تھیں، افراد کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں، سب سے پہلے، حضرت عثمانؓ نے اس کو جائز قرار دیا، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ انہوں نے کن حالات میں یہ تبدیلی کی تھی، اور اس تبدیلی میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے بلکہ ہمیں یہاں صرف اس امر پر بحث کرنی ہے کہ مسلمانوں میں ۳۰ھ تک زمینداری اور جاگیرداری کا کوئی وجود نہ تھا، اس کی ابتداء، حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے ہوئی ہے، اور جب ایک دفعہ یہ دروازہ کھل گیا تو پھر اس سیلاب کو کوئی نہ روک سکا تاآنکہ پوری کی پوری ملت، اس کے اندر ڈوب گئی۔
>
> یہ تھی مسلمانوں میں زمینداری کی ابتداء...... تاریخ کی روشنی میں۔'' [1]

یاد رہے کہ یہ اقتباس طلوعِ اسلام میں چھپنے والے جس مقالہ سے ماخوذ ہے، اس میں حقائق کو جی بھر کر مسخ کیا گیا ہے، اور حضرت عثمانؓ کو قرآنی نظامِ معیشت کا ''کھلا دشمن'' کہنے میں تو تامل کیا گیا ہے، لیکن ان کے دورِ حکومت کا نقشہ، اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اسے دیکھ کر قاری خود بخود، اپنے ذہن میں، اس تصور کو ابھرتا ہوا پاتا ہے کہ وہ ''قرآنی نظام'' کے

---

[1] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ٦٦

مخالف تھے، اور سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمینداری کے حامی اور بانی تھے۔

رہا حضرت علیؓ کا دورِ حکومت، تو چونکہ وہ بھی ''اسی سیلاب میں ڈوب چکا تھا جسکا دروازہ عہدِ عثمانی میں کھل چکا تھا'' اس لیے علوی دور کے واقعات و دلائل پیش کرنا بھی بے سود ہے۔ اس لیے دورِ فاروقی ہی کے دلائل پر اکتفاء کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔

☆......☆......☆

باب دہم

''مفکرِ قرآن'' اپنے تضادات کے آئینہ میں

حقیقت یہ ہے کہ ''نظامِ ربوبیت'' کے نام پر، ''مفکرِ قرآن'' نے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ سراسر ان کا خود ساختہ نظام ہے، بلکہ صحیح تر الفاظ میں، یوں کہنا چاہیے کہ وہ فی الواقعہ، اشتراکیت ہی ہے جس پر قرآن کا ٹھپہ لگا کر، انہوں نے پیش کر دیا ہے، غلام فطرت لوگ، جب خارجی افکار و نظریات سے مرعوب و مغلوب ہو جاتے ہیں، تو ان کی غلامانہ ذہنیتیں، غالب تہذیب اور فاتح تمدن کی ہر قدر کو شرفِ تقدم عطا کرتی ہیں، اور اپنی ہر قدر، انہیں، دریا برد کرنے کے قابل نظر آتی ہے، پھر یہ فکری اسیری اور ذہنی غلامی، انہیں ایسا رویہ اختیار کرنے پر اکساتی ہے جسے مرعوبانہ منافقت کے علاوہ، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، اور جس کے نتیجہ میں، فکر و نظر کے اعتبار سے، غلامی و محکومی تو اختیار کی جاتی ہے تہذیبِ غالب کی، لیکن غالب تہذیب کے نام پر نہیں، بلکہ قرآن اور اسلام کے نام پر۔ ''مفکرِ قرآن'' کی عمر بھر کی ''قرآنی خدمات'' کا ماحصل، اگر ایک جملہ میں بیان کیا جائے، تو وہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ...... ''انہوں نے دورِ حاضر کی غالب مادی تہذیب اور بے خدا تمدن کے جملہ عناصرِ معاشرت کو، اشتراکیت کے مکمل معاشی نظام کے ساتھ، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا ہے''...... میں اپنی کم سنی کے دور میں، اس امر سے ناواقف تھا کہ ذہنی غلامی کس طرح، اسلامی عقائد و مسالک اور اس کی اخلاقی اقدار میں تغیر و تبدل بلکہ تحریف و ترمیم کا ذریعہ بنتی ہے لیکن کتبِ پرویز کے مطالعہ نے، فی الواقعہ، اس امر کو واضح کر دیا ہے۔

''مفکرِ قرآن'' نے جس طرح، رَجعت الی القرآن کے خوش آئند نعرہ کی آڑ میں، قرآن سے صاحبِ قرآن ﷺ کا تعلق توڑ کر، مغربی مفکرین اور فلاسفہ سے اپنا تعلق جوڑا ہے، اور

مغرب کی فاسد معاشرت کے جملہ عناصر کو، جس طرح قرآن کے نام پر قبول کیا، اور اپنی ہر قدر اور روایت کو ''عجمی اسلام'' قرار دیکر رد کیا ہے، غلام فطرت ذہنوں کے اصل ہدفِ مقصود کو واضح کر دیتا ہے، اسی ہدف کو پالینے کے لیے، اور اسی فکری اسیری کے نتیجہ میں، کارل مارکس کی اشتراکیت کو رولڈ گولڈ کر کے ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے نام سے، اسے مشرف بالاسلام کرتے ہوئے، جو پاپڑ بیلے گئے ہیں، وہ ایک الگ داستان ہے، ''مفکر قرآن'' اشتراکی حضرات کو یہ کہہ کر مطمئن کرتے ہیں کہ کمیونزم کا نظامِ معیشت، ہمارے قرآنی نظامِ معیشت کے مماثل ہے، اور مسلم طبقہ کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ اشتراکیت کا فلسفۂ حیات، اسلامی فلسفۂ حیات سے کلی منافات رکھتا ہے، وہ، اشتراکی ڈھانچۂ معیشت کو تو اسلامی معیشت قرار دیتے ہیں مگر اس کے ڈھانچہ ساز (کارل مارکس) کو مسلمان کہنے سے گریزاں رہتے ہیں، اس طرح اشتراکی حضرات سے بھی ایک گونہ تعلق ہے اور مسلمانوں سے بھی۔

وہ قرآنی مفردات میں، اپنی مرعوبانہ ذہنیت اور فکری غلامی کے باعث، نئے مفاہیم و معانی داخل کرتے ہیں اور قرآن کے بنیادی معنٰی کی آڑ لیتے ہیں، وہ تفسیر قرآن کے دوران، آیات میں واقع باہمی خلاء کو، اپنی ذاتی رائے سے پُر کرتے ہیں، اور پھر اسے منسوب الی القرآن کر ڈالتے ہیں، لیکن زبان پر نعرہ یہ رکھتے ہیں کہ **القرآن یفسر بعضه بعضا**. وہ صوفیاء کرام کے باطنی معانی کی جس قدر، پر زور تردید کرتے ہیں، مجازی معانی کی آڑ میں، اسی قدر خلافِ حقیقت مفاہیم کو خود قبول کرتے ہیں حالانکہ الفاظ کے مجازی معانی، صرف وہی قابل قبول ہوتے ہیں، جو اہلِ زبان کے ہاں، مروّج ہوں، اشتراکیت کو قرآنی بپتسمہ دینے کے لیے، ''مفکر قرآن'' ایسی ہی کاروائیاں کرتے رہے ہیں، حتّٰی کہ اشتراکیت، اُسی طرح، ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' قرار پا گئی، جس طرح زمانۂ قبل از اسلام میں بت، داخلِ کعبہ ہو کر ''خدا'' بن گئے تھے۔

مرعوبانہ ذہنیت کی روش:

آدمی کی حالت، اس وقت بڑی عجیب ہوتی ہے جب وہ فکر ونظر کے اعتبار سے، اپنے اصل نظام سے منحرف ہوکر، کوئی، دوسرا نظام اپنا چکا ہو، مگر اس کی اخلاقی جرأت کا فقدان، اس کے اعلانِ انحراف میں آڑے آرہا ہو، لیکن مصلحت اندیشی، اسے سابق نظام سے وابستہ رہنے پر مجبور کر رہی ہو، تو ایسی حالت میں، اپنے سابق نظام کی ایک ایک چیز کو، وہ اپنے مزاج کے خلاف پاتا ہے، اُسے دھیڑ کر نئے نظام کے مطابق، بُننے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس حزم واحتیاط کے ساتھ کہ اُسکی اُدھیڑ بُن کی یہ کاروائی، لوگوں کی نگاہ سے مخفی ہی رہے، ''مفکر قرآن'' کی عمر بھر کی تگ وتاز، یہی رنگ لیے ہوئے ہے، وہ اپنی فکری زندگی کے ایک موڑ پر، قرآن کے جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر، اشتراکیت کی پگڈنڈی کو اختیار کرتے ہیں، مگر اس خوش فہمی یا فریبِ نفس کے ساتھ کہ وہ اب بھی راہِ راست پر ہیں، چنانچہ خود کو ایسا ثابت کرنے کے لیے، وہ سخنسازی، تاویل، تحریف، کھینچ تان، اور خدع وفریب کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں، اب قرآن کی ایک ایک آیت، جو ذاتی ملکیت پر دلیل قاطع ہے، ان کے ہاتھوں مسخ وتحریف کا نشانہ بنتی ہے، حکم زکوٰۃ، جو اگرچہ بجائے خود، ملکیتِ مال کی دلیل ہے، مگر اب فکر ونظر کا انحراف، اسے اصل مفہوم کے ساتھ قبول کرنے سے مانع ہے، اور چاہتا ہے کہ اس مفہوم کو یکسر بدل دیا جائے، اسی طرح صدقہ وخیرات اور انفاقِ مال کا حکم بھی ذاتی ملکیتِ مال کو مستلزم ہے، مگر آنکھوں پر اشتراکیت کی عینک چڑھ جانے کے بعد، اب یہ حکم بھی، اسی رنگ میں نظر آرہا ہے جو عینک کا رنگ ہے، نتیجتاً، یہ حکم، قرآن کا دائمی اور مستقل حکم ہونے کی بجائے، ''عبوری دور'' کا ہنگامی اور عارضی حکم قرار پارہا ہے، قانونِ میراث بھی ذاتی ملکیتِ مال پر اساس پذیر ہے، لیکن یہ بھی اب بدلے ہوئے ذہنی سانچہ میں ڈھل کر، اسلام کا کوئی مستقل قانون ہونے کی بنائے، ''عبوری دور'' کا وقتی قانون بن کر رہ گیا ہے، اسی طرح، نکاح میں عورت کا حق مہر پانا، اور قتل کی صورت میں دیت کا ادا کرنا، یہ سب کچھ ذاتی ملکیت کے اصول پر استوار معاشرہ ہی میں ممکن ہے، لیکن

منحرف شدہ مزاج، انہیں بھی اپنے خلاف پاتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ تمام امور، تاویل کے خراد پر چڑھ کر، نئے نظام سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ یہ لغات القرآن میں نئے مفاہیم کو گھسیڑنے کی کوہ کنی، یہ تفسیرِ قرآن کے نام پر، تمدنِ جدید اور غالب تہذیب کے تصورات کو داخلِ قرآن کرنے کی جدوجہد، یہ صدقہ وخیرات کے منطوق و مدلول میں تغیر و تبدّل کی کاوشیں، یہ احکامِ میراث کو، مستقل قرآنی قانون ماننے کی بجائے، انہیں عبوری دور کی ہدایات قرار دینے کی مساعی و جہد، یہ سب کچھ عجلِ اشتراکیت کی اسی محبت کا کرشمہ ہے، جو قلب وذہن ہی نہیں بلکہ جسم کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے، پرویز صاحب، اگر ابتداء ہی سے جادۂ اشتراکیت پر گامزن رہتے، اور اسے ہی صراطِ مستقیم قرار دیتے، تو یقیناً ان کے پیروکاروں کی تعداد، ان کے موجودہ اتباع کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی، کیونکہ کسی شخص کا ایک راستہ ترک کر کے، دوسرا راستہ اختیار کرنا، اور پھر اسے راہِ راست بھی قرار دینا، ایک ایسا منافقانہ رویہ ہے، جسکی نسبت خالص کفر کا رویہ، بہرحال، بہتر سمجھا جاتا ہے، اسلام کے راہِ راست پر رہیئے تو بھی دنیا میں، بوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی طرح، دنیا کی قیادت و سیادت مل سکتی ہے، اور آخرت کی فوز وفلاح، اس پر مستزاد ہے، خالص کفر کو اپنایئے، تب بھی، آخرت نہ سہی، کم ازکم، دنیا تو فرعون ونمرود کی طرح مل ہی جائے گی، لیکن اگر عبداللہ بن ابی کا رویہ اپنایئے، تو نہ دنیا ہی ملے گی اور نہ آخرت ہی ہاتھ آئے گی، **خسر الدنیا والاخرۃ** ''مفکر قرآن'' کا فی الواقعہ یہی رویہ رہا ہے، یہاں کچھ، وہاں کچھ، کبھی کچھ، کبھی کچھ، آج کچھ، کل کچھ، پوری زندگی، ادھر سے اُدھر لڑھکتے رہے، اور قرآن کو بھی اپنے ساتھ لڑھکاتے رہے، قرآن کی طرف، متضاد تصورات منسوب کر کے، یہ تاثر ابھارتے رہے کہ کتاب اللہ بجائے خود ''تضادات کا پلندہ'' ہے، حالانکہ قرآن، اس الزام سے قطعی بالاتر ہے، تضادات کا پلندہ، بہرحال، ''مفکر قرآن'' کا نہاں خانۂ دماغ ہے، جس سے متضاد اور متناقض نظریات برآمد ہوا کرتے تھے، اور پھر انہیں منسوب الی القرآن کر دیا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ کتبِ پرویز، اور طلوعِ اسلام کی پوری فائل، سب کی سب، تضادات سے

اٹی پڑی ہیں، مگر وہ خود اپنے تضادات کی طرف دیکھنے کی بجائے، اپنے مخالفین کے (اور بالخصوص مولانا مودودیؒ کے) تضادات کی کھوج کرید کر کے، انہیں، اُبھار اُبھار کر، اعادہ و تکرار کے ساتھ، نمایاں کیا کرتے تھے، تاکہ ''مفکر قرآن'' کے خود اپنے تضادات کی طرف، لوگوں کی نگاہیں اٹھ ہی نہ سکیں، اور لوگ، خود انہیں تضادات سے بالاتر سمجھتے رہیں۔

قرآن سے اشتراکیت کی طرف:

قرآن سے اشتراکیت کی طرف، فکری سفر کے دوران، قدم قدم پر، ان کا رویہ، متضاد اور متناقض رہا ہے، قرآن، بہرحال، ایک ایسی الہامی کتاب ہے جس میں، قدم قدم پر، ذاتی ملکیت اور نجی پراپرٹی کے اصول کو، اسلامی معاشرے کی ایک طے شدہ پالیسی سمجھ کر، احکام و ہدایات دیئے گئے ہیں، مگر اشتراکیت، ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتی، اس لیے قرآنی تعلیمات کو، اشتراکیت کے سانچہ میں ڈھالنے کے لیے، ''مفکر قرآن'' کی پوری مساعی، تضادات کا وسیع خارزار بن کر رہ گئی ہے، لیجیے، آپ بھی اس خارزار میں آبلہ پائی کیجیے، یہ ہے تو ایک تکلیف دہ بات، لیکن اگر اسے تلاشِ حق کے عزمِ صمیم سے، اختیار کیا جائے تو یہی آبلہ پائی، راحت و مسرت کی موجب قرار پائے گی۔

ان آبلوں سے پاؤں کے، گھبرا گیا ہوں میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

ا۔ اشتراکیت اور قرآن، آج اور کل:

ایک وقت تھا، جب پرویز صاحب نے، ''سوشلزم اور اسلام'' کے زیرِ عنوان، اپنے مقالہ میں، دین اسلام اور اشتراکیت میں لمبا چوڑا موازنہ کر کے، یہ فرمایا تھا کہ

''غرض، اصل اور فرع، دونوں میں اشتراکیت، قرآن کے سراسر خلاف ہے۔'' [1]

لیکن جب قلب و نظر کی دنیا میں تغیر واقع ہوا، تو ان کے قیل و قال کی دنیا ہی بدل گئی،

---

[1] تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۳۳

اور پھر یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ:

''یاد رکھیے، اسلام خود ایک سوشلسٹ نظام تھا، یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔'' [۱]

۲۔انفرادی ملکیت، تب اور اب:

کل تک، جب وہ اشتراکیت کے اثر سے بالاتر تھے، یہ کہا کرتے تھے کہ

''اشتراکیت، ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام، ہر شخص کی کمائی کو، اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔'' [۲]

لیکن آج، جب، وہ، اشتراکیت کے گھاٹ سے سیراب ہو چکے ہیں، تو قرآنی نظامِ معیشت کے متعلق، ان کا فرمان یہ ہے کہ:

''اس نظام کی رُو سے آپ دیکھئے کہ (i) نہ تو زمین، کسی کی انفرادی ملکیت میں رہتی ہے اور (ii) نہ ہی فالتو روپیہ (Surplus Money) کسی کے قبضہ میں رہتا ہے۔'' [۳]

۳-آیت (۲/۲۱۹) کا ترجمہ، کل اور آج:

نخچیرِ اشتراکیت ہونے سے قبل، پرویز صاحب، آیت (۲/۲۱۹) کا ترجمہ یوں کیا کرتے تھے۔

یسئلونك ماذا ینفقون قل العفو (۲/۱۲۹)

''آپؐ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے کہ جتنا آسان ہو۔'' [۴]

لیکن، اشتراکیت کا جادو، ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا، تو ترجمۂ آیت بھی بدل گیا۔

''یہ تجھ سے (اے رسول) پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر اپنے پاس رکھیں اور کسقدر منفعتِ عامہ کے لیے دیں؟ **قل العفو**، ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔'' [۵]

---

[۱] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۸ — [۲] تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۳

[۳] طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۴۰ — [۴] تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۷

[۵] طلوع اسلام، جون ۱۹۵۹، صفحہ ۱۶

۴۔ حکم قل العفو، دائمی یا ہنگامی؟:

ایک زمانہ تھا، جب ''مفکر قرآن'' کہا کرتے تھے کہ **قل العفو** کا حکم، ہنگامی حالات سے تعلق رکھتا ہے، یعنی اگر کبھی حکومت پر کوئی ایسی افتاد آن پڑے کہ وہ افراد کی زائد از ضرورت ساری دولت لینے پر مجبور ہو جائے، تو **قل العفو** کے تحت وہ ایسا کر سکتی ہے، گویا یہ کوئی دائمی اور مستقل حکم نہیں ہے، بلکہ ہنگامی اور عارضی حکم ہے، چنانچہ اس کی وضاحت وہ شرح زکوٰۃ کی ''تغیر پذیری'' پر بحث کرتے ہوئے، بایں الفاظ کرتے ہیں۔

> ''سارے قرآن میں دیکھ لیجیے، کہیں بھی، اس کی شرح مقرر نہیں کی گئی، ظاہر ہے کہ یہ شرح، مختلف زمانوں میں، حکومت کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہے گی، کبھی شاید ایسا وقت بھی آ جائے کہ حکومت کو ٹیکس کی ضرورت ہی نہ پڑے، اور کبھی ایسی اجتماعی اور ہنگامی ضروریات لاحق ہو جائیں کہ افراد کے لابدی اخراجات کے بعد، جو کچھ بچے، سب کچھ حکومت کو لے لینا پڑے (**قل العفو** کے یہی معنٰی ہیں)۔'' [1]

لیکن، جب وہ اشتراکیت کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے، تو پھر زکوٰۃ کی شرح کیا معنٰی، سرے سے زکوٰۃ کا مفہوم ہی بدل گیا، **قل العفو** کا جو حکم، ہنگامی حالت کے لیے تھا، وہ قرآنی نظام کی مستقل پالیسی ہی نہیں بلکہ دائمی اساس بھی قرار پا گیا۔

> قرآن کی زبان میں، فاضلہ دولت کو العفو کہہ کر پکارا گیا ہے، اس کے نظام میں العفو کسی کے پاس رہتا ہی نہیں، **ویسئلونك ماذا ینفقون قل العفو** (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر، دوسروں کی ضروریات کے لیے دیں، کہو کہ جس قدر، اپنی ضرورت سے زائد ہو، سب کا سب۔'' [2]

۵۔ احکام صدقہ و خیرات، تب اور اب:

کسی بھلے زمانے میں، پرویز صاحب، رشتہ داروں، محتاجوں اور مسافروں کے حقوق

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۴۸ء، صفحہ ۲۲ [2] طلوع اسلام، مئی ۱۹۸۴ء، صفحہ ۳۸

کی ادائیگی کے حکم کو، نیز مال کو بیجا صرف نہ کرنے کی قرآنی تاکید کو، ذاتی ملکیت کی ایسی دلیل قرار دیا کرتے تھے، کہ اس کے بغیر ان احکام پر عملدرآمد ہی ممکن نہ تھا، چنانچہ آیت (۱۷/۲۶) کے تحت، ان کا یہ فرمان تھا کہ:

''ظاہر ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی، اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کوئی چیز، کسی کی ملکیت میں ہو، اگر ہر چیز، غیر کی ملکیت ہو، اور کمانے والے کو صرف، اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے، تو وہ دوسروں کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے۔'' [۱]

لیکن، اشتراکیت کی گنگا سے اشنان کر لینے کے بعد، جب ذاتی ملکیت کے قرآنی اصول سے بھی ہاتھ دھو لیے گئے، تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر ذاتی ملکیت کا وجود ہی نہ رہے تو پھر صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ و انفاق فی سبیل اللہ کے احکام کس لیے؟ اب اس کا جواب یہ تراشا گیا کہ:

''قرآن میں صدقہ و خیرات وغیرہ کے احکام، اس دور سے متعلق ہیں، جب قرآن کا معاشی نظام اپنی مکمل شکل میں ہنوز قائم نہ ہوا تھا۔'' [۲]

۶۔ احکام وراثت اور بدلتا ہوا موقف:

قرآن میں، وراثت کے احکام بھی مذکور ہیں، ان کے متعلق، پرویز صاحب کا موقف کبھی ان الفاظ میں مذکور تھا۔

''یہی حال، ترکہ و وراثت کے احکام کا ہے، جن پر ذاتی ملکیت کی عدم موجودگی میں، عمل ہو ہی نہیں سکتا۔'' [۳]

اشتراکیت میں، چونکہ ذاتی ملکیت کی نفی ہے، اس لیے نہ ہی ذاتی مال ہوگا، اور نہ ہی ترکہ ہوگا جسکی تقسیم کا مسئلہ درپیش ہو، لہٰذا، اشتراکیت میں ذاتی ملکیت کے نہ ہونے کی بناء

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۸ + تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۴

[۲] طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۲۰

[۳] تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۴ + طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۸

پر، یہ جملہ احکام ساقط ہو جاتے ہیں، پرویز صاحب نے، اس پر، اشترا کی حکومت پر طنز کرتے ہوئے، کبھی یہ بھی لکھا تھا کہ:

''خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ وجعلنا موالی ''ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں'' اور مدعیانِ اشتراکیت کہتے ہیں کہ جنہیں اللہ وارث مقرر کرتا ہے، انہیں ہم ورثہ سے محروم کرتے ہیں، کیا مسلمان، ایسے قانون کو برداشت کر سکتا ہے، جو خدائی قانون کا ناسخ ہو۔''[1]

لیکن آج ملکیت کی نفی کرتے ہوئے، خود پرویز صاحب، ان ورثاء کو محرومِ میراث کرتے ہیں جنہیں خود، اللہ تعالیٰ نے وارث مقرر کیا ہے، اور خود ''مسلمان'' بن کر ایسے قانون کو نہ صرف برداشت کر رہے ہیں، بلکہ ''مفکر قرآن'' بنکر، اسے ''نظامِ ربوبیت'' کا جزو لاینفک قرار دے رہے ہیں، اور اشتراکیت کا وہی اصولِ عدمِ ملکیت، اختیار کر کے، اسے قانونِ میراث کا ناسخ قرار دے رہے ہیں۔

۷۔ اعصاب پر اشتراکیت کی سواری:

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کوئی شخص فکر و نظر کی تبدیلی کے باعث، کسی نئے نظام کو قبول کر لیتا ہے، اور پرانے نظام کو بھی، اپنی اخلاقی جرأت کے فقدان کے باعث، یا کسی مصلحت کی بناء پر، چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، تو ایسی کیفیت میں سابق نظام کی ہر چیز، اسے خلافِ مزاج نظر آتی ہے، اور وہ اس کے ایک ایک تار کو ادھیڑ کر، نئے سرے سے بُننے کی کوشش کرتا ہے، اُدھیڑ بُن کی یہ دھن، اس کے قلب و ذہن پر ایسی سوار ہو جاتی ہے کہ وہ ہر لفظ کے مفہوم کو، اپنے ذہنی سانچے میں، ڈھالنے کی کوشش میں جتا رہتا ہے، اور اس بات سے اپنی آنکھیں بالکل بند کر لیتا ہے کہ سیاق و سباق، ان معانی کو قبول کر لینے کا روادار ہے بھی، یا کہ نہیں۔

اشتراکیت سے ذہناً مسخر ہونے کے بعد، پرویز صاحب کو، ہم ایسی ہی کیفیت سے دو

---

[1] تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۶ + طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۰

چار پاتے ہیں، انہوں نے اشتراکی نظامِ معیشت پر قرآنی ٹھپہ لگانے کے لیے، جس آیت کو اہم ترین بنیاد کے طور پر قبول کیا ہے وہ قل العفو والی آیت ہے، قلب و ذہن کی جملہ استدلالی صلاحیتوں کا مرکز یہی آیت رہی ہے، دل و دماغ کی پوری توجہ، اسی آیت پر مجتمع رہی ہے، غور و فکر کے راستے کی آخری منزل، یہی الفاظ رہے ہیں، نگاہوں کا فوکس (Focus) بھی العفو ہی کا لفظ رہا ہے، یہاں تک کہ قرآن کے کسی دوسرے مقام پر بھی، اگر العفو کا لفظ، نگاہوں کے سامنے آ گیا، تو...... اس بھوکے شخص کی طرح، جس سے پوچھا گیا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ تو اس کے منہ سے بے ساختہ یہ جواب نکلا کہ ''چار روٹیاں'' ...... ''مفکرِ قرآن'' نے بھی یہی سوچا کہ اس سے مراد عفو المال ہی ہے جس پر انہوں نے اشتراکیت کے قرآنی ایڈیشن کی بنیاد رکھی، چنانچہ مطالعۂ قرآن کے دوران، پرویز صاحب کی نگاہ، جب آیت (۷/۱۹۹) پر پڑی (جس میں خذ العفو کا لفظ وارد ہوا ہے، اور جو حکمتِ تبلیغ و دعوت کا مضمون لیے ہوئے ہے) تو چونکہ اشتراکیت کی عینک، آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نہ سوجھے، فوراً، ان کا ذہن، مطلق عفو سے ''عفو المال'' ہی کی طرف منتقل ہوا اور حکمتِ تبلیغ سے ہٹ کر، اسے اشتراکی معیشت پر محمول کرتے ہوئے، ترجمہ کر ڈالا، بغیر اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ آیت کا سیاق و سباق، اسے قبول کرنے کے لیے، آمادہ بھی ہے یا نہیں، ملاحظہ فرمائیے، اشتراکیت کے رنگ میں رنگا ہوا مفہومِ آیت۔

خذ العفو و أمر بالعرف و اعرض عن الجاهلين (۷/۱۹۹)

''(بہر حال تم، اے رسول! نظام ربوبیت کے قیام کے سلسلہ میں، عملی پروگرام اختیار کیے رکھو، اس پروگرام کی رو سے، جماعت مؤمنین کا زائد از ضرورت مال، ان کے پاس رکھنے کی بجائے، نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہے گا، اس لیے تو) اس مال کے وصول کرنے کا انتظام کرو، قرآنی قوانین کو عام کرتے جاؤ، اور جہلا سے کنارہ کش رہو کہ وہ ناحق، تمہارا وقت ضائع

نہ کریں۔''[1]

اب، اسی آیت کا وہ مفہوم بھی ملاحظہ فرمایئے جو فی الواقعہ، آیت کے سیاق و سباق سے مناسبت بھی رکھتا ہے اور قواعدِ زبان کے بھی مطابق ہے۔

خذ العفو ..... الجاهلين (۷/۱۹۹)

''(بہرحال، تم ان کی باتوں کی وجہ سے، اپنے پروگرام میں رکو نہیں) تم ان سے درگزر کرتے ہوئے، آگے بڑھتے جاؤ، اور قاعدے اور قانون کے مطابق، انہیں خدا کے احکام دیئے جاؤ، اور جہلاء سے کنارہ کش رہو۔''[2]

یہ چند مثالیں، اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ جب آدمی کا ذہن، کسی نظام سے فکر و عمل کے اعتبار سے منحرف ہو جاتا ہے، اور اسے برملا چھوڑ دینے کی اخلاقی جرأت سے بھی محروم ہوتا ہے، یا کسی مصلحت کے باعث، اس نظام سے وابستہ رہنا بھی، اس کی مجبوری بن جاتا ہے، تو ایسی صورت میں اگرچہ دیانتداری کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ پرانے نظام سے علی الاعلان منقطع ہو جائے، اور جس نئے نظام کو درست جانتا ہے، اسے اختیار کر لے، لیکن پرویز صاحب، یہ دیانتدارانہ راستہ اختیار کرنے کی بجائے، نئے اور پرانے نظام میں موافقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حق و باطل کا ایک مخلوطہ تیار کرتے ہیں، کفر و اسلام کے درمیان بیچ کا راستہ نکالنے میں (**يريدون ان يتخذوا بين ذالك سبيلا**)، چنانچہ وہ اپنے خودساختہ ''نظامِ ربوبیت'' کی صورت میں، اشتراکیت اور اسلام کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتے ہیں، جس میں ایک پہلو، بقول ان کے، اشتراکیت کے مماثل ہے اور دوسرا پہلو، اس کے خلاف ہے، اس کا ایک حصہ ''قرآنی'' ہے اور دوسرا ''غیر قرآنی''۔ اختلاف، جس امر میں پایا جاتا ہے وہ دونوں نظاموں کے فلسفۂ حیات میں ہے، اور اتفاق (بقولِ پرویز) قرآن اور اشتراکیت کے معاشی نظاموں میں ہے۔

''سوشلزم کا معاشی نظام، تو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے، لیکن سوشلزم کا

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۵۵ [2] مفہوم القرآن، آیت ۷/۱۹۹، صفحہ ۳۹۰

فلسفہ، قرآنی فلسفۂ حیات سے، نہ صرف مختلف ہے بلکہ اس کی ضد ہے۔" [۱]

قارئین کی نگاہوں سے، یہ بات اوجھل نہیں رہنی چاہیے کہ ایک زمانہ تھا جب، پرویز صاحب کہا کرتے تھے، کہ:

"غرض، اصل اور فرع، دونوں میں اشتراکیت، قرآن کے سراسر خلاف ہے۔" [۲]

لیکن، اس کے بعد، جب ذہنِ پرویز پلٹتا ہے تو اشتراکیت کے زیرِ اثر، اب قرآنی نظام بھی "ذاتی ملکیت کے خلاف" قرار پاتا ہے اور بڑے شدومد کے ساتھ، اعادہ وتکرار کرتے ہوئے، اسی قرآن کی بنیاد پر، جسے کبھی، ذاتی ملکیت کا علمبردار قرار دیا تھا، اب یہ فرمایا جاتا ہے کہ:

"قرآن نے، جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے، ابدی ضابطۂ حیات ہے، ایک ایسا معاشی نظام دیا ہے، جس میں نہ وسائل پیداوار، افراد کی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت کے انبار لگے رہتے ہیں۔" [۳]



---

[۱] طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۷

[۲] تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۳۳ + طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۷

[۳] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲

باب یازدہم

صدر اسلام کے نظام معیشت کی اصل واساس

حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوی میں اور خلافت راشدہ میں، معاشی نظام کی اصل و اساس، دولت زر نہ تھی، بلکہ دولتِ ایمان تھی۔ لوگ دولت ایمان کی خاطر، دولتِ زر کو قربان کر دیا کرتے تھے، لیکن مال و دولت کی خاطر، سرمایۂ ایمان کو بھینٹ نہیں چڑھایا کرتے تھے۔ رازق کے حکم کی تعمیل میں، رزق کو ترک کر دیا کرتے تھے مگر رزق کی خاطر، رازق کے احکام کو نظر انداز نہیں کیا کرتے تھے۔ ایمان اور اخلاقی اقدار انہیں معاشی مفاد کی نسبت، کہیں زیادہ عزیز تھیں۔ لوگ، اپنے ایمان و اعتقاد اور اخلاقی رویئے میں، دولت کے بندے نہیں بلکہ خدا کے بندے تھے۔ مال و دولت کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی بجائے، اللہ کے سامنے سربسجود ہوا کرتے تھے۔ وہاں معیارِ فضیلت و برتری بھی، کثرتِ مال و زر نہ تھا، بلکہ فراوانیٔ ایمان اور زیادتِ تقویٰ جیسے اخلاقی رویئے تھے۔ وہ مال و دولت کماتے ضرور تھے، مگر دنیا کے بندے بن کر نہیں، بلکہ آخرت کے طلبگار بن کر کماتے تھے۔ ان کی تجارتوں میں جو مقصد پیشِ نظر تھا وہ محض دنیا کا مالی نفع نہ تھا، بلکہ آخرت کی کامیابی تھی، جو میدانِ معیشت سے خدمت خلق کے ذریعہ قابلِ حصول تھی۔ دنیا کا مال بجائے خود ان کا مطلوب و مقصود نہ تھا، بلکہ وہ آخرت کا نفع کمانے کا ایک ذریعہ تھا۔ ان کا آبِ زر دنیا کی کھیتی سیراب کرنے کے لیے نہ تھا، بلکہ اپنی آخرت کی کھیتی کو آبپاش کرنے کے لیے تھا، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے قلوب و اذہان میں یہ عقیدہ راسخ کر رکھا تھا کہ الدنیا مزرعة الاخرة ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' وہ آخرت کی کھیتی کو کاشت کرنے کے لیے، ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کے بیج بویا کرتے تھے، اور اسے سیراب کرنے کے لیے، حسبِ استطاعت، آبِ زر کا ذخیرہ محفوظ

رکھا کرتے تھے، اگر یہ آبِ زر، ان کی اپنی مزرعة الاخرة کو سیراب کرنے کے بعد بھی بچ جاتا، تو اس میں سے جس قدر وہ چاہتے، ایثار و قربانی کرتے ہوئے دوسروں کو عطا کر دیتے تاکہ ان کی کھیتیاں بھی سرسبز و شاداب رہیں، اور محض اس وجہ سے خشک سالی کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں کہ ان کی آبپاشی کے لیے، آبِ زر نہ تھا، پھر بھی اس ذخیرۂ آب میں سے کچھ بچ جاتا، تو تابکجا، ان کی موت کے بعد، اسلام کا قانونِ میراث، نکاسی نالیوں کے ذریعہ، اسے مختلف رشتہ داروں میں تقسیم کر دیتا، جب تک کسی کے پاس یہ آبِ زر رہتا، وہ اسے خدا کا فضل سمجھتا، اور خدا کی مرضی ہی کے مطابق، اسے حاصل کرتا اور حکمِ خداوندی کے مطابق ہی اسے استعمال میں لاتا۔

صدرِ اسلام کے معاشرہ میں، نہ صرف یہ کہ ذاتی ملکیت کا حق قائم تھا بلکہ اس کا اکرام واحترام بھی کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس حق کو ضائع کرتے ہوئے کسی کا مال چراتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا، افرادِ معاشرہ کے دل و دماغ میں یہ فرمانِ رسول گھر کیے ہوئے تھا کہ:

الا لا یحل مال امرء الا بطیب نفس منه [1]

"سن لو، خبردار! کسی کا مال، بغیر اس کی رضامندی سے لینا، حلال نہیں ہے۔"

پھر اس حقِ ملکیت کا احترام، اور اکرامِ حق مال بھی، اس قدر شدید کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ:

من قتل دون ماله فهو شهید [2]

"جو شخص، اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔"

اور خود قرآن نے سارق کی سزائے قطع ید کا قانون بیان کیا ہے، جو ایک طرف، مجرم

---

[1] مشکوۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الغصب والعاریہ

[2] صحیح بخاری، کتاب فی المظالم والغصب، باب من قتل دون ماله + صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی من قصد اخذ مال غیره + مشکوۃ المصابیح، کتاب القصاص، باب مال یضمن من الجنایات

کے فعل سرقہ کی پاداش (جزاء بما کسبا) ہے، اور دوسری طرف ان لوگوں کے لیے، جن کے ذہنوں میں سرقہ کے جراثیم موجود ہوں، سامانِ عبرت (نکالا من اللہ) بھی ہے۔

پھر یہ حق ملکیت، ہر فرد معاشرہ کو حاصل ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، قرآن بالفاظِ صریحہ بیان کرتا ہے کہ:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

(النساء: ۳۲)

''مرد، اس حصے کے مالک ہیں جو انہوں نے کمایا، اور عورتیں اس حصے کی مالک ہیں، جو انہوں نے کمایا۔''

اس آیت کے مفہوم میں، خود پرویز صاحب نے، کسبِ مال و دولت کو، سب کی ذاتی ملکیت قرار دیا ہے۔

''ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں اس غلط تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جس کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حقوقِ ملکیت مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے (۴/۷)، عورت اپنے مال و جائیداد کی آپ مالک ہوتی ہے، اس طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا صرف مرد کا کام ہے، عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ مرد اور عورت دونوں اکتسابِ رزق کر سکتے ہیں، جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے، اور جو کچھ عورت کمائے، وہ اس کا حصہ ہے۔'' [1]

صدرِ اسلام میں، لوگوں کا یہ حقِ ملکیت، محفوظ ہی نہیں تھا، بلکہ واجب الاحترام بھی تھا۔ اسی حق سے وہ آبِ زر فراہم ہوتا تھا، جو حقوق العباد اور حقوق اللہ کے راستہ میں سے ہو کر، آخرت کی کھیتیوں کی سیرابی کا باعث بنتا تھا۔ ذاتی ملکیت اور اس کا حق، یا اس سے کمایا ہوا مال، بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے، جیسا کہ اشتراکیت سے مرعوب اور مسخر دماغ سمجھتے ہیں،

---

[1] مفہوم القرآن، آیت ۴/۳۲، صفحہ ۱۸۷

اور ہمارے ''مفکر قرآن'' بھی، خیر سے انہی لوگوں میں سے ہیں، جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ذاتی ملکیت ہی کو سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ قرآن کریم کا ایک فرمان بزعمِ خویش، بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

''وہ کہتا ہے کہ ان تمام خرابیوں کی علت اور جڑ، ذاتی جائیداد (پرائیویٹ پراپرٹی) کا وجود ہے۔ جس نظام میں پرائیویٹ پراپرٹی کی اجازت ہوگی، اس میں یہ امراض لازماً پیدا ہوں گے، ان کا استیصال صرف، وہ نظام کر سکے گا، جس میں، نہ کسی کے پاس، زائد از ضرورت دولت ہو، نہ پرائیوٹ پراپرٹی کا امکان یا اجازت۔'' [1]

ہمیں نہیں معلوم کہ قرآن کریم کی کس آیت کی رو سے تمام خرابیوں کی علت اور جڑ، ذاتی ملکیت یا نجی جائیداد ہے۔ ایک طرف ''مفکر قرآن'' کا قرآن پر یہ بہتان ہے اور دوسری طرف، قرآن، خود مرد کو بھی اور عورت کو بھی، اپنی کمائی کا آپ مالک قرار دیتا ہے، جیسا کہ مفہوم القرآن کا اقتباسِ بالا واضح کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خرابیوں کی جڑ اور علت، ذاتی ملکیت کا حق اور پرائیویٹ پراپرٹی نہیں ہے، بلکہ وہ فاسد اور قبیح ذہنیت ہے، جو اس حق کو غلط طور پر استعمال کرتی ہے۔ اگر اس گندی اور بگڑی ہوئی ذہنیت کو، پاکیزہ اور صالح ذہنیت میں بدل دیا جائے، تو یہی حقِ ملکیت، انسان میں ایثار و قربانی، ہمدردی و غمگساری، فیاضی و سخاوت، رحمدلی و مواسات اور جود و کرم جیسے اخلاقی فضائل کی نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر ذہنیت بگڑی ہوئی ہو، اخلاق فساد زدہ ہوں، اور مقاصد برے ہوں، تو یہی حقِ ملکیت، خود غرضی، مفاد پرستی، سنگدلی، شقاوتِ قلبی، اور زر پرستی جیسے اخلاقی رذائل کو جنم دیتا ہے، اور سطح بین ذہن یہ سمجھ لیتا ہے کہ سارا فساد اور بگاڑ، دراصل ''ذاتی ملکیت'' ہی کا پیدا کردہ ہے۔ اس لیے اس قسم کے لال بجھکڑ، اس کا علاج، اس کے سوا اور کسی چیز کو نہیں سمجھتے کہ حقِ ملکیت ہی کو ختم

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۷۱ء، صفحہ ۸

کر دیا جائے، تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ یہ فی الحقیقت، دردِ سر کا علاج، سر کاٹ دینے کی صورت میں کر ڈالنے کے مترادف ہے، حالانکہ صحتِ فکر، پاکیزگیٔ قلب و ذہن، اور فضائلِ اخلاق کے ساتھ، اگر، حقِ ملکیت یا پرائیوٹ پراپرٹی موجود ہو، تو وہ بجائے خود، اللہ کا فضل ہے، لیکن اگر مال و دولت اور ذاتی ملکیت کے ساتھ، فکر کی کجی ہو، قلب و دماغ کا زیغ ہو، اخلاق و کردار کا بگاڑ ہو، تو ایسی ملکیت اور ایسی دولت، یقیناً شئے مبغوض ہے۔ لہٰذا اصل چیز، افکارِ صالحہ، اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ طاہرہ ہیں، جن کے ساتھ، اگر مال و دولت اور ذاتی ملکیت بھی جمع ہو جائے تو نور علی نور ہے۔ لیکن اگر دولتِ زر اور نجی پراپرٹی نہ بھی ہو، تو یہ صحتِ عقائد، فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگیٔ اعمال، بجائے خود، مال و زر اور جائیداد کی ملکیت سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ اگر کسی فرد یا قوم کے پاس، ایمان کی بجائے کفر، تقویٰ و خدا خوفی کی جگہ نخوت و تکبر ہو، تو اس کے پاس، خواہ دنیا و جہان کی دولت کیوں نہ موجود ہو، وہ دراصل، خدا کی اس آزمائش میں گرفتار ہے، جسے ''استدراج'' کہا جاتا ہے۔ خود پرویز صاحب کو بھی ایک جگہ، اس حقیقت کا اعتراف، بایں الفاظ کرنا ہی پڑا۔

> ''قرآن نے بتایا ہے کہ مال و دولت کے ساتھ، اگر تقویٰ اور خدا ترسی نہ ہو، اور وہ تکبر، نخوت، تمرد اور سرکشی کا موجب بن جائے تو ایسا مال، انسان کو بہت جلد ذلیل و خوار کر دیتا ہے، ملاحظہ ہو قارون کا ذکر (۲۸/۸۱-۷۹)، اور ان دو شخصوں کا قصہ جن میں سے ایک کے دو باغ تھے اور دوسرا غریب تھا۔ (الکھف رکوع ۵، آیت ۳۲ تا ۴۵)'' [1]

> ''حقیقی عزت اور اعلیٰ مفاخر، دولت کی فراوانی اور سرمایہ کی کثرت میں نہیں ہے بلکہ دلوں کے تقویٰ اور ایمان کی صلاحیت میں ہے، چنانچہ سب سے پہلے، دو انسان جب میدانِ مسابقت میں نمودار ہوئے، جن میں سے ایک ہابیل،

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۳ تا ۶۴

غریب تھا لیکن خدا سے ڈرنے والا، اور دوسرا قابیل، امیر اور متکبر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی کو شرفِ قبولیت بخش کر، یہ واضح کر دیا کہ خدا کے نزدیک، معیارِ فضیلت، تقویٰ ہے۔'' [۱]

اسلام کا طریق علاج:

الغرض، پرائیویٹ پراپرٹی اور ذاتی ملکیت کو، گندی ذہنیت سے مجرد کر کے یہ کہنا کہ...... ''یہی علتِ فساد ہے، اسے ختم ہونا چاہیے''...... پرلے درجے کی کوتاہ بینی ہے۔ دردِ سر کا علاج، سر کاٹنا نہیں ہے، اور نہ اسلام اس طرح کا علاج کرتا ہے۔ وہ سر کو پورے جسم کے ساتھ برقرار رکھ کر اس طرح علاج کرتا ہے کہ درد معدوم ہو جائے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ذاتی ملکیت، فاسد ذہنیتوں اور بدکردار ہاتھوں کے ذریعہ، عامۃ الناس کے لیے وبالِ جان بن رہی ہے تو وہ ذاتی ملکیت کو ختم کرنے کی بجائے، اس فاسد ذہنیت کو ختم کرتا ہے، جو بدعنوان ہاتھوں کے ذریعہ، یہ استحصالی صورتحال پیدا کر رہی ہے، اس لیے کہ تغیرِ نفس ہی، انقلابِ ذہن اور تبدیلی عمل کی اساس قرار پاتا ہے۔ ایمان...... صحیح اور محکم ایمان...... ہی دراصل وہ قوت ہے جو اوچھی ذہنیتوں کو اچھی ذہنیتوں میں تبدیل کرتی ہے، اور ظلم وستم کی جگہ عدل وانصاف اور خود غرضی ومفاد پرستی کی جگہ ایثار وقربانی پیدا کرتی ہے۔

معالجۂ اسلام کے معاشرتی نتائج:

ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں، تعلیمِ اسلامی کی بدولت، لوگوں میں ایک ذہنی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ ان کے رد وقبول کے پیمانے، اب وہ تھے جو ان کے ایمان نے پیش کیے تھے۔ انکی معاشرت میں، اسلام نے، پیوستگی اور دلبستگی پیدا کر دی تھی۔ ان کی سیاست کا ہدف، مال بٹورنا نہیں بلکہ خدمتِ خلق تھا۔ ان کی معیشت پر اخلاقی فضائل کا غلبہ تھا۔ حلال کمائی کے سوا، حصولِ رزق کے سارے دروازے بند تھے۔ پھر یہ رزقِ حلال بھی جائز راستوں میں، اس طرح صرف ہوتا تھا کہ دولت، امراء واغنیاء ہی کے

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۳

درمیان گردش پذیر نہ رہتی تھی، بلکہ گردشِ زر کی وسعت، خستہ اور نادار لوگوں تک وسیع تھی۔ کوئی شخص، اپنے جائز حقوق سے محروم نہ تھا، اور اس کے ساتھ ہی، ناحق پا لینے کی ہوس سے بھی کوسوں دور تھا۔ ہر فردِ بشر کو یہ اطمینان حاصل تھا کہ اگر معاشرہ میں اس کے ساتھ رحم کا برتاؤ نہ بھی کیا گیا، تب بھی وہ عدل و انصاف سے محروم نہیں رہے گا۔ خوشحال اور صاحبِ ثروت طبقہ، اپنی دولت پر سانپ بن کر بیٹھنے والا نہ تھا، بلکہ سخی اور فیاض تھا۔ انسانی ہمدردی اور غمگساری کے جذبات سے، ان کے سینے لبریز تھے۔ غریب اور نادار افراد کی مدد، یتامیٰ اور بیوگان کی دست گیری، اور خستہ و بدحال افراد کی اعانت، ان کی آخرت کی کھیتی کو سرسبز و شاداب رکھنے کے ذرائع تھے۔ پڑوسیوں اور قرابتداروں کے حقوق کی پاسداری، ان کے مال و دولت کا مصرف تھے۔ عام حالات میں بھی وہ، صاحبِ جود و کرم تھے، لیکن اگر قوم پر کوئی مصیبت کا وقت آن پڑتا تو ان کے خزانوں کے منہ کھل جاتے، اور مصیبت کے یہ ایام، منافعِ آخرت کمانے کے لیے بہترین تجارتی مواقع ثابت ہوتے۔ دوسری طرف، مفلس و کنگال افراد اور خستہ و مفلوک الحال لوگ، اپنی معاشی دوڑ میں پیچھے رہ بھی جاتے، تو وہ خود داری اور غیرت کی بناء پر، دستِ سوال دراز کرنے سے احتراز کرتے۔ وہ لوگ انتہا درجے کے قناعت پسند اور متعفّف تھے۔ ایسی صورت میں بیت المال، ایسے افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر، انہیں اپنی کفالت میں لے لیتا تھا۔ اغنیاء و متمول افراد کی سخاوت و فیاضی، جود و کرم، ہمدردی و غمگساری، کنگلے اور تنگدست افراد کے دل جیت لیتی، اور نچلے درجے کے افراد، آسودہ حال طبقے کے خلاف اپنے دلوں میں، حسد، کینہ، جلن اور کڑھن کے اثرات نہ پاتے۔ معاشرتی طبقات میں فکری یکجہتی اور قلبی اتحاد، معاشرتی استحکام کا ذریعہ بنتے۔ امیر و غریب کی صورت میں، طبقاتی کشمکش، نام کی کوئی چیز، اس اولین اسلامی معاشرہ میں موجود نہ تھی۔ فکر کا سلجھاؤ، روح کی پاکیزگی، قلب و دماغ کی طہارت، اعمال کی درستی، ابتغاءِ رضوان اللہ کا مقصودِ اصلی ہونا، یہی وہ صفات تھیں، جن کی موجودگی میں اسلام کے ابتدائی سنہرے دور میں ''ذاتی ملکیت'' کا وجود، نہ صرف یہ کہ منبعِ فساد نہ تھا بلکہ وہ سرچشمہ خیر و فلاح بھی تھا۔ ان

اخلاقی فضائل کے ساتھ، نہ تو ذاتی ملکیت کا حق، اور نہ ہی نجی مال و دولت کی موجودگی، کوئی برائی یا عیب تھا۔ شر اور مضرت، جو کچھ بھی تھی، وہ دراصل، اخلاقی رذائل کی بنیاد پر تھی، اور آج بھی ہے اور آئندہ بھی ہوگی۔ کیونکہ اخلاقی معائب ومثالب، بجائے خود منبعِ شر وفساد ہیں، قطعی نظر اس کے کہ ذاتی ملکیت یا فالتو مال و دولت کا وجود، ان رذائل کے ساتھ مقرون ہو یا نہ ہو، دوسری طرف، اخلاقی فضائل، بجائے خود، سرچشمۂ صلاح وفلاح ہیں، بلالحاظ اس کے کہ ذاتی ملکیت اور دولتِ زر کا وجود، اس کے ساتھ ملحق ہو یا نہ ہو۔

معاشرتی تغیر کا اصلی سبب، معاشی نہیں، بلکہ اخلاقی تھا:

حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد، جب فتوحات کا سلسلہ، برق رفتاری سے جاری تھا، تو ممالکِ مفتوحہ کی بڑی بڑی آبادیاں اسلام قبول کر رہی تھیں، جس سرعتِ رفتار کے ساتھ، یہ نومسلم، دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، اس تیزی کے ساتھ، ان کی اخلاقی تربیت کا اہتمام نہ ہوسکا۔ نتیجتاً، وہ لوگ، جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں، تعلیم وتربیت پائے ہوئے تھے، ان کی تعداد، روز بروز کم ہوتی چلی گئی، اور نومسلم، جن کا شعورِ اسلام، اور فہمِ دین، بہرحال، اس پائے کا نہ تھا، جو **السابقون الاولون** کو حاصل تھا، روز بروز بڑھتے رہے۔ اس طرح اسلامی معاشرہ میں، صحیح الفکر، راسخ العلم اور مضبوط سیرت وکردار والا عنصر کمزور ہوتا چلا گیا اور اس کے مقابلہ میں ان نومسلموں کا زور بڑھتا چلا گیا، جو اگرچہ نئے دین کو پا کر، ایک نیا جوش اور ولولہ تو رکھتے تھے، لیکن اسلام کے پختہ شعور سے بے بہرہ تھے۔ یوں اسلامی معاشرہ میں، ایمانی قوت اور مستحکم کردار کے حامل افراد، دن بدن کم سے کم تر ہوتے چلے گئے اور معاشرے پر بحیثیتِ مجموعی، اسلامی افکار ونظریات کی گرفت، ان لوگوں کے قلوب واذہان پر بالخصوص، ڈھیلی پڑتی چلی گئی، جو فوج درفوج حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہے تھے، اس پر مستزاد یہ کہ خلافتِ اسلامیہ کی جگہ، ملوکیت نے لے لی، اور علم بردارانِ ملوکیت اگرچہ خود مسلمان تھے، مگر اسلام، ان کا اس طرح کا مشن اور مقصودِ حیات نہ تھا، جیسا کہ خلفائے راشدین اور خود جنابِ رسالتمآب ﷺ کا تھا۔ لہٰذا، ایک صحیح اسلامی حکومت کی،

جس قانونی، اخلاقی، انتظامی اور عسکری قوت کو، فروغِ خیر اور انسدادِ شر کے لیے، بھر پور طور پر استعمال ہونا چاہیے تھا، وہ اگر استعمال ہوئی بھی، تو حکمرانوں کے سیاسی مصالح کی خاطر، نہ کہ مفادِ اسلام کی ترقی و عروج کی خاطر۔ اس طرح بعد کے ادوار میں، جب دینی مصالح پر حکمرانوں کی سیاسی مصلحتیں غالب ہوگئیں، اور عامة الناس بھی، اس اخلاقی تربیت سے محروم تھے، جو اولین مسلمانوں کو حاصل تھی، تو منطقی طور پر اس کا ناگزیر نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا...... اور یہی ہوا بھی...... کہ لوگ، ہر شعبۂ حیات میں، اسلام سے بعید تر ہوتے ہوئے، تنزل اور انحطاط میں گرتے چلے گئے۔ لوگوں کے مزاج میں ایک اور تبدیلی واقع ہوئی، جو نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں برپا ہونے والی تبدیلی کے، بالکل مخالف سمت میں واقع تھی۔ لوگوں کے ذوق اور دلچسپیاں بدلیں۔ ترجیحاتِ زندگی میں تغیر واقع ہوا، طلبِ آخرت کا جذبہ جتنا کمزور پڑتا گیا، دنیا طلبی کا جذبہ اتنا ہی ابھرتا چلا گیا، دلوں کی دنیا میں رازق کی جگہ، رزق کی محبت نے لے لی۔ راہِ خدا میں لٹائی جانے والی دولت کا مصرف، اب اپنی ذات پر گلچھرے اڑانا قرار پایا۔ اغنیاء و خوشحال طبقہ میں، جس نسبت سے فیاضی و سخاوت، ایثار و قربانی اور ہمدردی و غمگساری کے جذبات سرد پڑتے چلے گئے، اسی نسبت سے حبِ مال اور بخل، نیز لوگوں سے سرد مہری بلکہ سنگ دلی بڑھتی چلی گئی، اور مفلوک الحال طبقہ میں بھی قناعت و خودداری اور غیرت و تعفف کی جگہ، دنیائے دنی کی حرص، مال و دولت کی لالچ، خوشامد اور بھیک خواہی کی صفات نے لے لی، حالانکہ ذاتی اور شخصی ملکیت کا وجود، حسبِ سابق، عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ سے لے کر، بعد کے ادوار تک میں ثابت و برقرار رہا، لیکن لوگوں کے اذواق و امزجہ کے بدلنے سے، سب کچھ بدل گیا، اس طرح، وہی ذاتی ملکیت کا اصول اور نجی مال و دولت کی موجودگی، جو اخلاقی فضائل کے ساتھ، اسلام کے دورِ اول میں، لوگوں کی انفرادی زندگی میں وجۂ نشاط و مسرت، اور اجتماعی زندگی میں، سببِ فلاح و بہبود تھے، اب وہی دونوں امور، بدلے ہوئے دور میں، اخلاقی رذائل کے ساتھ، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں، سرچشمۂ شر و فساد ثابت ہوگئے، مسلم معاشرہ کی اس نکبت و

زبوں حالی کا سببِ اصلی، صالح ذہنیتوں کا فاسد ذہنیتوں میں بدل جانا تھا، یا پھر نو مسلموں کی وسیع پیمانے پر، معیاری تعلیم و تربیت کا بندوبست نہ کر پاسکنا تھا، نہ یہ کہ پہلے ذاتی ملکیت معدوم تھی، اور اب وہ وجود کوش ہوگئی جو سرمایہ داری کے فروغ کا سبب بنی، جیسا کہ پرویز صاحب کا گمان ہے۔

باندازِ دیگر:

مزید برآں، یہاں ایک اور بات بھی قابلِ غور و فکر ہے۔ ملوکیت کا نظام، خلافتِ الٰہیہ کی نسبت (بلکہ یوں کہیے کہ اس کے برعکس) آمریت کا نظام ہے، اور آمر، زیادہ سے زیادہ اقتدار و اختیارات کا بھوکا ہوا کرتا ہے، وہ کسی طور پر بھی، رعایا کو، کسی نوع کی آزادی دینے کا روادار نہیں ہوتا۔ وہ فکری، سیاسی اور معاشی، ہر قسم کی آزادی کا سالب ہوتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ ہر پہلو سے، رعایا پر، اس کی گرفت، مضبوط اور مستحکم رہے، لہٰذا، نظامِ ملوکیت میں آمریت کے پیکر اور مطلق العنان حکام سے یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی یہ قرینِ قیاس ہے کہ اگر پہلے سے، اس کی رعایا کو معاشی آزادی حاصل نہیں ہے، اور لوگوں کی زائد از ضرورت دولت، ذرائع پیداوار اور رزق کے سرچشمے، قاطبۃً حکومت کے قبضہ میں ہیں، تو حکومت خود، انہیں، ذاتی ملکیت کی آزادی فراہم کر کے، لوگوں کو معاشی حریت سے ہمکنار کرے، لہٰذا، یہ جو ''مفکرِ قرآن'' صاحب، لفظوں کا جادو جگاتے ہوئے، مقفّٰی اور مسجّع عبارتوں کی اوٹ سے، یہ انوکھا چاند چڑھا ڈالتے ہیں کہ...... ''ملوکیت آئی تو اس کے ساتھ، انفرادی ملکیت کا اصول اور نجی مال و دولت کا حق بھی، رعایا کو دے دیا گیا، اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام پھر عود کر آیا''...... ایک بے بنیاد اور من گھڑت خیال ہے، جس کی واقعات کی دنیا میں، کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، بالخصوص جبکہ عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں بھی ایسا نہ تھا کہ افرادِ معاشرہ کے زائد از ضرورت اموال، جملہ ذرائع پیداوار اور سرچشمہ ہاءِ رزق، حکومت کے قبضہ میں تھے، باوجودیکہ پرویز صاحب نے، اپنے ذہن و دماغ کی ساری قابلیتوں کو، اور زبان و قلم کی جملہ توانائیوں کو اپنے خود ساختہ ''نظامِ ربوبیت'' کے حق

میں، زمینی حقائق کو معکوس و منکوس کر کے پیش کیا ہے، لیکن ہم نے ان کی اپنی ہی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس نام نہاد قرآنی نظام کا، جو دراصل کمیونزم ہی کا چربہ ہے عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کے برعکس، لوگوں کے پاس، پرائیویٹ پراپرٹی بھی تھی اور ذاتی ملکیت کا اصول بھی متداول تھا، اور لوگوں میں، اسی بناء پر تفاضل فی الرزق بھی پایا جاتا تھا۔ لوگ، اسے اپنی ضرورتوں پر کھلے دل سے خرچ بھی کرتے تھے، اور ان قرآنی احکام پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے، جن کی تعمیل، مال و دولت کی ذاتی ملکیت کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔ قانونِ میراث، اور احکامِ صدقہ و خیرات، نیز انفاق فی سبیل اللہ کے احکام پر بھی مسلسل عمل ہو رہا تھا۔ لوگ بعض گناہوں اور لغزشوں کی بناء پر، اپنے عفو المال میں سے کفارہ بھی ادا کیا کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر، اپنے بیویوں کو حقِ مہر بھی دیا کرتے تھے۔ مقدماتِ قتل میں، دیت اور خون بہا پر معاملات بھی طے کیے جاتے تھے۔ زکوٰۃ و حج کے فرائض بھی نجی اموال ہی سے انجام دیئے جاتے تھے۔ آزادیٔ غلاماں کی ہر صورت میں زرِ تعاون بھی پیش کیا جاتا تھا۔ الغرض، یہ سب کچھ صرف، اسی صورت ہی میں ممکن تھا کہ لوگوں کی گردنیں، اس ''نظامِ ربوبیت'' کے شکنجے میں، نہ کسی گئی ہوں جسے، ''مفکرِ قرآن'' نے اشتراکیت کے زیرِ اثر، محض اپنے تخیل کے زور پر، عہدِ محمد رسول اللہ والذین معهٗ میں نفاذ پذیر گمان کر رکھا ہے، کیونکہ یہ نظام، اپنے مزاج و نہج کے اعتبار سے ایک شدید آمرانہ نظام ہے جو اسلام کی تعلیمات، پیغمبرِ اسلام کے اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرزِ حکومت سے کلی منافاۃ رکھتا ہے۔ اسلام، اپنے نام لیواؤں کو ہر نوع کی حریت و آزادی عطا کرتا ہے، جبکہ اس ''قرآنی نظام'' کی رو سے، افرادِ معاشرہ کے جملہ ذرائع پیداوار اور سرچشمہ ہائے رزق اور ضرورت سے زائد، ان کے تمام اموال کو (خواہ بصورت نقد ہوں یا بصورت سونا چاندی یا ہیرے جواہرات یا بشکلِ زمین یا بہ ہیئتِ کارگاہانِ صنعت و حرفت ہوں) ان کی ملکیت سے نکال کر اپنی ملکیت میں (یا بقول پرویز، اپنی تحویل میں) رکھنا، انہیں معاشی آزادی سے محروم کر دینے کے مترادف ہے، پھر اس سلبِ حریت کے باعث،

اگر رعایا کی شخصیتوں کی نشو ونما میں، کوئی مزاحمت یا منقصت واقع ہوگی، تو اس کی ذمہ داری، اس حکومت پر عائد ہوگی، جس نے انہیں اپنی پابندیوں میں جکڑ کر، یا ان سے آزادی سلب کر کے، انہیں ناقص شخصیتیں بننے پر مجبور کیا۔ اس جرم کی پاداش میں، وہ حکمران، کل اپنے رب کی عدالت میں ماخوذ اور جوابدہ ہوں گے ۔ لہٰذا کوئی خدا ترس حکمران...... جب تک اس میں، خدا کی عدالت میں جواب دہی کا احساس موجود ہے...... لوگوں کی معاشی یا سیاسی یا کسی بھی نوع کی آزادی چھین کر، ایسا خطرہ مول نہیں لے سکتا جس کا نتیجہ، آخرت میں، اس کی گرفت کی صورت میں ظاہر ہو۔ اس لیے بالیقین یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کا من گھڑت ''نظامِ ربوبیت'' صرف، اُن کے اپنے گمان وخیال کی دنیا میں، اسلام کے صدرِ اول میں قائم تھا، ورنہ عالمِ واقعہ میں، وہاں صرف وہ نظام کارفرما تھا، جس میں ہر شخص کو حقِ ملکیت، نہ صرف یہ کہ، حاصل تھا، بلکہ اس حق کا احترام بھی کیا جاتا تھا۔

خلافت راشدہ کے بعد تغیر کی اصل نوعیت:

الغرض، خلافتِ راشدہ کے بعد، جو تغیر، زندگی کے مختلف شعبوں میں واقع ہوا، وہ دراصل، اخلاقی بگاڑ کی علامات تھیں، ورنہ معاشی شعبہ میں ذاتی ملکیت کا وجود و عدم، اس اخلاقی بگاڑ میں کوئی اثر نہیں رکھتا ۔ بندۂ مومن کے لیے قابلِ لحاظ امر، ذاتی ملکیت اور دولتِ زر کی کثرت و قلت نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ قانونِ خداوندی کے تحت کمایا ہے یا اس کی نافرمانی کرتے ہوئے حاصل کیا ہے ۔ اگر یہ سب کچھ اسے اتباعِ حق کے ذریعہ ملا ہے تو یہ اللہ کا فضل ہے، جس میں سے وہ، جس قدر چاہے، راہِ خدا میں صرف کرتے ہوئے اجرِ آخرت کما لے۔ بندۂ مومن کے لیے ذاتی ملکیت کا وجود و عدم، خود پرویز صاحب کے نزدیک بھی بے معنیٰ ہے، حالانکہ وہ شخصی اور نجی ملکیت کے وجود کو باطل بلکہ کفر و شرک قرار دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر (بفرضِ محال) اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جو کچھ ایک شخص کماتا ہے، وہ سب کا سب، اس کی ذاتی ملکیت قرار پائے گا تو جہاں تک ایک مومن

کا تعلق ہے، اس سے اس مسئلہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا، یہ سب کچھ اس کی ذاتی ملکیت میں ہوتا ہے، لیکن وہ اپنی ذاتی ملکیت کو اپنے دل کی پوری رضا مندی سے، نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے، اپنے معاشرہ (نظامِ مملکت) کے حوالے کر دیتا ہے۔''[1]

ہائے رے مجبوری! اعترافِ حقیقت بھی، مگر ''بفرضِ محال'' کے الحاقی الفاظ کے ساتھ۔ اور پھر ''یہ سب کچھ اس کی ذاتی ملکیت ہے لیکن ....'' اعترافِ حقیقت بھی اور اس کے ساتھ ''لیکن ....'' کی آڑ میں انکارِ حقیقت بھی، اور وہ بھی اشتراکیت سے مرعوبیت کے زیرِ اثر۔

بہر حال، حدودِ اسلام میں رہ کر بندۂ مومن جو کچھ کماتا ہے، وہ اس کی ذاتی ملکیت ہی ہے۔ اس میں سے وہ قانوناً، ایک حصہ بطور زکوٰۃ، دینے پر مامور ہے جبکہ بقیہ مال میں سے، وہ، رضا کارانہ طور پر، جس قدر چاہے، راہِ خدا میں خرچ کر ڈالے، لیکن بہر حال، اسلامی معاشرہ میں ذاتی ملکیت کا اصول، ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اسلام کا پورا معاشی نظام اسی اصول پر استوار ہے۔ اسلامی حدود میں رزقِ مکسوب، افرادِ کاسبین کی ذاتی ملکیت میں داخل ہوتا ہے، البتہ جو لوگ، اکتسابِ رزق کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں، ان کی کمی بیت المال کی اس دولت سے پوری ہوتی ہے جو اغنیاء سے بصورتِ زکوٰۃ وعشر وغیرہ وصول کی جاتی ہے۔ نیز اہلِ ثروت اور آسودہ حال لوگ بھی، رضا کارانہ طور پر، اپنے مفلوک الحال افراد کی اعانت و دستگیری کرتے ہیں۔ اس طرح جملہ افرادِ معاشرہ کو، اسلامی حکومت میں ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا سلسلہ قائم رہتا ہے، یوں مملکتِ اسلامیہ، رعایا کو فراہمیٔ ضروریات کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ جس میں اندازِ نظام (بشرطیکہ فراہمیٔ ضروریات کی ذمہ داری پوری ہو رہی ہو، تو) کوئی اہمیت نہیں رکھتا جیسا کہ خود پرویز صاحب کو بھی اعتراف کرتے ہی بنی۔

---

[1] نظامِ ربوبیت، صفحہ ۱۳۴

''اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں، سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر لیتی ہے، وہ کسطرح کے معاشی نظام سے پوری ہوسکتی ہے، یعنی افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی ذمہ داری۔'' [۱]

ایک طرف یہ کہنا کہ ''معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا''، اور دوسری طرف، اشتراکیت پر قرآنی ٹھپہ لگا کر ''نظامِ ربوبیت'' کے نام سے پیش کرنا، اور پھر اسے کفر و اسلام کی کسوٹی قرار دینا، صریحاً دورخا پن ہے۔

مان لیا کہ نہ تو معاشی نظام کوئی اہم چیز ہے اور نہ ہی اس کی کوئی شکلِ خاص، مقصود بالذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کی فراہمیٔ سامانِ زیست کی ذمہ داری، کس طرح کے نظامِ معیشت سے پوری ہوتی ہے؟ اس نظام سے، جو ذاتی ملکیت کے اصول پر قائم ہو؟ یا اُس نظام سے جو ذاتی ملکیت کے وجود کو کفر و شرک قرار دیتا ہے؟ اگر کوئی شخص، اشتراکیت پر پیشگی ایمان لائے بغیر، قرآن کا مطالعہ، قرآن کو ہدایت دینے کے لیے نہیں، بلکہ قرآن سے ہدایت لینے کے لیے کرتا ہے، تو وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن، اپنی مملکت کے لیے ایسا نظام تجویز کرتا ہے، جو ذاتی ملکیت کے اصول کو اساسی اصول قرار دیتا ہے۔

☆............☆............☆

---

[۱] طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۴ء، صفحہ ۲۲

حرفِ آخر

۱۔ اللہ تعالیٰ کی بجائے، قانونِ فطرت، اور ایک مخصوص نظام سے واسطہ و تعلق رکھنا۔
۲۔ اللہ و رسول کے تصورات کو محو کر کے، ''مرکز ملت'' کے تصور کو مرکزی و محوری حیثیت سے اُجاگر کرنا۔
۳۔ ''نظامِ ربوبیت'' کے خوش آئند لیبل کے تحت، بدترین ڈکٹیٹر شپ کا نظام قائم کرنا۔
۴۔ قرآن کریم کے نام پر، اشتراکی اخلاقیات کو اپنانا، اور انہیں رواج دینا۔
۵۔ ایک آیت کے غلط مفہوم کی بناء پر، صدہا آیات پر خطِ تنسیخ کھینچنا۔

مصنفِ کتاب کے لیے، یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ ''نظامِ ربوبیت'' کا لیبل لگا کر، جناب پرویز صاحب نے جس نظام کو پیش کیا ہے، مندرجہ بالا اُمور خمسہ، اس نظام کے اہداف و مقاصد ہیں؟ یا یزداں کے تصور میں تراشے ہوئے اس پیکرِ ابلیس کے بدیہی نتائج و ثمرات ہیں؟ لیکن اگر یہ پانچوں اُمور، اہداف و مقاصد ہی کی حیثیت رکھتے ہوں، اور اس خود ساختہ نظام سے، یہی نتائج و آثار اخذ کرنا، مطلوب و مقصود ہوں، تو پھر ''مفکر قرآن'' کے ذہنِ رسا کی داد دینا پڑتی ہے، جنہوں نے فی الواقع قرآن کریم کا نام لے کر، اشتراکیت کے معاشی نظام کے ساتھ، مغربی معاشرت کے لوازمات کی پیوند کاری کرتے ہوئے، ایک ''کامیاب نظام'' وضع کرنے کی کوشش کی۔ یہ دوغلا نظام (Hybrid Order) اپنے اہداف و مقاصد کو کس طرح پالیتا ہے، اور اس سے مطلوب نتائج و ثمرات کس طرح حاصل ہوتے ہیں، وہ، درجِ ذیل پانچ نکاتی بحث سے بالکل واضح ہے۔

۱۔ واسطہ و تعلق اللہ سے نہیں، بلکہ اس کے قانون اور نظام سے

اسلامی عقائد میں اصلی و بنیادی اور مرکزی و محوری حیثیت، صرف اور صرف، ایمان

باللہ کو حاصل ہے۔ باقی چاروں ایمانیات، دراصل ایمان باللہ ہی کی شاخیں ہیں۔ مثلاً انبیاء ورُسُل پر ایمان ہے، تو اس لیے کہ وہ خدا کے نبی اور رسول ہیں۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ خدا نے اسے نبی یا رسول نہیں بنایا، تو اس کی نبوت و رسالت ہرگز قابل تسلیم نہیں ہوگی۔ کتابوں پر ایمان اس لیے ہے کہ وہ، اللہ تعالیٰ ہی کی نازل کردہ کتابیں ہیں۔ فرشتوں پر ایمان، اس لیے ہے کہ وہ، خدائے قدوس کے مقرر کردہ وہ کارندے ہیں، جن سے پوری کائنات کو چلائے رکھنے کا کام، لیا جا رہا ہے۔ آخرت پر ایمان، اس لیے ہے کہ وہ، اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ ایک ایسا دن ہے جس میں تمام انسانوں کے اس امتحان کا نتیجہ سامنے آئے گا، جو دنیا کی اس آزمائش گاہ میں، اُن سے لیا جا رہا ہے۔ اس لیے اصلی اور بنیادی حیثیت، عقائد اور ایمانیات میں، ایمان باللہ یا دوسرے الفاظ میں عقیدۂ توحید ہی کو حاصل ہے۔

صرف ایمانیات ہی نہیں بلکہ تعبدی اُمور میں بھی، ایمان باللہ ہی کو مرکزی اور محوری حیثیت حاصل ہے۔ فعل نماز کو جو چیز عبادت بلکہ رکنِ اسلام بناتی ہے، وہ ایمان باللہ ہی کا جوہر ہے۔ اگر نماز کے عمل سے ایمان باللہ کا جوہر سلب کر لیا جائے، تو نماز، ایک فضول قسم کی اٹھک بیٹھک بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر روزے میں سے، ایمان باللہ کی روح نکل جائے تو روزہ، ایک بے جا قسم کی فاقہ کشی ہو کر رہ جاتا ہے، اگر زکوٰۃ میں سے ایمان باللہ کی حقیقت خارج ہو جائے، تو یہ عمل، فضول خرچی اور چٹی بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر حج میں سے ایمان باللہ کی روح نکل جائے، تو اس کی حیثیت، محض ایک سیر سپاٹے سے زیادہ نہیں رہتی۔ اگر جہاد کے عمل میں سے، ایمان باللہ کا جوہر مفقود ہو جائے، تو یہ عمل، ناحق خون ریزی کے عمل میں بدل جاتا ہے۔ پس عبادات میں بھی، اگر کسی عقیدہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، تو وہ یہی ایمان باللہ ہی کا عقیدہ ہے۔

عبادت سے آگے بڑھ کر پوری زندگی کے معاملات میں، ایمان باللہ ہی کا عقیدہ جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ عملی زندگی میں کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں، جنہیں انسان جائز سمجھ

کر کرتا ہے اور کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جنہیں وہ ناجائز جان کر، اُن سے اجتناب کرتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جائز، روا، صحیح اور حق صرف اس لیے ایسے ہیں کہ خدا نے انہیں، ایسا قرار دیا ہے، اور ناجائز، ناروا، غلط اور باطل صرف، اس لیے ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا قرار دیا ہے۔ فرض اس لیے فرض ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے فرض طے کر دیا ہے۔ حقوق اس لیے حقوق ہیں کہ وہ، اللہ تعالیٰ ہی کے متعین کردہ ہیں۔ حرام، اس لیے حرام ہے کہ اسے خدائے قدوس نے ایسا فرما دیا ہے۔ حلال اس لیے حلال ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے حلال کر دیا ہے۔ الغرض، معاملات ہوں یا عبادات، نظریات ہوں یا عقائد؟ ان تمام شعبوں میں مرکزی اور بنیادی حیثیت، ایمان باللہ ہی کو حاصل ہے۔

اللہ نہیں، اُس کا ''قانون'' اور ربّ نہیں بلکہ ''نظامِ ربوبیت''

قرآن کریم، اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے، جو خالق، قادر، مالک، رازق، پروردگار، ہادی، شارع، محی، ممیت، محاسب اور مجازی وغیرہ کی صفات سے متصف ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' نے اس لفظ کو، اپنی دانش وری کی بھینٹ چڑھا کر، ایسے معانی میں استعمال کیا ہے، جو عرف عام میں، محاورۂ عرب میں، اور کتب لغت میں یکسر معدوم ہیں، اور بہر حال، خالق کی بجائے، مخلوق ہی پر اطلاق پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ''سلیم کے نام'' ایک خط لکھ کر، اسے قرآنی فہمی کا گُر یہ بتاتے ہیں کہ:

''اس ضمن میں اگر، سلیم! تم ایک اہم نکتہ کو سمجھ لو، تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ یعنی ان مقامات میں، اللہ کی جگہ اگر تم ''اللہ کا قانون'' کہہ لیا کرو تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔'' [1]

چنانچہ ''مفکر قرآن'' صاحب، اس گُر کو استعمال کرتے ہوئے، مختلف آیات کے جو تحریفی مفاہیم بیان کرتے ہیں، اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] سلیم کے نام، ج۱، ص ۱۰۸

وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (الانفال:٦٢)

''اگر وہ تجھ سے دھوکہ کرنے کی نیت رکھتے ہوں تو تیرے لیے، اللہ کافی ہے۔''

لیکن ''مفکر قرآن'' کے ہاں، آیت کا مفہوم یہ ہے:

''اگر دشمن (اپنے آپ کو مائل بہ صلح ظاہر کر کے) تمہیں دھوکہ دینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو (اے رسول!) تم گھبراؤ نہیں، تمہارے لیے خدا کا قانون کافی ہے۔'' [۱]

(۲) قدرے آگے چل کر، اسی سورت میں، یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ(الانفال:٦٤)

''اے نبیؐ! تمہارے لیے اور تمہارے پیروکار اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ ہی کافی ہے۔''

لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' کا پیش کردہ مفہوم، ان الفاظ پر مشتمل ہے:

''اے رسول! خدا کا یہ قانون، تیرے لیے کافی ہے، اور ان مومنین کی جماعت کے لیے بھی، (جو اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لیے) تیرا اتباع کرتی ہے۔'' [۲]

(۳) تیسری مثال کے لیے، قرآن کریم کے اس مختصر سے جملہ کو ملاحظہ فرمائیے:

وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ (الانفال:٦٧)

''اور اللہ کے پیش نظر آخرت ہے۔''

''مفکر قرآن'' صاحب نے ان الفاظ کا مفہوم، بایں الفاظ پیش کیا ہے:

''اور قانون خداوندی کی نگاہ مستقبل پر ہے۔'' [۳]

(۴) قرآن کریم کے بہت سے مقامات پر یہ جملہ موجود ہے:

وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ (الانفال:٤٧)

''جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ ان سب (اعمال) کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

---

[۱] مفہوم القرآن، ص ۴۱۰
[۲] مفہوم القرآن، ص ۴۱۱
[۳] مفہوم القرآن، ص ۴۱۲

لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے ہاں، ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے:

''لیکن خدا کا قانون، انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا، وہ ان کے تمام اعمال کو محیط تھا۔'' [1]

(۵) قرآن کریم نے، اللہ تعالیٰ کی دو صفات وَاسِعٌ اور عَلِیْمٌ کا بکثرت ذکر کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر یہ الفاظ آئے ہیں:

وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (البقرہ: ۲۶۱)

''اور اللہ، (اپنی قدرت و تصرف میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب وَاسِعٌ کو قانونِ خداوندی کی صفت، اور عَلِیْمٌ کو اسی قانون کا مبنیٰ قرار دیتے ہوئے، مفہوم، یوں بیان فرماتے ہیں:

''خدا کا قانون، بڑی فراخیاں، اپنے اندر رکھتا ہے، اور یکسر علم و حقیقت پر مبنی ہے۔'' [2]

(۶) اب اللہ بمعنی قانون سے ترقی ہوتی ہے، تو اللہ کا معنی ''قانون مکافات'' ہو جاتا ہے۔ بے شمار مثالوں میں سے صرف ایک مثال حاضر ہے۔ سورۃ المائدہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (المائدہ: ۷)

''بے شک، اللہ تعالیٰ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔''

مگر ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے ہاں، ''دلوں کے راز جاننا'' اللہ تعالیٰ کی نہیں، بلکہ اس کے ''قانونِ مکافات'' کی خوبی و صفت ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''خدا کا قانونِ مکافات، دل میں گزرنے والے خیالات تک کا بھی علم رکھتا ہے۔'' [3]

---

[1] مفہوم القرآن، ص ۴۰۶ [2] مفہوم القرآن، ص ۱۰۳

[3] مفہوم القرآن، ص ۲۴۲

(۷) اب لاتعداد مثالوں میں سے صرف ایک مثال، اس امر کی بھی ملاحظہ فرما لیجیے کہ اللہ سے مراد، وہ ہستی نہیں ہے، جو خالق کائنات ہے بلکہ اس کا ''نظام'' ہے۔ چنانچہ ''مفکر قرآن'' صاحب، اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (اٰل عمران: ۱۳۱) ''تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔'' کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

''خدا کے اس نظام کی اطاعت کرو، جسے اس کے رسول نے متشکل کیا ہے۔'' [۱]

یہاں فعل امر اَطِيْعُوا کے دو مفعول ہیں۔ ایک اللہ اور دوسرا رسول۔ مطلب یہ ہے کہ ''تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو'' لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب نے لفظ ''اللہ'' کو ''نظام'' کا مفہوم دے دیا، اور رسول کی اطاعت سے جان چھڑانے کے لیے، اسے ''نظام'' کا صورت گر، بنا کر، بطورِ فاعل پیش کر دیا۔ جب کہ آیت میں، وہ بطورِ مفعول واقع ہوا ہے، اور اَطِيْعُوا کے فعل کے اُسی طرح تابع ہے، جس طرح لفظ ''اللہ'' اس کے تابع ہے۔

بہر حال، اب اس کے بعد اللہ بمعنی ''نظام'' کا مفہوم بھی، ترقی پاتا ہے، اور نیا مفہوم، اللہ بمعنی ''نظامِ ربوبیت'' قرار پاتا ہے۔ بے شمار مثالوں میں سے اب چند مثالیں، اس مفہوم کی بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

(۸) قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام: ۷۱)

''اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمام جہانوں کے پروردگار کے مطیع فرمان رہیں۔''

لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اس آیت کا مفہوم، یوں بیان کرتے ہیں:

''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اسی راستہ کو اختیار کریں اور خدا کے عالم گیر نظامِ ربوبیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔'' [۲]

(۹) سورۂ یونس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس: ۱۰)

---

[۱] مفہوم القرآن، ص ۱۵۳ [۲] مفہوم القرآن، ص ۳۰۳

''ان کی ہر بات کا خاتمہ اس دعا پر ہو گا کہ ''ساری تعریفیں، اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔''

مگر ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، کے نزدیک، مفہوم آیت یہ ہے:

''اور ان کی اس دعوت کا آخری نتیجہ یہ ہو گا کہ اس نظامِ ربوبیت کے عالم گیر نتائج کو دیکھ کر، ہر شخص پکار اُٹھے گا کہ خدا کا یہ نظام، کس قدر مستحق حمد و ستائش ہے۔''[۱]

(۱۰) حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام نے، دورانِ دعوت و تبلیغ، یہ اعلان فرمایا:

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء: ۱۴۵+۱۶۴)

''میرا اجر (معاوضہ) تو اللہ رب العالمین ہی کے ذمہ ہے (میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔)''

لیکن ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، ان دونوں آیات کا مفہوم، کچھ اور ہی ہے، چنانچہ وہ، ان کا مفہوم، یوں بیان کرتے ہیں:

''دیکھو! میں تم سے اس بات کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا، میرا معاوضہ تو خدا کی ربوبیت عالمینی کے ذمہ ہے۔''[۲]

''میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاملۂ معاوضہ، خدا کے عالم گیر نظامِ ربوبیت کے ذمہ ہے۔''[۳]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ (صحابہ کرام) ''خدا کے عالم گیر نظامِ ربوبیت'' اور ''خدا کی ربوبیت عالمینی'' کے قیام سے پہلے ہی، دعوتِ حق دیتے ہوئے، دارِ فانی کو چھوڑ کر، عالمِ باقی کو سدھار گئے، وہ بیچارے اپنے معاوضہ کو کس کے ذمہ ڈالیں گے؟

---

[۱] مفہوم القرآن، ص ۴۶۰ [۲] مفہوم القرآن، ص ۸۴۹

[۳] مفہوم القرآن، ص ۸۵۱ تا ۸۵۲

(۱۱) قرآن مجید میں، ایک اور مقام پر، رب العالمین، کا تذکرہ، یوں کیا گیا ہے:

وَقُضِیَ بَیۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَقِیۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (الزمر:۷۵)

''اور لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا، اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب عالمین کے لیے۔''

اب اسی آیت کا مفہوم، ''مفکر قرآن'' کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے:

''اس وقت، تمام انسانی اُمور کے فیصلے، حق کے ساتھ ہوں گے، اور خدا کی ربوبیت عالمینی، اس حسن و خوبی سے آشکارا ہوگی کہ ہر ایک کی زبان، اس کی حمد و ستائش میں، زمزمہ بار اور نغمہ سنج ہوگی۔''[1]

(۱۲) اب، آخر میں سورۃ الصافات کی یہ آخری پیش کی جاتی ہے:

وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (الصافات:۱۸۲)

''اور ساری تعریف، اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔''

لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب کے نزدیک، مستحق تعریف، اللہ رب العالمین نہیں، بلکہ وہ نظام ہے جو تمام اقوامِ عالم کی نشو و نما کا ضامن ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اور ساری دنیا کس طرح، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ خدا کا وہ نظام، جو اقوامِ عالم کی نشوونما کا ضامن ہے، کس طرح، سراپا، سزاوار حمد و ستائش ہے۔''[2]

قبل، اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ اللہ سے مراد، ''اس کا قانون'' لینا، اور رب سے مراد ''نظامِ ربوبیت'' لینا، کس طرح انسان کو، اللہ تعالیٰ سے کاٹ کر، اسے صرف قانونِ کائنات اور نظامِ فطرت یا نظامِ معیشت کا بندہ و غلام بنا دیتا ہے، ان خود ساختہ معانی کی لغویت واضح کرنا ضروری ہے۔

ان نرالے معانی اور انوکھے مفاہیم پر سوچنے کی چند باتیں:

ذرا غور فرمایئے کہ لفظ ''اللہ'' کس قدر عام فہم اور مشہور و معروف کلمہ ہے۔ اسے سمجھنے

---

[1] مفہوم القرآن، ص ۱۰۸۷ [2] مفہوم القرآن، ص ۱۰۵۱

کے لیے کوئی ابہام یا پیچیدگی حائل نہیں ہوتی۔ نہ یہ کوئی ایسا کثیر المعانی لفظ ہے کہ اس میں اشتراکِ معانی اور تشابہ مفاہیم کے باعث، کوئی اشتباہ لازم آ جائے۔ نہ یہ کوئی استعاراتی یا تلمیحی کلمہ ہے جس کا قطعی مفہوم پا لینا مشکل ہے۔ ہر خاص و عام، خواندہ و ناخواندہ اور کافر و مومن، یہ جانتا ہے کہ "اللہ" اس ہستی کا ذاتی نام ہے جس نے یہ وسیع کائنات، اور اس میں واقع ہر چیز کو، خلعت وجود بخشا ہے۔ لیکن ہمارے "مفکر قرآن" نے اپنی تفکیر اور دانشوری کی بھینٹ چڑھا کر، اسے، ایک چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے۔

بے شک، اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے ایک نظام دیا ہے، مگر خدا کا یہ نظام، خود خدا نہیں ہے۔

یقیناً، خدا کی اطاعت کا واحد ذریعہ، اس کے قانون، حکم اور رسول کی اطاعت ہے۔ لیکن نہ تو "خدا کا قانون" الٰہ ہے، اور نہ ہی "اس کا حکم" خدا ہے، اور نہ ہی "اس کا رسول" خود اللہ ہے، حالانکہ رسول کی اطاعت، خود اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. مگر اس کے باوجود بھی، رسول اور اللہ میں وہی مغایرت پائی جاتی ہے جو مخلوق اور خالق میں واقع ہے۔

لاریب، خداوند قدوس، بڑی وسعتوں کا مالک اور سراپا علم و بصیرت ہے، لیکن خدا کی ان صفات کو، خدا کے نظام یا قانون کے ساتھ نتھی کر ڈالنا، اور پھر اس نظام یا قانون ہی کو، "بڑی وسعتوں کے مالک اور سراپا علم و بصیرت" قرار دینا، قطعی مہمل بات ہے۔

بلاشبہ، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صورت میں ایک دستور اور قانونِ حیات دیا ہے جس کے ایک قانون کا انکار بھی کفر ہے، لیکن اس کے باوجود، خدا کے قانون اور دستور کو، خود خدا قرار نہیں دیا جا سکتا (خواہ وہ بقولِ پرویز، قانونِ ربوبیت ہی کیوں نہ ہو) اللہ اور اس کے قانون کو شے واحد یا مترادف المفہوم قرار دینا، کھلی کھلی تلبیس و تدلیس ہے۔

یقیناً، ہم سجدہ، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہی میں کرتے ہیں، اور صرف اُسے ہی سجدہ کرتے ہیں (نہ کہ اس کے حکم اور قانون کو)

لاریب، حکم خداوندی پر چلنا ہی، اس کی عبادت و بندگی اور اطاعت و فرمانبرداری ہے، مگر معبود، اللہ رب العزت کی ذات ہی ہے، نہ کہ اس کا حکم یا قانون۔

بے شک، اللہ تعالیٰ، دلوں میں چھپی ہوئی نیتوں، خیالات، محرکات و مقاصد اور اغراض وغایات تک سے واقف و باخبر ہے، لیکن خدا کی اس صفت (عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ) کو، خدا کی بجائے، اس کے ''قانونِ مکافات'' سے وابستہ کر دیا جائے، تو یہ نہ صرف یہ کہ خلافِ حقیقت ہوگا، بلکہ خود حقیقتِ نفس الامری کو بھی، اس تحریف کے ذریعہ، فصاحت و بلاغت کے بلند ترین معیار سے گرا کر، رکاکت کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دینے کے مترادف ہوگا۔ ذاتِ خداوندی، صاحب ارادہ وشعور، اور صاحب علم وخبر ہے۔ اس کا نظام یا حکم یا قانون، ذی شعور وارادہ اور صاحب علم وخبر نہیں ہے۔ بلکہ قانون کی خوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اندھا ہو، تاکہ وہ امیر وغریب، شاہ وگدا، ادنیٰ واعلیٰ، اور شریف و وضیع میں فرق و امتیاز نہ کر سکے، اور سب کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کرنا، اس کا شیوہ ہو۔

اور آخر میں رب العالمین کا معنیٰ ''نظامِ ربوبیت'' بیان کرنا، گویا جدت طرازی کی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر لینا ہے۔ علاوہ ازیں، اس معنی میں ''جدت طرازی'' اور ''نرالا پن'' دونوں ہی جمع ہو گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ (فرض کیجیے) کسی مقام پر ''نظامِ ربوبیت'' قائم ہو جاتا ہے، تو کیا اس نظام کے خاتمہ کا معنیٰ، خود ''رب العالمین'' کا خاتمہ ہوگا؟ کیا جب تک ''نظامِ ربوبیت'' کا وجود قائم نہ ہو۔ اس وقت تک ''رب العالمین'' کا وجود بھی معدومِ محض ہوگا؟ اور جونہی، جس مقام پر ''نظامِ ربوبیت'' وجود پذیر ہو جائے، تو کیا اس کا معنیٰ، خود ''رب العالمین'' کا معرضِ وجود، میں آ جانا ہوگا؟ اور پھر کیا ''نظامِ ربوبیت'' کے فنا کے گھاٹ اُترتے ہی (معاذ اللہ) ''رب العالمین'' کا وجود بھی مٹ جائے گا؟ ان اُمور پر سرسری غور وفکر ہی ''مفکر قرآن'' کی الحاد فی الآیات کی عادتِ مالوفہ کو واضح کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص، اللہ کا مفہوم بدل کر، کچھ سے کچھ کر ڈالے، وہ قرآنی آیات کے ترجمہ وتفسیر، اور تشریح وتوضیح میں کیا شگوفے نہیں چھوڑ سکتا؟ اور کیا گل نہیں کھلا سکتا؟ اس

قسم کی تفسیر، تو تفسیر بالرائے سے بھی گئی گزری ہے۔ جس مفسر کے ہاں، اللہ سے مراد، خالق کائنات کی زندۂ جاوید ہستی نہ ہو، بلکہ محض عالم گیر نظامِ ربوبیت ہو، اور اللہ و رسول سے مراد، وہ دو ہستیاں نہ ہوں، جن میں سے ایک خالق ارض وسماء اور دوسرا، اس کا ارسال کردہ نمائندہ مجاز ہو، بلکہ جب ''اللہ اور رسول'' کا لفظ اکٹھا بولا جائے، تو اللہ کی الوہیت ختم، اور رسول کی رسالت معدوم، اور پھر اس عدمِ محض سے ایک اور ہستی کا برآمد ہونا قرار پائے، جسے ''مرکز ملت'' کہا جاتا ہے، تو اس ''مفکر قرآن'' کی تحریف والحاد پر مشتمل ایسی تفسیر کو، اگر تفسیر بالرائے کا نام دے دیا جائے، تو ہمیں اندیشہ ہے کہ دنیا میں جو تفاسیر فی الواقعہ، تفسیر بالرائے کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں سے کوئی تفسیر، اسے اپنی توہین سمجھ کر، ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ نہ دائر کر دے۔

خلقِ خدا کو خدا سے بیگانہ کرنے کی ''مفکرانہ'' کاوش:

قرآن کریم کی بیسیوں نہیں، بلکہ سینکڑوں آیات ہیں، جن کے مفاہیم میں، لفظ ''اللہ'' کو دیکھ کر، ذاتِ خداوندی کی بجائے، ''قانون'' مراد لے کر انسانی قلب و ذہن کو، ہستی باری تعالیٰ کی بجائے، اس کے قانون کی طرف موڑا گیا ہے۔ ایک عام قاری جب ایسی آیات میں بکثرت مواقع پر، بتکرار واعادہ، خدا کی بجائے، اس کے قانون ہی سے متعارف ہوتا ہے، تو اسکے دل و دماغ میں قانونِ خدا تو جگہ پا لیتا ہے، لیکن ذاتِ خدا کو نفوذ و رسوخ حاصل نہیں ہوتا، اور انسانی توجہ اور تگ و دو کا مرکز، ذاتِ الٰہیہ کی بجائے، کائناتی قوانین ہی بن کر رہ جاتے ہیں۔ انسانی دنیا میں قولاً تو خدا کا انکار نہیں کیا جاتا، لیکن عملاً ساری توجہ اور سعی و کاوش کا مرکز و محور، قوانین فطرت ہی قرار پاتے ہیں۔ یہ بالکل وہی صورتِ حال ہے، جو آج کل مغرب میں پائی جاتی ہے، جہاں خدا کا وجود ...... بلکہ تین خداؤں کا وجود ......صرف زبانی کلامی اعتراف ہی کی حد تک پایا جاتا ہے، لیکن عملی جدو جہد اور سعی و کاوش کی اساس، طلب رضائے خداوندی کی بجائے، محض اس کے طبیعی قوانین ہی بن کر رہ جاتے ہیں، اور پھر ان قوانین میں، علت و معلول کے پہلو پر راسخ الاعتقادی، مکمل طور پر، انسانی

ذہن میں، خدا کی بجائے، اس کے قانون ہی کو راسخ کر دیتی ہے، یہ چیز، مذہبِ مادہ پرستی کا ہدف و مقصد بھی ہے، اور اس کا نتیجہ و ثمرہ بھی ہے۔ جس کے مآل و انجام کے طور پر، خدا اور آخرت کے تصورات، بنی نوع انسان کے دل و دماغ سے مٹتے چلے جاتے ہیں، اور مادہ پرستی کے ماحول میں، قوانین فطرت کا مطالعہ، مسلکِ مادہ پرستی ہی کو قلوب و اذہان میں راسخ کرتا چلا جاتا ہے۔ یورپ کی مادہ پرستی کی تہہ میں، یہی حقیقت پائی جاتی ہے۔ خود پرویز صاحب ایک مقام پر یہ لکھتے ہیں:

> ''یورپ کی مادہ پرستی، ان کے قلوب و اذہان کو، اس درجہ متاثر کر چکی تھی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ جو کچھ ہوتا ہے، عِلل و اسباب کے تحت ہوتا ہے، خدا کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔''

''مفکر قرآن'' کی پچاس سالہ'' قرآنی خدمات'' میں، یہ امر بہت نمایاں ہے کہ انہوں نے قرآن مجید میں جملہ صفاتِ خداوندی کا رُخ، ذاتِ باری تعالیٰ سے پھیر کر، مادی دنیا میں طبیعی قوانین کی طرف اور انسانی دنیا میں ''نظامِ ربوبیت'' اور ''مرکز ملت'' کی طرف منتقل کیا ہے، اور یہ چیز، اُن کی ''قرآنی خدمات'' کے پس پردہ، اُن کے مخفی ہدف (Hidden Agenda) کو بے نقاب کر ڈالتی ہے۔

۲۔ مرکز ملت ہی ''اللہ اور رسول'' ہے

۱۔ زید نے کھانا کھایا

۲۔ زید نے سیب کھایا

دونوں جملوں کو بغور پڑھیے۔ پہلے جملے میں فعل خوردن کا مفہوم ''کھانا'' ہے، اور دوسرے میں ''سیب''...... اب کیا یہ درست ہو گا کہ ہم ''کھانا'' کا معنی ''سیب'' کر ڈالیں؟...... اگر نہیں، اور یقیناً نہیں، تو اس شخص کا معاملہ کس قدر پُرفریب ہے جو ''کھانا'' کا معنی ''سیب'' کر ڈالنے پر، محض اس لیے مصر ہے کہ ''کھانا'' کی جگہ، اگر ''سیب'' رکھ دیا جائے تو جملے میں کوئی ابتری واقع نہیں ہوتی، اور اس صورت میں بھی جملہ بامعنی ہی رہتا

ہے۔ آپ جس قدر چاہیں، شور مچاتے رہیں کہ ''کھانا'' بمعنی ''سیب'' نہ تو محاورۂ عرب ہی میں مستعمل ہے، اور نہ کتب لغات ہی میں موجود ہے۔ مگر وہ صاحب، یہی فرمائے جارہے ہیں کہ.......... ''کتب لغات، اس سے خالی ہوں تو ہوں، محاورۂ عرب میں اس کا استعمال ہو، یا نہ ہو، مگر ''کھانا'' کی جگہ ''سیب'' رکھ دینے سے جملے کی ترتیب وساخت اور مفہوم و مراد میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا ''کھانا'' کا لغوی معنیٰ ''سیب'' نہ سہی، مگر مرادی مفہوم، تو بہر حال سیب ہی ہے.........''

بالکل یہی حال، جناب ''مفکر قرآن'' صاحب نے قرآن پاک کی اُن آیات کا کیا ہے، جن میں ''اللہ و رسول'' کی اطاعت کا ذکر ہے۔ وہ ''اللہ و رسول'' سے مراد، ان دو ذوات کو نہیں لیتے، جن میں سے ایک ہستی فاطر السموٰت والارض ہے، اور دوسری، اس کی طرف سے مامور، وہ محترم شخصیت ہے جس کی زندگی، اہل ایمان کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' ہے، بلکہ وہ ''اللہ و رسول'' سے مراد ''مرکز ملت'' یا ''مرکز نظامِ اسلامی'' لیتے ہیں۔ چند اقتباسات، ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ اللہ اور رسول سے مراد، مرکز نظامِ اسلامی ہے۔ [۱]

۲۔ اللہ اور رسول سے مراد، اسلامی مملکت یا قرآنی نظامِ حکومت ہوتا ہے۔ [۲]

۳۔ اللہ اور رسول سے مراد، وہ مرکز نظامِ اسلامی (Central Authority) ہے، جہاں قرآنی احکام نافذ ہوں۔ یہ حقیقت، کہ اللہ اور رسول سے مراد، مرکز ملت ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ [۳]

اپنے اس مزعومہ کی حمایت میں ''مفکر قرآن'' صاحب، بڑی بے تکلفی سے، ان آیات کو پیش کرتے چلے گئے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت مذکور ہے، پھر ''اللہ و رسول'' کی جگہ ''مرکز ملت'' یا ''مرکز نظامِ اسلامی'' کے الفاظ، اُسی طرح نصب کر

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، ج ۴، ص ۳۴۰ [۲] تفسیر مطالب الفرقان، ج ۶، ص ۷۰

[۳] معراج انسانیت، ص ۳۱۸

ڈالتے ہیں، جس طرح ''کھانا'' کی جگہ ''سیب'' کو ثبت کر ڈالا جاتا ہے، اور پھر نتیجہ وہ نکالا جاتا ہے، جو اقتباساتِ بالا میں ظاہر کیا گیا ہے۔

مزعومۂ پرویز میں اسقام و علل:

بعض لوگوں کی دماغی ساخت، کچھ اس قسم کی واقع ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں نرالی اُپج اختیار کرتے ہیں، اور اسے بزعم خویش، بڑا ''علمی نکتہ'' قرار دیتے ہیں، لیکن نہیں سمجھتے کہ ان کے یہ ''علمی نکات'' میزانِ علم وحقیقت میں کوئی وزن نہیں رکھتے، بلکہ اُلٹا عامۃ الناس کی گمراہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ''خدا اور سول'' کا معنی ''مرکز ملت'' کرنا، ایک ایسی ہی نکتہ آفرینی ہے جس نے صرف چند عوام الناس ہی کو نہیں، بلکہ بعض عربی زبان سے ناآشنا، پڑھے لکھے لوگوں کو بھی، ہم آغوشِ ضلالت کر دیا ہے۔ ''اللہ اور رسول'' کی اس نرالی اور انوکھی تفسیر میں، جو اسقام و علل مضمر ہیں، ذیل میں انہیں درج کیا جا رہا ہے تاکہ ہر شخص، اس تفسیر وتشریح کا وزن، خود محسوس کر لے۔

(۱) نظامِ اسلام سے قبل ''خدا اور سول'' کی اطاعت:

اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد، اگر نظامِ اسلامی کے مرکز کی اطاعت لی جائے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نظامِ اسلامی ہنوز قائم ہی نہ ہوا تھا، تو اس وقت ''اللہ ورسول'' کی اطاعت کا کیا، مفہوم تھا۔ مثلاً حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کی ہوئی تحریک کے نتیجہ میں، اسلامی نظام کا قیام، تو مدنی دور میں ہوا تھا۔ خود پرویز صاحب رقم طراز ہیں:

۱۔ ''فتح مکہ کے بعد، مسلمانوں کی حقیقی حکومت کی بنیاد پڑتی ہے۔'' [۱]

۲۔ ''ہجرت کے بعد اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی، وہ آہستہ آہستہ مستحکم بھی ہوتی گئی ...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے ابتدائی آٹھ سال میں صورت یہ تھی کہ اسلامی مملکت قائم تھی۔'' [۲]

---

[۱] معارف القرآن، ج ۴، ص ۵۶۸

[۲] تفسیر مطالب الفرقان، ج ۶، ص ۱۲۹

اب سوال یہ ہے کہ اگر ''نظامِ اسلامی'' یا ''اسلامی حکومت'' کا قیام، فتح مکہ کے بعد ہوتا ہے یا ہجرت کے فوراً بعد ہی ہو جاتا ہے، تو آخر مکی دور میں نازل ہونے والی ان آیات کا کیا مفہوم ہو گا جن میں ''اللہ و رسول'' کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے؟ کیونکہ اطاعت ''خدا اور رسول'' تو مکی دور میں بھی اہل ایمان پر لازم تھی، اور مدنی دور میں بھی۔ مدنی دور میں اگر ''اللہ و رسول'' سے مراد ''نظامِ اسلامی'' لیا جائے، تو پھر مکی دور میں اس نظام کا موجود نہ ہونا، کیا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس وقت ''اللہ و رسول'' کا وجود ہی نہ تھا، اور لوگوں کو ''خواہ مخواہ'' اللہ و رسول'' کی نافرمانی پر جہنم کی وعید سنائی گئی؟ جیسا کہ مکی سورۃ الجن میں یہ کہا گیا ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا

(الجن: ۲۳)

''اور جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟ [۱]

(۲) ایک ''اللہ و رسول'' یا متعدد الٰہہ و رسل؟

عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ میں وسیع و عریض دنیا پر پھیلی ہوئی اسلامی مملکت، بہر حال، ایک مرکز کے ماتحت تھی، جب کہ آج پورا عالم اسلام، انتشار کا شکار ہے، اور مسلم سلطنتیں بیسیوں مراکز میں بٹ چکی ہیں۔ اب کیا ہر مسلم مملکت کے لیے، ہم جدا جدا ''اللہ و رسول'' تسلیم کر لیں، یا سب کے لیے ایک ہی ''اللہ و رسول'' کو تسلیم کر لیں؟ ...... کیا یہ سب ''اللہ و رسول'' اپنی اپنی جگہ (اپنے باہمی اختلافات بلکہ نزاعات کے باوجود) خود معیارِ حق ہوں گے، یا ان میں سے بالاتر بھی کوئی ''اللہ و رسول'' ہو گا، جس کے سامنے بصورتِ نزاع، باقی سب ''اللہ و رسول'' سر جھکا دیں گے؟ کیا پوری ملت اسلامیہ کو، آپ، ایک ہی ''اللہ و رسول'' کے تابع رکھیں گے یا جملہ ممالک کے لیے متعدد اور متفرق ''خداؤں اور رسولوں'' کا

---

[۱] طلوع اسلام، جون ۱۹۵۱ء، ص ۴ + ستمبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۲

وجود مانیں گے؟ ...... اگر آپ پوری روئے زمین کے مسلمانوں کو، ایک ہی ''اللہ ورسول'' کی تابعداری میں رکھنا چاہیں گے تو اس مقصد کے لیے آپ تلوار سونت کر، میدانِ حرب و قتال میں آئیں گے تاکہ ایک ''اللہ ورسول'' کے سوا، باقی سب ''اللہ ورسول'' فنا کے گھاٹ اُتر جائیں، یا آپ الیکشن کے ذریعہ، کسی ایک ''اللہ ورسول'' کو منتخب کرلیں گے؟...... کیا ہی اچھا ہوتا اگر جناب پرویز صاحب، اپنی زندگی ہی میں، ان اُلجھنوں کو صاف کر جاتے، اور ہمیں، ادارۂ طلوعِ اسلام سے وابستہ، ان کے پسماندگان سے یہ نہ کہنا پڑتا کہ:

کوئی ہے، جو اس سوال کا جواب دے؟![1]

(۳) خدا ورسول کے نام پر بدترین آمریت

نظامِ اسلامی کے مرکز کو ''اللہ و رسول'' قرار دینے سے، خدا و رسول ہی کے نام پر، ایسی بدترین آمریت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے زیادہ گھناؤنی آمریت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے، زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے، پہلا ''معرکۃ الآراء کام'' تو یہ کیا کہ عیسائیت کی تاریخ سے مذہبی پیشوائیت کا تصور لے کر، اسے، اُمتِ مسلمہ کی تاریخ میں لا گھسیڑا، اور دوسرا ''عظیم الشان کارنامہ'' یہ انجام دیا کہ ''ملا ازم''، ''پریسٹ ہڈ'' ''تھیاکریسی'' جیسے لیبل تراش کر، علماء کرام، محدثین عظام اور فقہاءِ اُمت کی طرف، مذہبی پیشوائیت کی اپنی خود ساختہ ایسی گھناؤنی اور گھٹیا تصویر منسوب کی، جو دنیا بھر کی نفرتوں کے الوان سے اُن کے موئے قلم نے تیار کی تھی، اگر اس تصویر کو من وعن قبول کر بھی لیا جائے تو تب بھی، بات یوں بنتی ہے کہ حضرت علماء کرام:

> ''چونکہ اپنے فیصلے کو، اپنا فیصلہ قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ اسے ''خدا و رسول'' کا فیصلہ کہہ کر صادر کرتے تھے، اس لیے کسی کی مجال نہیں کہ اس سے سرتابی کر سکے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم (خدا و رسول کے نام پر مر مٹنے کے لیے) ان کے ساتھ ہوتا تھا، اس سے ایسی تھیاکریسی (Theocracy) وجود میں آ گئی،

---

[1] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۱ء، ص ۴+ ستمبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۲

جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔" [1]

لیکن خود "مفکر قرآن" صاحب، جس تھیا کریسی کو جنم دے رہے ہیں، اس میں خود "مرکز ملت" ہی "اللہ و رسول" بن جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص، مرکز ملت کی کسی غلطی پر ٹوکتے ہوئے، یہ کہے کہ..... "آپ کا یہ اقدام غلط ہے، خدا و رسول کا حکم تو یہ ہے، جب کہ آپ اس کے برعکس یہ کر رہے ہیں"..... تو مرکز ملت پلٹ کر یہ جواب دے گا کہ......
"آپ کس خدا و رسول کی بات کر رہے ہیں، آپ تو نرے جاہل ہیں، آپ کو تو یہ تک معلوم نہیں کہ "خدا و رسول" کا تو معنی ہوتا ہے، "مرکز ملت" اور "مرکز نظامِ اسلامی۔" تمہارے ذہن میں، محدثین کی "عجمی سازش" کے تحت، غالباً، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تصور جما ہوا ہے۔ حالانکہ وہ، مرکز ملت ہونے کی بناء پر، اپنے زمانے میں "خدا و رسول" تھے۔ ہم آج، اپنے زمانے میں "مرکز ملت" ہونے کی بنا پر "اللہ و رسول" ہیں۔ ہم گزشتہ زمانے کے کسی "خدا و رسول" کے فیصلوں کے پابند نہیں ہیں......" اس طرح "مفکر قرآن" صاحب کا یہ تصور، جسے وہ بڑا معرکۃ الآراء تصور سمجھتے ہوئے پیش کرتے ہیں، "خدا و رسول" کے نام کو اپنے لیے مخصوص کرتے ہوئے، اور "خدا و رسول" کے منصب پر براجمان ہوتے ہوئے، وہ کچھ کرے گا، جس کی مثال، دنیا کی کسی تھیا کریسی میں نہیں ملتی۔

یقیناً وہ شخص بڑا ظالم ہے، جو خدا اور رسول کا نام لے کر، اپنا حکم چلاتا ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر ظالم، وہ شخص ہے، جو "مرکز ملت" کی خود ساختہ اصطلاح کی آڑ میں، خود خدا اور رسول بن بیٹھتا ہے، اور پھر اپنا حکم چلاتا ہے۔

"مرکز ملت" ایک بدترین "قرآنی" ڈکٹیٹر

الغرض "اللہ و رسول" سے مراد، اگر "مرکز ملت" لیا جائے، تو وہ "مرکز ملت" ایک ایسی بدترین اور ظالمانہ آمریت کا مجسمہ ہوگا، جس کے سامنے، نمرود، فرعون، ہلاکو خان، چنگیز خاں، ہٹلر اور مسولینی کی شہرۂ آفاق آمریتیں بھی ہیچ ہوں گی۔ "مرکز ملت" کی اس

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، ج ۴، ص ۳۴۲

آمریت کو، اس آمریت سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوگی، جسے ہمارے ''قرآنی گوئبلز'' عمر بھر مذہبی پیشوائیت کے نام سے مطعون کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ ''اللہ ورسول'' کی اس ماڈرن تفسیر کے مطابق جو لوگ حکومت سے اختلاف کریں گے (خواہ یہ اختلاف کتنے ہی مضبوط دلائل پر قائم ہو) اور ''مرکز ملت'' کی سمع و طاعت سے گریزاں ہوں گے، وہ کم از کم دو جرائم کے ضرور مرتکب قرار پائیں گے، ان کا پہلا جرم یہ ہوگا کہ وہ ''اللہ ورسول'' سے اختلاف کریں گے، حالانکہ اللہ ورسول اختلاف سے بالا تر ہیں، اور دوسرا جرم یہ کہ، وہ ''کھلی کھلی گمراہی'' کا شکار قرار پائیں گے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب:۳۶)

''اور جس نے ''اللہ اور اس کے رسول'' کی نافرمانی کی، تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔''

چنانچہ ''قرآنی حکومت'' کا یہ فتویٰ، (جو قرآن، قرآن کی رٹ لگا کر رسید کیا جائے گا، صرف دنیا تک ہی محدود نہیں رہے گی، بلکہ مرنے کے بعد، آخرت میں بھی، ان لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑے، یہاں تک کہ وہ جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا

(الجن:۲۳)

''اور جو کوئی ''اللہ اور اس کے رسول'' کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہوگی جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ سورۃ الجن کی آیت ہے، جو مکی دور میں، اُس وقت نازل ہوئی تھی، جب (بقول پرویز صاحب) اسلامی نظام ابھی قائم ہی نہ ہوا تھا کہ ''مرکز ملت'' کی فرماں برداری یا نافرمانی کا کوئی سوال پیدا ہوتا۔ اب یا تو اس بات کا اعتراف کر لیا جائے کہ ''اللہ ورسول'' کا وہ مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں، جو ''مرکز ملت'' کی خود ساختہ اصطلاح میں پیدا کیا گیا ہے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ ''اللہ ورسول'' (بمعنی مرکز ملت) کی

نافرمانی پر یہ وعید، وہ فعل عبث ہے، جو اس وقت دی گئی جب کہ ''اللہ و رسول'' کا ابھی وجود ہی قائم نہ ہوا تھا (معاذ اللہ) اور ان کی اطاعت و عدم اطاعت کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔

بہر حال، ''مرکز ملت'' کے یہ مخالفین و منکرین، اگر مر گئے، تو ایک مرتبہ کیا، ستر مرتبہ بھی اگر ان کے لیے دعاءِ مغفرت کی جائے، تو بھی ان کی بخشش نہ ہوگی، کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے ''اللہ و رسول'' کا انکار کیا ہے:

اِنْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (التوبة:۸۰)

''اگر آپ ستر مرتبہ بھی، ان کے حق میں، اللہ سے مغفرت طلب کریں، تب بھی، اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا، کیونکہ ان لوگوں نے ''اللہ اور اس کے رسول'' کا انکار کر ڈالا ہے۔''

''مرکز ملت'' کے منکرین، نہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے، اور نہ اس بات کے کہ، ان کی قبر پر دعاء کرنے کی غرض سے کھڑا ہوا جائے۔ ''مرکز ملت'' نہ خود ایسا کرے گا، اور نہ کسی اور کو ایسا کرنے دے گا، کیونکہ ''قرآنی حکم'' یہی ہے:

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (التوبة:۸۴)

''اور آپ ان میں سے کسی پر بھی، کبھی نماز (جنازہ) نہ پڑھیے، اور نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہوں، انہوں نے ''اللہ اور اس کے رسول'' کا انکار کیا ہے۔''

ان چند آیات ہی سے اندازہ لگا لیجیے کہ اگر ''اللہ و رسول'' سے مراد، ''مرکز ملت'' لیا جائے، تو پرویزی تصور کے مطابق، قائم ہونے والی، ''قرآنی حکومت'' کس قدر بدترین آمریت کا روپ دھار لیتی ہے؟ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اس آمریت کی تو تردید کرتے ہیں، جس میں کوئی شخص، بقول ان کے، اپنے فیصلے کو خدا اور رسول کا فیصلہ کہتا ہے، لیکن اس سے کہیں بڑھ کر، ایسی ظالمانہ اور مستبدانہ آمریت کو، قرآن سے کشید کر ڈالتے ہیں،

جس میں ''مرکز ملت'' کے نام سے، کوئی شخص، خود ''اللہ و رسول'' بن بیٹھتا ہے۔

ذرا غور فرمائیے:

طلوع اسلام سے وابستہ حضرات تو، اس بات سے بالاتر ہیں کہ انہیں، اس معاملہ میں غور وفکر کی دعوت دی جائے، لیکن عام اہل اسلام سے یہ درخواست ہے کہ وہ خود غور فرمائیں کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر مجرد ''اللہ'' کا لفظ بولا جائے، تو اس سے واقعی خالقِ کائنات کی ذات مراد لی جائے، اور اگر صرف ''رسول'' کا لفظ بولا جائے، تو اس سے فی الحقیقت، وہ مامور من اللہ شخصیت مراد لی جائے، جو اہل ایمان کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔ لیکن جب اللہ و رسول کے الفاظ (معطوف اور معطوف علیہ کی صورت میں) اکٹھے بولے جائیں تو اب ''اللہ'' اپنی الوہیت سے، اور ''رسول'' اپنی رسالت سے معزول ہو گیا۔ پھر جب اس طرح، اللہ کی الوہیت اور رسول کی رسالت (معاذ اللہ) ختم ہو گئی، تو اس عدم سے ''مرکز ملت'' کا وجود، عمل میں آیا۔ گویا یہ الٰہیات اور نبوت و رسالت کے مسائل نہ ہوئے، بلکہ سائنس کی لیبارٹری کے مسائل ہوئے، جہاں آکسیجن اور ہائیڈروجن کو، جب ایک خاص ترکیب سے جمع کیا جاتا ہے، تو جہاں آکسیجن کی تحریقی خاصیت ختم ہو جاتی ہے، وہاں ہائیڈروجن سے، اس کی احتراق پذیری کی صفت منفک ہو جاتی ہے، اور ''پانی'' نام کی ایک نئی چیز، اُسی طرح معرضِ وجود میں آجاتی ہے، جس طرح، ادارہ طلوع اسلام کی ''قرآنی لیبارٹری'' میں ''اللہ اور رسول'' کے مجموعے سے ''مرکز ملت'' وجود کوش ہو جاتا ہے، جس میں نہ اللہ کی الوہیت ہی کا، اور نہ رسول کی رسالت ہی کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔

۳۔ ''نظامِ ربوبیت'' ...... بدترین نظامِ آمریت

''مرکز ملت'' کی ''قرآنی ڈکٹیٹرشپ'' کے بعد، اب ''مفکر قرآن'' صاحب کے اُس ''نظامِ ربوبیت'' کی شدید و سنگین ''آہنی آمریت'' کو بھی ملاحظہ فرما لیجیے، جسے انہوں نے غیروں کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری کا شکار ہو کر، اشتراکیت پر قرآنی ٹھپہ لگا کر پیش کیا ہے۔

رہا یہ امر کہ ''یہ اشتراکیت ہی پر قرآنی ٹھپہ ہے'' تو اس کا واضح، نمایاں اور ٹھوس ثبوت، یہی

ہے کہ ''نظامِ ربوبیت'' کے ابتدائی دور میں خود ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اسے قرآنک سوشلزم کہا کرتے تھے، چنانچہ وہ ''سلیم کے نام'' خط لکھتے ہوئے، ''قرآنک سوشلزم'' ہی کو ''نظامِ ربوبیت'' کی مترادف اصطلاح قرار دیا کرتے تھے، ملاحظہ فرمایئے، درج ذیل، اقتباس:

''مجھے تمہاری تجویز سے پورا اتفاق ہے، سلیم! کہ قرآنی نظام ربوبیت (Quranic Socialism) کے متعلق، اسطرح، منتشر طور پر، متفرق مضامین اور خطوط میں لکھنے کی بجائے، ایک مختصر سی کتاب میں، جامع طور پر، سب کچھ ایک جگہ لکھ دیا جائے، تاکہ اس کے سمجھنے میں آسانی ہو۔'' [1]

لیکن بعد میں ''مفکرِ قرآن'' کو یہ احساس ہوا کہ (Quranic Socialism) کی یہ ترکیب، قرآن اور سوشلزم کی باہمی پیوند کاری کو بے نقاب کر ڈالتی ہے، اور لوگ یہ اعتراض کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ پرویز صاحب نے ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے نام سے، جو کچھ پیش کیا ہے، وہ، فی الواقع، قرآن اور سوشلزم ہی کی باہمی آمیزش ہے۔ چنانچہ پھر انہوں نے عامۃ الناس میں، اس تاثر کے سد باب کی کوشش یوں کی کہ اسے ''قرآنی سوشلزم'' کہنے کی بجائے ''قرآنک سوشل آرڈر'' کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ''سلیم کے نام'' اسی مکتوب کو جب کتابی شکل میں پیش کیا گیا تو اسے یوں بدل دیا گیا:

''مجھے تمہاری تجویز سے پورا اتفاق ہے، سلیم! کہ قرآنی نظامِ ربوبیت (Quranci Social Order) کے متعلق، اس طرح منتشر طور پر، متفرق مضامین اور خطوط میں لکھنے کی بجائے، ایک جامع کتاب میں تفصیلی طور پر، سب کچھ ایک جگہ لکھ دیا جائے تاکہ............'' [2]

جب ''مفکرِ قرآن'' کے رگ و پے میں عجلِ اشتراکیت کی محبت رچ بس گئی اور سوشلزم کے عشق میں اندھے ہو گئے، تو انہیں، اسلام ایک سوشلسٹ نظام دکھائی دینے لگا، اور انبیائے کرام کسی حد تک کمیونسٹ نظر آنے لگے، بالکل ساون کے اندھے کی طرح، جسے ہر

---

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۲ء، ص ۲۸

[2] سلیم کے نام، ج ۱، ص ۱۴۳

طرف ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔

۱۔ ''اسلام، خود ایک سوشلسٹ نظام تھا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔'' [۱]

۲۔ ''تمام حضرات انبیاء کرام، اس حد تک فطرۃً کمیونسٹ تھے۔'' [۲]

انبیاء کرام کے متعلق، پرویز صاحب کا یہ فرمان، مارچ ۱۹۳۵ء (محرم الحرام ۱۳۵۴ھ) کے ترجمان القرآن میں ''تعلیماتِ قرآن کے متعلق بحث'' کے زیرِ عنوان، ان کے مقالہ کی چوتھی قسط میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جولائی ۱۹۳۹ء کے طلوعِ اسلام میں، کمیونزم اور اشتراکیت کی بھرپور مخالفت کی تھی، لیکن پاکستان بننے کے بعد، انہوں نے، اشتراکیت کو ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے نام سے پھر قبول کرلیا۔ اس متضاد طرزِ عمل کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ۱۹۳۹ء میں، وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ دروغِ مصلحت آمیز تھا، جو فقیہِ مصلحت بین کی حیثیت سے ان کے قلم سے صادر ہو رہا تھا۔ رہی اصل حقیقت اور سچی بات، جو رندِ بادہ خوار کی حیثیت سے ان کے منہ سے نکلی، تو وہ یہی ہے کہ وہ ذہناً، قلباً اور دماغاً، فریفتۂ اشتراکیت تھے، اور اپنے اشتراکی خیالات کا اظہار، انہیں کرنا بھی پڑتا تھا، تو بڑے محتاط انداز میں کیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن دنوں، انہوں نے انبیاء کرام کو اگر کمیونسٹ کہا تھا، تو ''ایک حد تک'' کی قید لگا کر کہا تھا۔

بہر حال، پاکستان بن جانے کے بعد، جب انہوں نے کھل کر ''نظامِ ربوبیت'' کے نام سے اشتراکیت کا پرچار کیا، اور لوگوں نے انہیں اور ان کے پیروکاروں کو کمیونسٹ گمان کرنا شروع کیا، تو پھر ''مفکرِ قرآن'' نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ:

۱۔ ''کوئی شخص، جو کمیونسٹ ہو، وہ کبھی مسلمان نہیں ہوسکتا، اور جو شخص مسلمان ہو، وہ کبھی کمیونسٹ نہیں ہوسکتا۔'' [۳]

۲۔ کمیونزم اور اسلام دو متضاد تصوراتِ زندگی ہیں۔ نہ کوئی مسلمان اسلام کو مانتے ہوئے

---

[۱] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۰ء، ص ۶۸
[۲] ترجمان القران، محرم الحرام ۱۳۵۴ھ، ص ۶۴
[۳] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۵۸ء، ص ۶

کمیونسٹ ہوسکتا ہے، اور نہ کوئی کیمونسٹ، کمیونزم کو مانتے ہوئے، مسلمان ہو سکتا ہے۔" [۱]

۳۔ "ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ کمیونزم ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے جو اسلام کے تصورِ حیات کی نقیض ہے، اس لیے نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہوسکتا ہے، اور نہ مسلمان کمیونسٹ ہوسکتا ہے۔" [۲]

یہ اُسی "مفکر قرآن" کے فرمودات ہیں، جو چند سال قبل، اسلام کو "سوشلسٹ نظام" اور انبیاء کرام کو، ایک حد تک، کمیونسٹ کہا کرتے تھے۔ ان کے ایسے تضادات کے سمندر کی وسعت و گہرائی کا اندازہ لگانا، اس لیے مشکل ہے کہ:

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

"نظامِ ربوبیت؟"

بات ہو رہی تھی کہ نظامِ ربوبیت، ایک بدترین اور سخت گیر شکنجہ آمریت ہے، کیونکہ یہ سوشلزم ہی کا چربہ ہے، جس کے متعلق گزشتہ صفحات میں یہ گزر چکا ہے کہ وہ بدترین آمریت کا نظام ہے، اور اسی کے متماثل "نظامِ ربوبیت" ہے جیسا کہ "مفکر قرآن" صاحب بتکرار و اعادہ اعلان فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ان کے اعلانات سے قطع نظر، اگر نظامِ ربوبیت کے خمیر اور ساخت ہی کو دیکھا جائے، تب بھی، اس کا بدترین نظامِ آمریت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

"مفکر قرآن" صاحب کے نزدیک، یہ ضروری ہے کہ ملک کے جملہ ذرائع وسائل (خواہ وہ فطری ہوں یا مصنوعی)، تمام پیداواری سرچشمے اور زمینیں (خواہ وہ مسکونہ ہوں یا مزروعہ) سارے کے سارے کارخانے اور کارگاہیں، مملکت کے قبضے میں ہوں۔ تمام کی تمام شخصی املاک کو ختم کر کے، انہیں، حکومتی تصرف میں دے دیا جائے۔ حدودِ مملکت میں کوئی کارخانہ، فیکٹری، زرعی زمین، دکان یا دفتر ایسا نہ ہو جو کسی شخص کی نجی ملکیت اور پرائیویٹ

---

[۱] طلوع اسلام، جون ۱۹۵۹ء ص ۱۳ [۲] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۰ء، ص ۴

پراپرٹی ہو۔ یہ سب کچھ حکومت کی ملکیت اور تحویل میں ہوگا۔ ان کارگاہوں میں کام کرنے والے مزدوروں، کاشتکاروں، دکانداروں اور اہل کاروں کی حیثیت، ملازمین حکومت کی ہوگی، نہ کہ مالکین جائیداد کی۔ اس کے بعد، مرکزی حکومت ہی تقسیم رزق اور ضروریاتِ حیات کی فراہمی کی ذمہ دار ہوگی۔ اس معاملہ میں سرکار ہی کلی طور پر مقتدرِ مطلق اور مختارِ کل ہوگی۔ اس بندوبست کا نام ''نظامِ ربوبیت' ہے، اور ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہی ''نظامِ ربوبیت'' قائم کرنا، مقصدِ قرآن ہے، جسے چودہ سو سالوں میں، کسی عالم دین، کسی مفسر قرآن، اور کسی امام فقہ نے نہیں سمجھا۔ اسے اگر کوئی سمجھ سکا، تو وہ حضرت کارل مارکس اور ان کے خلیفہ خاص حضرت لینن تھے۔

پھر اس نظام کے متعلق ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اپنی حاجات و مصائب میں، اسی نظام کو پکارا جائے، (نہ کہ اللہ تعالیٰ کو) قرآن کریم میں جو اُدْعُوْ رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً کا حکم آیا ہے، تو اسکا مفہوم یہی ہے کہ خدا کے قانون اور نظام کو پکارو، کیونکہ زندگی کے سامانِ نشوونما پر مکمل قبضہ و کنٹرول، اسی نظام کا ہے، اور تمہاری حاجت برآری، اسی کے قانون کے مطابق ہی ہوسکتی ہے۔

''ربوبیت، اُسی کے قانون اور نظام کے مطابق حاصل ہوسکتی ہے، تو تم بھی، اپنی نشوونما کے لیے، اسی کے قانون کو آواز دو۔ اپنے دل کے کامل جھکاؤ کے ساتھ، جو تمہارے تحت الشعور کی گہرائیوں سے اُبھرے۔'' [1]

اگر اعداء اسلام اور دشمنانِ دین، تمہاری مخالفت کریں، اور تم پر دھاوا بول دیں، تو تمہارے لیے، اُن مخالفین کے مقابل، جو چیز کافی ہوگی، وہ (خدا نہیں، بلکہ) نظام ہوگا۔ فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم کا یہی مفہوم ہے۔

''اگر انہوں نے اس راستے کو اختیار نہ کیا، اور اپنی ضد پر قائم رہے تو ان کی مخالفت بدستور رہے گی، لیکن تمہیں اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرنی چاہیے، ہمارے

---

[1] مفہوم القرآن، ص ۳۵۲

نظام میں، جس کی تم اطاعت کرتے ہو، اتنی قوت ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضرررسانیوں سے محفوظ رکھ سکے۔اس لیے یہ اس خدا کا نظام ہے جوسب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔'' [۱]

اور دیکھو! اگر کوئی ملا چیخ چیخ کر، اور اس کا قرآن چلا چلا کر یہ کہے کہ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ کا مراد و معنی یہ ہے کہ ''دشمنوں کے مقابلہ میں، اللہ ہی تمہارے لیے کافی ہے، اور وہی سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔'' تو تم ہرگز مُلاّ کی بات نہ ماننا، کیونکہ:

۱۔''مُلاّ کے پاس، نہ علم ہوتا ہے، نہ بصیرت۔نہ دلائل ہوتے ہیں، نہ براہین۔'' [۲]

۲۔''ہمارا ملاّ، طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب، دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لیے کہ وہ دعوت، قرآن کی دعوت ہے، اور مُلاّ بیچارہ، قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے۔'' [۳]

لہٰذا، مُلاّ، اگر اس آیت کا ایسا مفہوم بیان کرتا ہے جس میں اہل ایمان کے لیے، دشمنوں کے مقابلہ میں، اللہ ہی کا کافی ہونا، مذکور ہو، تو وہ غلط مفہوم پیش کرتا ہے۔اس کا صحیح مفہوم، صرف اور صرف، وہی ہوسکتا ہے، جس میں ''عرش پر مستوی ان دیکھے خدا'' کی بجائے، ''آنکھوں دیکھے نظام کا کافی ہونا''، بتایا گیا ہو۔

اور اگر ''مُلاّ''، تمھیں یہ بتاتا ہے کہ...... ''پریشانیوں اور معاشی مشکلات کے دوران، تمھیں اللہ ہی کا تقویٰ اختیار کرنا چاہیے، اگر تم ایسا کروگے، تو وہ مصائب وتکالیف میں سے، تمھارے نکلنے کی کوئی راہ پیدا فرمادے گا، اور تمھیں وہاں سے رزق عطا فرمائے گا، جہاں سے رزق کا ملنا، تمھارے سان گمان میں بھی نہ ہوگا، اور جو کوئی اللہ پر اعتماد و بھروسہ کرتا ہے، تو وہ، اس کے لیے کافی ہوجاتا ہے''......تو وہ جاہل مطلق ہے، وہ ''قرآنی نور سے محروم ہے۔'' وہ بھلا کیا جانے کہ ﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ

---

[۱] مفہوم القرآن، ص ۴۹ تا ۵۰

[۲] طلوعِ اسلام، ۵رفروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

[۳] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۷

حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ کے الفاظ کا کیا مفہوم ہے، ان الفاظ کا صحیح اور حقیقی مفہوم صرف وہ ہے، جس میں خدا کی جملہ صفاتِ مذکورہ کو، خدا کی بجائے ''اس کے نظام سے وابستہ کیا گیا ہو، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

''ہوسکتا ہے کہ ان احکام کی پابندی میں، تمھیں کوئی مشکل پیش آئے، لیکن اسے ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ قانون کی پابندی کی وجہ سے اگر کوئی مشکل پیش آتی ہو، تو نظامِ خداوندی ہی اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل پیش کردے گا۔

اس میں معاشی مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں، لیکن نظامِ خداوندی، اس کا انتظام بھی، ایسے طریقے سے کرے گا جس کی تمھیں توقع نہ ہو۔ یاد رکھو! جو شخص بھی، نظامِ خداوندی پر بھروسہ کرتا ہے، تو وہ نظام، اس کے بھروسے کو پوری طرح نباہتا ہے، اور اسے یونہی لٹکتا نہیں چھوڑ دیتا۔'' [1]

تعلق، خدا سے یا مرکزِ نظامِ قرآنی سے؟

اب ذرا غور فرمایئے، آیاتِ قرآنیہ میں، اللہ تعالیٰ کی صفات کو، اُس کی ذات کی بجائے، اس کے قانون اور نظام سے وابستہ کردیا جائے، اور بتکرار و اعادہ، بیسیوں نہیں، بلکہ سینکڑوں مرتبہ ایسا کیا جائے، اور یوں لوگوں کے قلوب و اذہان کو، ہستیٔ باری تعالیٰ پر مرکوز کرنے کی بجائے، اُس سے دور کیا جائے۔ اور ہیر پھیر کے راستے اپنا کر، دل و دماغ میں، اللہ کی بجائے، اس کے قانون، نظام اور مرکز ملت ہی کے تصورات کو راسخ کیا جائے، تو خود سوچیے کہ کیا یہ رغبت الی اللہ کی دعوت ہے؟ یا رغبت عن اللہ کی؟ پھر اس بات پر بھی غور فرمایئے کہ آخر صفاتِ باری تعالیٰ کو، ''قانون''، ''نظامِ ربوبیت'' اور اس کے چلانے والے سربراہ ''مرکز ملت'' کے ساتھ وابستہ کر ڈالنے میں کیا حکمت و مصلحت اور رمز و لم پائی جاتی ہے؟ پھر اس امر پر بھی توجہ فرمایئے کہ جب عامتہ الناس کے قلوب و اذہان میں، یہ عقیدہ راسخ اور مستحکم ہو جائے کہ:

---

[1] مفہوم القرآن، ج ۳، ص ۱۳۲۷

۱۔ ربوبیت کی ساری چابیاں اور کنجیاں، ''مرکز ملت'' ہی کے اختیار وتصرف میں ہیں۔

۲۔ رزاقیت کا مخزن ومنبع، یہی ''نظامِ ربوبیت'' ہے۔

۳۔ تمھاری مشکلات ومسائل کا حل، صرف ''نظامِ ربوبیت'' ہی ہے۔

۴۔ بھروسے، توکل اور اعتماد کے لائق، فقط ''نظام ربوبیت'' اور اس کا سربراہ ''مرکز ملت'' ہے۔

۵۔ دعاؤں اور پکاروں کا سزاوار، صرف ''نظام ربوبیت'' اور ''مرکز ملت'' ہے۔

تو پھر خود سوچیے کہ کسی شخص کو کیا مصیبت پڑی کہ وہ، اُس خدا پر ایمان لائے، جسے ''مُلّا'' نے ''عرش پر مستوی'' کر رکھا ہے۔ جب سارے ذرائع وسائل، ''نظام ربوبیت'' کے مقتدر اعظم ''مرکز ملت'' کے پاس ہیں، اور ہماری تمام معاشی اور معاشرتی مسائل و مصائب کا حل، اس نظام اور اس کی سنٹرل اتھاریٹی ہی کے پاس ہے۔ ساری حاجات کو پورا کرنے والا اور جملہ پریشانیوں سے نجات دینے والا، یہی ''نظامِ ربوبیت'' اور اس کا منتظم ''مرکز ملت'' ٹھہرا، اور ہر قسم کی سہولیات کی فراہمی کا ذمہ دار وہی قرار پایا۔ ہر نوع کا سکون، اطمینان اور ہر طرح کی کشادگی اور بالیدگی، اسی کی نظرِ کرم کا نتیجہ قرار پائی، بھروسے، اعتماد اور توکل کے قابل، وہی ٹھہرا، تو پھر کیوں نہ اس ''نظام'' ہی کے در پر سجدہ ریزی کی جائے؟ کیوں نہ دعاؤں اور پکاروں کے لیے، اسی ''نظام'' کو مخصوص کیا جائے؟ کیوں نہ اس ''نظام'' اوررا س ''مرکز ملت'' پر اپنی عقیدتوں اور نیاز مندیوں کو نچھاور کیا جائے؟ آخر وہ ''نظام'' جو آنکھوں سے دکھائی دینے والا ہے، اور وہ ''مرکز ملت'' جس کے فرمودات، کانوں سے سنائی دینے والے ہیں، کیوں، اُس خدا پر قابل ترجیح نہیں ہے، جسے ''ملا'' نے ''عرش پر بٹھا'' رکھا ہے؟ اور جو نہ دکھائی دیتا ہے، اور نہ ہی اُس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جب تک ''نظامِ ربوبیت'' قائم نہ ہو پائے، تو اس وقت تک تو مجبوراً ان دیکھے خدا سے تعلق رکھا جاسکتا ہے، لیکن ''نظامِ ربوبیت'' کے قائم ہو جانے کے بعد، اور ''مرکز ملت'' کے سربرآرائے اقتدار ہو جانے کے بعد، ''عرش والے'' سے تعلق رکھنا چہ معنیٰ دارد؟ بالخصوص جبکہ یہی ''مرکز

ملت'' ہمارے دور میں ''اللہ و رسول'' بھی ہے۔ پھر کیا ہم ''اللہ و رسول'' سے اختلاف کر کے جہنم کا ایندھن بنیں؟ پھر ''عرش پر متمکن ان دیکھے خدا'' سے تعلق کے نتیجہ میں، جو جنت ملتی ہے، وہ تو مرنے کے بعد، ملتی ہے۔ جبکہ ''نظامِ ربوبیت'' کے ''مرکز ملت'' سے تعلق کے نتیجہ میں ملنے والی جنت، اسی دنیا میں آغاز پذیر ہو جاتی ہے۔

> ''جس طرح، ہم نے غلط نگہی سے، اللہ کو، ''عرش'' پر بٹھا رکھا ہے، اسی طرح جنت کو بھی دوسری دنیا کے ساتھ مختص کر رکھا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ، اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں۔'' [۱]

پھر کیا فائدہ، ان دیکھے خدا پر ایمان لانے اور اس سے تعلق رکھنے کا؟

الغرض! مادی دنیا میں، ہمارا معاملہ، اللہ سے نہیں، بلکہ قانون، نیچر، اور تکوینی امور سے ہے لیکن انسانی زندگی میں، ہمارا معاملہ اُن قوانین وضوابط سے ہے، جو ''مرکز ملت'' ہر دور میں طے کرتا رہے، کہ یہی ''ارتقاء'' کا راستہ ہے۔ چودہ صدیوں پیشتر کے نبیؐ کے اتباع پر قائم رہنا، رجعت پرستی ہے۔ ماضی پرستی ہے، شخصیت پرستی ہے۔ جب کہ ''مرکز ملت'' کا اتباع ہی، شاہراہِ ارتقاء ہے، جو ہمارا ''اللہ و رسول'' بھی ہے، رازق بھی ہے، تقسیم رزق کا ذمہ دار بھی ہے۔ بیشک ''عرش والا خدا'' یہ کہتا رہے کہ ''تقسیم رزق ہمارا کام ہے۔'' نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ، لیکن نہ وہ ''عرش والا'' کہیں نظر آتا ہے، نہ اس کی تقسیم رزق کی کارروائی کہیں دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب کچھ تو ''مرکز ملت'' کر رہا ہے، جس کا نظامِ تقسیمِ رزق نظر آ رہا ہے۔ اور وہ ''مرکز ملت'' معاشرے کے کسی فرد کو بھوکا نہیں مرنے دیتا جبکہ ''عرش والے خدا'' کی دنیا میں، ہزاروں نہیں، لاکھوں ہیں، جو بھوکے رہتے، فاقہ کشی کرتے اور مرتے دکھائی دیتے ہیں لہٰذا، اعتماد کے قابل، خدا نہیں، بلکہ ''مرکز ملت'' ہے۔ بھروسے کے لائق، رب العالمین نہیں، ''نظام ربوبیت'' ہے۔ اتباع و پیروی کا سزاوار، چودہ صدیوں قبل والا نبیؐ نہیں، بلکہ زمانے کی ارتقائی منزلوں میں سے گزرتا ہوا آنے والا،

---

[۱] سلیم کے نام، ج ۱، ص ۱۰۹

آج کا ''مرکز ملت'' ہے۔ یہی ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ اس لیے ہماری پکار بھی اسی کے لیے ہونی چاہیے۔ ہمارا توکل اور بھروسہ بھی اسی پر ہونا چاہیے۔ ہمارا رزق بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے، وہی یا اس کا قانون و نظام ہی مجیب الدعوات ہے، سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہستی اور محمد رسول اللہ کی بجائے، ''مرکز ملت'' ہی سے تعلق و واسطہ رکھیے، کیونکہ آج وہی ''اللہ و رسول'' ہے۔

ایک استفسار:

اب فرمائیے، فاطر السموات والارض ہستی اور محمدؐ رسول اللہ کو پس پشت ڈال کر، اشتراکیت کے چربے ''نظامِ ربوبیت'' کے ساتھ ایسی وابستگی، اور ''مرکز ملت'' کی ایسی اتباع و پیروی میں، جو ''قرآنی ڈکٹیٹرشپ'' پائی جاتی ہے، اُسے آخر، اُس ''مذہبی آمریت'' سے کیا نسبت ہے، جسے ''مفکر قرآن'' صاحب یہ کہہ کر مطعون کیا کرتے تھے کہ..........علماء کرام، اپنے فیصلے کو اپنا فیصلہ قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ خدا اور رسول کا فیصلہ کہہ کر صادر کرتے تھے.......... تاہم، اس کذبِ خالص کو، اگر حقیقت مان بھی لیا جائے، تب بھی بات یہ بنتی ہے کہ علماء، خود کو ''خدا اور رسول'' نہیں کہتے، بلکہ صرف ''اپنے فیصلے'' کو خدا اور رسول کی طرف منسوب کرتے ہیں (اور پھر کسی قوی دلیل سے اس نسبت کو کالعدم بھی کیا جا سکتا ہے۔) لیکن پرویز صاحب، اشتراکیت کے جس چربے پر، قرآنی غلاف چڑھا کر، اسے ''نظامِ ربوبیت'' کا نام دیتے ہیں، اس کا ''مرکز ملت'' تو خود ''خدا اور رسول'' بن جاتا ہے۔ اب خود سوچ لیجیے، کہ اپنے فیصلے خدا اور رسول کی طرف منسوب کرنا بڑا جرم ہے۔ یا خود خدا اور رسول بن کر، اپنے فیصلے نافذ کرنا؟

۴۔ نظامِ ربوبیت کے اخلاقی نتائج

''مفکر قرآن'' صاحب، بڑے زور شور سے یہ اعلان فرمایا کرتے تھے:

''جس طرح قرآن، اپنے نظام کو فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا۔ اُسی طرح کمیونزم بھی، اپنے معاشی نظام کو، اپنے فلسفۂ زندگی سے جدا نہیں کرتی۔

کمیونسٹ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام کو، ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔''[1]

لیکن اس حقیقت افروز اعلان کے بعد بھی، وہ چاہتے یہ تھے کہ چین میں جس اشتراکیت کا تجربہ کیا جارہا ہے، اُس کے معاشی نظام کو، اُس کے فلسفۂ حیات سے جدا کرکے، ''قرآنی بنیاد'' پر کھڑا کردیں۔

''چین کا معاشی نظام بالشوزم ہے۔ اگر ہم اس نظام کو، وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیاد پر استوار کرلیں تو یہ نظام، ہمارے دینی تقاضا کو پورا کردیتا ہے۔''[2]

چنانچہ ہمارے ''مفکر قرآن'' نے روسی یا چینی نظام معیشت کو، بزعم خویش، ''وحی کی مستقل اقدار'' کی بنیادوں پر قائم کرکے، اُسے ''نظامِ ربوبیت'' کے نام سے پیش کردیا، تاکہ اس سے ہمارا ''دینی تقاضا'' پورا ہوجائے۔ اب اگر غیروں کا یہ اقتصادی نظام، اپنے اصل فلسفۂ حیات سے واقعی منفک ہوکر، بزعم پرویز، فی الحقیقت قرآنی بنیادوں پر قائم ہوچکا ہوتا تو اس کے نتیجہ میں اشتراکی فلسفۂ حیات سے مناسبت رکھنے والا اخلاقی نظام پیدا نہ ہوتا، بلکہ قرآنی نظامِ اخلاق جنم لیتا۔ لیکن:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہم دیکھتے ہیں کہ ''قرآنی بنیادوں'' پر استوار، اس نظام معیشت کو، جن لوگوں نے قبول کیا ہے، اور اس پر وہ ایمان واعتماد اور یقین وثوق رکھتے ہیں، اُن میں، نہ صرف یہ کہ اسلامی اخلاقیات کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اشتراکی اخلاقیات میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

''قرآنی بستی'' اور ''نظامِ ربوبیت'' کے شیدائیوں کا کردار:

اب رہا ''نظامِ ربوبیت'' پر ایمان لانے والے افراد کا سیرت وکردار کے لحاظ سے ناقابل اعتماد ہونا، تو اس کا واضح ثبوت ''مفکر قرآن'' صاحب کے مقصد ومشن میں، اُن کا ایسا مزاحم ہونا

---

[1] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۶۶ [2] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۵ء، ص ۷۵

ہے جس سے قرآن کا مقصودِ اصلی ہی فوت ہو جاتا ہے۔ تفصیل، اس اجمال کی یہ ہے۔

جناب ''مفکرِ قرآن'' صاحب چاہتے یہ تھے کہ پاکستان میں کسی مقام پر، ایک ''قرآنی بستی'' بسائی جائے، جس میں قرآنی خطوط پر متشکل معاشرہ، اور ''نظامِ ربوبیت'' کا جیتا جاگتا نقشہ، عامۃ الناس کی نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں، انہوں نے فرمایا:

> ''میرے پیشِ نظر، یہ بھی ہے کہ ایک ایسی بستی بسائی جائے جس میں قرآنی نہج پر زندگی بسر کرنے کے متمنی حضرات آ کر بسیں۔ یہ بستی خود کفیل اور خود مکتفی ہو، اور اس نظام کی جھلک پیدا کرے جو قرآن، تمام نوعِ انسانی کے لیے تجویز کرتا ہے۔'' [1]

چنانچہ اس مقصدِ جلیل کی خاطر، ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اپنے معتقدین کی تعمیرِ سیرت اور کردار سازی کے لیے سالہا سال تک، انہیں، تعلیم و تربیت دیتے رہے، اور انہیں یہ ذہن نشین کراتے رہے کہ......... تم اپنی ذات میں پختگی پانے کے لیے، اور اپنی نگاہوں میں وسعت اور اپنے ظرف میں کشادگی حاصل کرنے کے لیے، اپنی محنتوں کا عزیز ترین ماحصل ''ربوبیت عامہ'' کے لیے کھلا چھوڑ دو۔ مفادِ خویش پر، مفادِ انسانیت کو ترجیح دو۔ عقل خود بین کو نظر انداز کر کے، اُس ''نظامِ ربوبیت'' کو قائم کرو، جو جملہ انسانیت کی نشوونما کا ضامن ہے، اور دنیا (قریبی مفاد) کی بجائے، آخرت (مستقبل) کی خوشگواریوں پر نگاہ رکھو۔ یاد رکھو، تمہاری ذات کی نشوونما، لینے سے نہیں، بلکہ دینے سے ہوگی، جو شخص، جتنا اپنی کمائی میں سے، دوسروں کے لیے ''کھلا رکھے'' گا، اس کی ذات کی اُتنی ہی زیادہ نشوونما ہوگی.........

لیکن الفاظ کا جادو جگانے والی ان دلپذیر تقاریر و مواعظ کے باوجود، اور برسہا برس کی تعلیم و تربیت کے باوجود، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ خواب، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ایسی بستی بسائی نہ جا سکی۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ''نظامِ ربوبیت'' کا گن گانے والے، گفتار کے غازیوں کا معیارِ سیرت و کردار، ایسا پست تھا کہ ''مفکرِ قرآن'' کی یہ آرزو، جامۂ عمل نہ پہن سکی۔ چنانچہ

---

[1] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۴

انہوں نے اس تجویز کے ناقابلِ عمل ہونے کی وجہ، بایں الفاظ بیان کی:

''جب آپ اس قسم کے انفرادی نظام کی آواز بلند کریں گے۔ اس پر لبیک کہنے والوں میں (زیادہ نہیں، تو کم از کم) نوے فیصد (Have Nots) یعنی وہ لوگ ہوں گے، جن کی آمدنی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کفایت نہیں کرتی، اور شاید دس فیصد لوگ ایسے ہوں جو اپنی ضروریات پوری کر سکیں یا جن کے پاس ضروریات سے کچھ زائد ہو۔ میں احباب کو مایوس نہیں کرنا چاہتا، لیکن میرا خیال ہے کہ میرا یہ اندازہ بھی کچھ خوش فہمی پر مبنی ہے۔ جن کے پاس ضرورت سے زائد دولت ہو، وہ بہت کم ادھر آئیں گے۔'' [1]

''قرآنی بستی'' کے نہ بسائے جانے کی اصل وجہ تو یہی تھی کہ اس ''نظامِ ربوبیت'' پر ایمان لانے والوں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے، اس بات کی اُمید نہیں تھی کہ صاحب ثروت اور خوش حال افراد، آگے بڑھیں گے، اور نتیجتاً قرآنی نہج حیات کی جھلک ''پیش کرنے کی آرزو، حقیقت کا روپ دھار سکے گی، لیکن مسندِ طلوع اسلام پر، براجمان ''بادشاہ'' (جنہوں نے شاید ایرانی بادشاہ پرویز ہی کے تتبع میں، اپنا تخلّص پرویز کیا تھا) نے ''قرآنی بستی'' کے نہ بسائے جانے کی جو نگاہ فریب دلیل پیش کی ہے، وہ عصر حاضر کی مغربی سیاست کے امام، اٹلی کے ''دانشور'' مکیاولی کی اس سنت پر چلتے ہوئے پیش کی ہے کہ:

''بادشاہ کے لیے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے .... عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ، اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے، یا جن وجوہ کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا تھا، وہ باقی نہیں رہیں تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لیے، نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔'' [2]

چنانچہ ہمارے ''بادشاہ'' نے بھی، ''قرآنی بستی'' کے نہ بسانے کی، جو نظر فریب دلیل

---

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۵ء، ص ۱۶ [2] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، ص ۲۴

پیش کی، وہ یہ تھی کہ:

''جب ادارہ ابھی کراچی میں تھا تو ایک اسکیم سامنے لائی گئی تھی کہ ہمیں اپنی ایک الگ بستی بسانی چاہیے جس میں نظامِ ربوبیت کو عملاً متشکل کیا جائے، اس زمانے میں، اس اسکیم پر کافی غور وخوض کے بعد، ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسکیم نہ صرف ناقابلِ عمل ہے، بلکہ ایسا کوئی اقدام جس سے ہم، باقی مسلمانوں سے الگ، ایک گروہ متصور ہوں، قرآن کی رو سے شرک ہوگا۔'' [1]

یہاں، ہمارے ''قرآنی گوئبلز'' کا یہ جھوٹ واضح ہو رہا ہے کہ ''قرآنی بستی'' کی تجویز، ''نظامِ ربوبیت'' کے شیدائیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ حالانکہ یہ خود، پرویز صاحب کے مقاصدِ حیات میں سے ایک مقصد تھا، جس کو بعد میں ناقابل عمل پاتے ہوئے، اور اصل وجہ کو چھپاتے ہوئے، یہ ''نگاہ فریب دلیل'' پیش کردی کہ ہمارا یہ عمل، موہم شرک ہوگا۔

بہر حال، بات یہ ہو رہی تھی کہ ''نظامِ ربوبیت'' پر ایمان لانے والے شیدائیوں کی پستیِ کردار کے باعث ''قرآنی بستی'' کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

''نظامِ ربوبیت'' کے نام لیواؤں کو تو چھوڑیے، صرف ''مفکر قرآن'' ہی کے اخلاق و کردار پر نگاہ ڈالیے، جنھوں نے اپنا ''دینی تقاضا'' پورا کرنے کے لیے تلبیس حق و باطل کا یہ نمونہ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی حق و باطل کی پیوندکاری کی یہ کوشش سراسر ناکام قرار پائی ہے۔ آخر پرویز صاحب سے بڑھ کر، اس ''نظام ربوبیت'' پر مضبوط و مستحکم ایمان، کس کا ہو سکتا ہے۔ ایسی ٹھوس ایمان کی حامل بلکہ اس نظام کی ''خالق'' شخصیت میں بھی، اگر قرآنی فضائل اخلاق کی بجائے، اشتراکی رذائل و معائب ہی ظہور پذیر ہوں، تو دوسری کس ہستی میں اسلامی اخلاقیات کی تلاش کی جائے؟

اب سوال یہ ہے کہ اشتراکی فلسفۂ حیات کے بیج سے کس قسم کا اخلاقی کردار پیدا ہوتا ہے؟ اس کا جواب کسی اشتراکی تصنیف سے پیش کرنے کی بجائے، طلوعِ اسلام ہی کے ایک

---

[1] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، ص ۶۳

مقالہ سے مقتبس کرنا مناسب ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جس مقالے میں سے یہ اقتباس پیش کیا جارہا ہے، وہ ''مفکرِ قرآن'' ہی کا لکھا ہوا ہے، لیکن اسے انھوں نے اپنے اصل نام کے ساتھ شائع کرنے کی بجائے، جھوٹ موٹ کے ''ایک مسلمان'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ لیجیے! اقتباس پیش کرنے سے پہلے ہی ''ایک مسلمان'' کا اخلاقی رویہ الم نشرح ہورہا ہے:

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

۱۔ ''ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں، اخلاق کا نظریہ، ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے، عین اخلاق ہے۔ اشتراکیین کا اخلاق و شریعت تو صرف اسی قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت وسطوت کا استحکام و استبقاء کس صورت سے ہوسکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر، جرائم کا ارتکاب دروغ بانی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔ نہیں، بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افتراء ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔'' [۱]

۲۔ ''جو کچھ جماعتی جدوجہد کی تائید میں ہو، عین حلال و درست۔ اور جو کچھ اس کے راستہ میں مزاحمت کرتا ہو، حرام و ناجائز۔'' [۲]

یہ حقیقت، آفتابِ نصف النہار کی مانند واضح ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کا اخلاقی سراپا، اسلامی اخلاق کی بجائے، اشتراکی اخلاقیات ہی کا ساختہ پرداختہ تھا۔ دروغ بانی،

---

[۱] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۴۶ + تحریکِ پاکستان اور پرویز، ص ۲۹۲

[۲] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۴۷ + تحریکِ پاکستان اور پرویز، ص ۲۹۳

کذب بیانی، اور زُورزنی، اُن کے نزدیک، عین حق و صداقت تھے، اسی بناء پر وہ اپنے نظریاتی مخالفین کے خلاف، ہمیشہ افتراء پردازی، بہتان تراشی اور تہمت طرازی کا شیوہ اپنائے ہوئے تھے۔ کذب و زُور اور دروغ وجھوٹ، ان کی رگ رگ میں رچ بس چکا تھا۔ کتمانِ حقائق، ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ واقعات کو مسخ کر کے، لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا، ان کا دائمی مشغلہ بن چکا تھا۔ خیانت و بددیانتی کے جرائم، اُن کے ذراتِ خون تک میں حلول کر چکے تھے۔ مغالطہ آرائی کے ذریعہ دھوکہ دہی اور دھوکہ دہی کے ذریعہ مغالطہ آرائی، ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں اُتر چکی تھی۔ ہوسِ شہرت کا بخار اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ مخالفین کے ہاتھوں انجام پانے والے کارناموں کو بھی، وہ اپنی ذات سے منسوب کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

یہ جو کچھ کہا جارہا ہے کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے، بلکہ ٹھوس حقائق ہیں، اور ان حقائق میں سے ایک ایک حقیقت کا ثبوت ...... ''جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں'' ...... نامی میری کتاب میں ٹھوس دلائل، قوی براہین، ناقابل تردید شواہد اور مضبوط بینات کے ساتھ، پیش کیا گیا ہے۔ کتابِ مذکور میں موجود حقائق و واقعات کی تردید، آج تک وابستگانِ طلوعِ اسلام نہیں کر سکے، اور نہ ہی ان شاء اللہ العزیز، کبھی آئندہ کر سکیں گے وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا.

نہ خنجر اُٹھے گا، نہ تلوار اُن سے یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

۵۔ ایک آیت کے غلط مفہوم کی بناء پر سارے قرآن کو اُلٹا دینا

المعجم المفهرس لالفاظ القرآن پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے، تو اسلامی مالیاتی نظام کے مختلف گوشوں پر مشتمل آیات کی تعداد مندرجہ ذیل ہوگی۔

ا۔ وہ آیات، جن میں زر دولت کی نسبت واضافت، افرادِ معاشرہ کی طرف کی گئی ہے۔

(الف) مالہ اور مالیہ وغیرہ الفاظ کے ساتھ مذکور آیات = ۷

(ب) اَمْوَالكُمْ جیسے الفاظ پر مشتمل آیات = ۱۴

(ج) اموالنا جیسے الفاظ والی آیات =۲

(د) اموالھم جیسے الفاظ پر مشتمل آیات =۳۱

(ر) اموال الناس اور اموال الیتامیٰ جیسے الفاظ والی آیات =۵

۲۔ زکوٰۃ کے حوالہ سے قرآن میں وارد ہونے والی آیات کی تفصیل

(الف) حکم ایتاء زکوٰۃ پر مشتمل آیات، جن میں براہِ راست حکم مذکور ہے =۵

(ب) بالواسطہ ایتاءِ زکوٰۃ کے حکم پر مشتمل آیات =۴

(ج) زکوٰۃ دینے والوں کی تعریف و تحسین پر مشتمل آیات =۱۴

۳۔ حکمِ قرض واقراض اور اس پر عامل افراد کی تحسین پر مشتمل آیات =۱۰

۴۔ انفاقِ اموال کے سلسلہ کی آیات

(الف) حکمِ انفاق پر مشتمل آیات =۹

(ب) لفظ اَنۡفَقُوا (ماضی) کے ساتھ، تحسینِ منفقین والی آیات =۶

(ج) لفظ یُنۡفِقُوۡنَ (مضارع) کے ساتھ، تحسین منفقین والی آیات =۱۲

(د) انفاق کے حوالہ سے متفرق، آیات کی تعداد =۱۵

۵۔ بالواسطہ انفاقِ مال پر دلالت کرنے والی چند دیگر آیات

(الف) بخل سے حکمِ اجتناب اور بخل کی مذمت پر مشتمل آیات =۱۱

(ب) اسراف سے پرہیز وممانعت پر مشتمل آیات =۴

۶۔ (الف) حق مہر اور اجرتِ رضاعت پر مشتمل آیات =۷

(ب) مطلقہ ممسوسہ اور مطلقہ غیر ممسوسہ خواتین کے حقِ مہر سے وابستہ آیات =۲

۷۔ مالی کفاروں (بصوت تحریر رقبہ یا اطعام مساکین) پر مشتمل آیات

(الف) غلط قسموں کا کفارہ =۱

(ب) حالت احرام یا حدودِ حرم میں شکار کرنے کا کفارہ =۱

(ج) نجوائے رسولؐ سے قبل حکم ادائیگی صدقہ پر مشتمل آیت =۱

(د) ظہار کا کفارہ =۲

۸۔ادائیگیٔ دیت کے احکام پر مشتمل آیات کی تفصیل

(الف) قتل عمد کی دیت والی آیت =۱

(ب) قتل خطاء میں دیت پر دالہ آیات =۲

۹۔آیات بسلسلہ تحریکِ آزادیٔ غلاماں

(الف) مصارفِ زکوٰۃ میں بطور مصرف، آیت =۱

(ب) عام ترغیب پر مشتمل آیت =۱

(ج) مکاتبت کے حکم پر مشتمل آیت =۱

۱۰۔قانونِ ترکہ ومیراث پر مشتمل آیات =۳

کل تعداد =۱۷۲

یہ تعداد، اُچٹتی سی نگاہ کے ساتھ، سرسری طور پر پیش کی گئی ہے، ورنہ اگر بنگاہِ تعمق جائزہ لیا جائے، تو اس تعداد میں اور بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔ یہ جملہ آیات، مال ودولت کی شخصی ملکیت کا واضح ثبوت ہیں۔ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، کارل مارکس کی مصنوعہ اشتراکیت کے عشق میں مبتلا ہوجانے کے بعد، ان جملہ آیات کو نظر انداز کرتے ہوئے، صرف ایک ہی آیت کو اپنی نگاہوں کا مرکزِ توجہ اور پنی جملہ فکری، ذہنی، قلبی اور قلمی سرگرمیوں کا نقطۂ ماسکہ بنائے ہوئے تھے۔ اور وہ تھی، سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹، جس کا مفہوم، وہ یوں بیان کیا کرتے تھے۔

''سورۃ البقرہ میں ہے وَيَسْئَلُونَكَ مَا ذَا يُنفِقُونَ (۲/۲۱۹)'' اے رسول! تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لیے دیں؟ قُلِ الْعَفْوَ کہہ دو، کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے، وہ سب کا سب۔ اس طرح قرآنِ کریم نے فاضلہ دولت (Surplus Money) کا وجود ختم کردیا۔''[1]

---

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، ص ۴۶

حالانکہ، اشتراکیت کا بپتسمہ پانے سے قبل، اسی آیت کا مفہوم، پرویز صاحب، بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے۔

''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جتنا آسان ہو۔''[۱]

اب عجلِ اشتراکیت کی محبت، جب ''مفکر قرآن'' کے قلب و دماغ میں راسخ ہوگئی، سوشلزم کا عشق، ان کے حواس و مشاعر پر چھا گیا۔ کمیونزم کی الفت، ذراتِ خون تک میں رچ بس گئی، الشیوعیہ کی عقیدت، ان کی رگ رگ میں سرایت کرگئی، تو آیت ۲/۲۱۹ کا مفہوم ایسا بدلا کہ ایک طرف، تو یہ جدید مفہوم، ان کے دورِ سابق کے مفہوم کے ساتھ متعارض و متصادم ہوگیا، اور دوسری طرف، وہ سینکڑوں آیات (جن میں انفاق فی سبیل اللہ، لین دین، صدقہ و خیرات، قرض و اقراض اور تقسیم ترکہ و میراث وغیرہ کے احکام موجود ہیں) کے بارے میں، انھیں یہ نیا تصور اختراع کرنا پڑا کہ

''وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات وغیرہ کے متعلق احکام، اُس عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں سے گزر کر معاشرہ، انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔''[۲]

منسوخ احکام یا عبوری دور کے احکام؟

یہاں ''مفکر قرآن'' صاحب کی یہ ذہنی عیاری اور دماغی مکاری بھی ملاحظہ فرمائیے کہ جس چیز کو، وہ ''عبوری دور کے احکام'' قرار دیتے ہیں، بالکل وہی چیز، علماء کرام کے ہاں ''منسوخ احکام'' کہلاتی ہے۔ لیکن لفظی نزاع کی اس آڑ میں، ''مفکر قرآن'' صاحب، ناسخ و منسوخ کے مسئلہ میں، عمر بھر علماء کے خلاف لٹھ لیے پھرتے رہے، اور دیگر مسائل کی طرح، اس مسئلہ میں بھی، موقع بموقع، علماء کے خلاف، دشنام طرازی اور زبان درازی کے ذریعہ، اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرتے رہے، محض اس لیے، اور صرف اس وجہ سے، کہ جس حقیقت کو وہ خود ''عبوری دور کے احکام'' سے مانتے تھے، اسے علماءِ اُمتِ مسلمہ ''ناسخ و

---

[۱] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۶۱ + تحریک پاکستان اور پرویز، ص ۳۰۷ [۲] نظامِ ربوبیت، ص ۲۷

منسوخ احکام'' کے زیرِ عنوان، کیوں تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ خود ان کے بدل جانے پر، علماء کرام کو بھی، حتیٰ کہ، زمین و آسمان کو بھی بدل جانا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''عبوری دور کے یہ احکام'' قرآن میں، قیامت تک کے لیے کیوں محفوظ رکھے گئے؟

''مفکرِ قرآن'' صاحب فرماتے ہیں:

''اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں ایسے ممالک بھی ہوں گے، جہاں مسلمان، اقلیت میں غیر مسلم (یا غیر قرآنی) حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ وہاں، ان کی زندگی، انفرادی مسلمانوں کی سی ہوگی۔ اس لیے ان کے لیے، انہی احکامِ قرآنی پر عمل پیرا ہونا ممکن ہوگا، جنھیں ہم نے ''عبوری دور'' کے احکام کہہ کر پکارا ہے۔'' [1]

منسوخ احکام کی یہی حقیقت اور پھر ان احکام کو تا قیامت، قرآن میں محفوظ رکھنے کی یہی حکمت و مصلحت، خود علماءِ کرام کے ہاں بھی قابلِ تسلیم ہے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (جن کی جا و بے جا مخالفت، پرویز صاحب کا وظیفۂ حیات تھی) اس ضمن میں، فرماتے ہیں

''عام طور پر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جن آیات کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، ان کی قرآن میں اب کیا ضرورت ہے؟ کیوں نہ ان کی تلاوت بھی منسوخ ہوگئی؟ اس کو رفع کرنے کے لیے، میں نے، قرآن میں احکام کے باقی رہنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اگر معاشرے میں کبھی ہم کو پھر ان حالات سے سابقہ پیش آئے، جن میں یہ احکام دیئے گئے تھے، تو ہم ان پر عمل کر سکتے ہیں، مثلاً کسی ملک میں مسلمان، اُسی دور کے حالات سے دوچار ہوں جو مکی زندگی میں، آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کو پیش آئے تھے، تو مکی دور کی تعلیم صبر و تحمل پر عمل کیا جائے گا، نہ کہ مدنی دور کی تعلیم جہاد و قتال پر۔ حالانکہ بیشتر علماء نے احکام قتال سے مکی دور کی ان آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اس طرح اس حالت میں مسلمان، ان بہت سے

---

[1] نظامِ ربوبیت، ص ۲۷

احکام وقوانین کی پابندی سے آزاد رکھے جائیں گے، جو مدنی دور میں نازل ہوئے، اور جن پر عملدرآمد، اسلامی حکومت کی موجودگی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔'' [۱]

ان اقتباسات سے کیا واضح ہوا؟ یہی کہ علماءِ امت ہوں یا ''مفکر قرآن''۔ ہر گروہ کے نزدیک، قرآنِ مجید میں ایسی آیات موجود ہیں، جن پر عمل، متروک ہے۔ پھر ان آیات کو قرآن میں کیوں برقرار رکھا گیا؟ ان کی تلاوت کو بھی، ان کے عمل کی طرح، کیوں نہ ساقط کردیا گیا؟ اس سوال کا جواب بھی، دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ لیکن محض، اس بناء پر کہ خود ''مفکر قرآن'' نے جس حقیقت کو، ''عبوری دور کی آیات'' کے نام سے قبول کیا ہے، اسی حقیقت کو، علماء نے ''منسوخ آیات'' کے نام سے کیوں تسلیم کیا، ان پر دریدہ دہنی کرتے ہوئے ایسے اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے رہے، جن کی زد میں، وہ خود بھی آئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مثلاً وہ ایک اعتراض، از روئے قرآن، یہ کیا کرتے تھے اور طنزاً یہ کہا کرتے تھے کہ منسوخ آیات کو تسلیم کرلینے سے، بڑے غلط قسم کے تصورات، خدا، قرآن کریم اور رسول اللہ کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔

''اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا، قرآن کریم اور رسول اللہؐ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور، اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتادیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا، اس لیے وہ قرآنِ کریم کے اُس حکم کو منسوخ کرکے، اس کی جگہ دوسرا حکم دیتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات، ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہوچکا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہورہی ہے۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کون سی آیات منسوخ ہے اور کون سی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کون سی آیت منسوخ ہے، اور کون سی اس کی ناسخ۔''

---

[۱] رسائل ومسائل، ج۳، ص۸۴ تا ص۸۵

اور رسولؐ اللہ کے متعلق، یہ تصور، کہ حضوؐر، خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے،☆ **یا للعجب** [۱]

معلوم نہیں کہ جناب ''مفکرِ قرآن'' صاحب ...... یا طلوعِ اسلام سے وابستہ، ان کی معنوی ذریت ...... کے پاس، اُس وقت کیا جواب ہوگا، جب کہ علماءِ کرام، پلٹ کر، اُن سے ''عبوری دور کے نظریۂ پرویز'' پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے، یہ فرمائیں کہ خود، ان کے اس نظریہ کی بنیاد پر بھی، ایسے ہی تصورات ابھرتے ہیں، مثلاً یہ کہ قرآنِ کریم میں بیشمار ایسی آیات موجود ہیں، جن کا حکم، متروک ہو چکا ہے، اور ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے، اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کون سی آیات، عبوری دور سے متعلق ہونے کی بناء پر متروک العمل ہیں۔ اور کون سی آیات، انتہائی منزل سے وابستہ ہونے کی بناء پر، قابلِ عمل اور لائقِ نفاذ ہیں۔ اسے صدیوں بعد، پیدا ہونے والے ''مفکرِ قرآن'' پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود فیصلہ فرمائیں کہ کون سی آیات ''عبوری دور'' کے لیے ہیں، اور کون سی تکمیلی اور انتہائی دور کے لیے۔

اسلام کا معکوس تصور:

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے، قرآن کریم کی صرف ایک آیت (۲/۲۱۹) کا ایک ایسا غلط مفہوم گھڑا، جس نے معاشی اور معاشرتی نظام کے حوالے سے، سارے قرآن کو الٹا کر رکھ دیا۔ اور اب یہ ''الٹا قرآن''، عہدِ رسالتمآب اور خلافت راشدہ میں نافذ اسلام کا یہ تصور پیش کرتا ہے کہ:

۱۔ ''اسلام، خود ایک سوشلسٹ نظام تھا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔'' [۲]

الغرض، اس ایک آیت (۲/۲۱۹) کے وضعی مفہوم نے، احیاءِ اشتراکیت کے لیے، ''مفکرِ قرآن'' صاحب کو سند مہیا کر دی، اور وہ تمام آیات، جن میں کفار و مشرکین کا ہستیِ باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہوئے، طلب گارِ آخرت ہونے کی بجائے، سگانِ دنیا بن کر،

☆ حضوؐر اکرم کے بھول جانے سے متعلق، اعتراض کا تفصیلی جواب، میری تصنیف ''تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ'' میں موجود ہے۔

[۱] لغات القرآن، ص ۱۶۰۸

[۲] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۸

سونا چاندی اور مال و دولت کو جمع کرنے کی مذمت کی گئی ہے، انھیں، ''مفکر قرآن'' نے مخلص اہل ایمان پر چسپاں کرنا شروع کر دیا، تاکہ اشتراکیت کی راہ ہموار کی جا سکے، اور قرآنِ مجید کے وہ احکام، جو صدقہ و خیرات، قرض و اقراض، ترکہ و میراث وغیرہ سے متعلق ہیں، انھیں ''مفکر قرآن'' نے ''مزاج شناسِ خدا'' ہونے کی بنیاد پر، یا اپنے ہم نام متنبیٔ قادیان کی طرح، خدا سے براہِ راست علم پا کر، ''عبوری دور کے احکام'' قرار دے دیا، اور قرآنِ مجید کی وہ آیات، جو اپنے اندر مستقل اور دائمی احکام لیے ہوئے تھیں، انھیں ''عبوری دور کے احکام'' قرار دے کر، ''تکمیلی دور'' میں ساقط العمل بنا دیا۔ پھر اشتراکیت سے ''شکمی مساوات'' کا تصور لے کر، اور اسے ایک قطعی معیار قرار دے کر، قرآنِ کریم کی بیان کردہ، تفاضل فی الرزق کی اُس حقیقت کو پس پشت پھینک دیا، جسے قرآنِ کریم نے وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ جیسی آیات میں پیش کیا ہے۔ اور پھر ان جیسی آیات کا، انھیں، تحریف شدہ مفہوم یہ بیان کرنا پڑا کہ ان سے مراد ''تفاوت فی المال'' اور ''تفاضل فی الرزق'' نہیں، بلکہ ''رزق کمانے کی صلاحیتوں میں فرق و تفاضل'' ہے۔ اور پھر اشتراکیت سے ''مساوی تقسیمِ دولت'' کا تخیل سے لے کر، اسے ایک حتمی پیمانہ قرار دیتے ہوئے، قرآن کی بیان کردہ ''تفاضل فی الرزق'' کی حقیقت کو ''دولت کی غلط تقسیم'' کا نام دیا گیا، جس کے نتیجہ میں، وہ صحابہ کرامؓ، جو مال و دولت کے اعتبار سے خوشحال اور صاحب ثروت تھے، وہ ''سرمایہ دار طبقہ'' قرار پا گئے۔

یہ سب کچھ، صرف ایک آیت (۲/۲۱۹) میں ''مفکر قرآن'' صاحب کے خود ساختہ مفہوم کو گھسیڑ ڈالنے کے باعث ہوا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا، اور ہوا بھی، کہ یہ آیت، اُن صدہا آیات سے متصادم و متعارض ہو گئی، جو اسلام کے مالیاتی نظام کے متعلق پہلے مذکور ہو چکی ہیں۔ پھر اس تعارض و تناقض کو دور کرنے کے لیے، انھیں، قدم قدم پر، ''پرویزی حیلوں'' سے کام لینا پڑا۔ حالانکہ کسی آیت کا مفہوم پیش کرتے ہوئے، یہ دیکھنا بھی لازم ہے کہ وہ مفہوم، دوسری قرآنی آیات کے خلاف تو نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں، خود

پرویز صاحب ہی کی تصنیف میں سے یہ عبارت پیش کرنا ضروری ہے۔

''ایک اہم اصول، قرآن فہمی کا یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (۴/۸۲) ...... ''اور اگر یہ قرآن، اللہ کے سواء، کسی غیر کی طرف سے ہوتا، تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔'' اس لیے کسی آیت کی ایسی تفسیر نہیں کی جاسکتی، جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو۔''[۱]

لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، شہنشاہِ تضادات تھے، جملہ پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، اگر اُن کے صرف تفسیر و ترجمہ ہی کے پہلو سے، ان کے تضادات کو دیکھا جائے، تو یہ بحر ذخّار بھی اس قدر عریض و عمیق ہے کہ:

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

اگر مصروفیات زندگی نے فرصت دی، تو ان شاء اللہ ...... ''جناب پرویز صاحب کا تضاداتی قرآن'' ...... کے نام سے ایک کتاب ضرور قلمبند کروں گا۔ لیکن فی الحال، تفسیر قرآن کے حوالہ سے، اُن کے تضاد کی صرف ایک نقد مثال نذرِ قارئین ہے۔

''مفکر قرآن'' صاحب کے نزدیک، ارزوئے قرآن، مال و دولت کی نجی ملکیت، ناجائز ہے۔ اس پر ان کے سینکڑوں اقتباسات میں سے صرف ایک عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''اسلام کے معاشی نظام کی عمارت، معاہدۂ بیع و شراء پر استوار ہوتی ہے جس سے نجی ملکیت کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔''[۲]

لیکن مال و دولت کی جس ''نجی ملکیت'' کی نفی، بیان کی جاتی ہے، اُسی کا اثبات، ''مفکر قرآن'' صاحب دیگر آیات سے بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

ا۔ ''عورتیں اپنا حق ملکیت الگ رکھتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ہر چیز کا مالک مرد ہوتا

---

[۱] معارف القرآن، ج ۱، ص ۴۰ تا ۴۱

[۲] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۳۸

ہے، عورت مالک ہی نہیں ہوسکتی۔'' [۱]

۲۔ ''ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں، اس تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے، جس کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حقوقِ ملکیت صرف مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے .... عورت اپنے مال و جائیداد کی آپ مالک ہوتی ہے۔ اس طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا، صرف مرد کا کام ہے، عورت ایسا نہیں کرسکتی۔ مرد اور عورت دونوں اکتسابِ رزق کرسکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے، وہ اس کا حصہ ہے، اور جو کچھ عورت کمائے، وہ اس کا۔'' [۲]

۳۔ ''مردوں اور عورتوں کے جداگانہ حقوقِ ملکیت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں، ان سب کا حصہ ہو، صرف مردوں ہی کا نہ ہو۔'' [۳]

اب غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم سے ''نجی ملکیت'' کی نفی اور اثبات کے دونوں متضاد تصورات، ''مفکر قرآن'' نے پیش کیے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خواہ پرویز صاحب یا علماءِ کرام۔ بہرحال، قرآن میں موجود بظاہر تعارض کے دونوں فریق قائل ہیں، ایسی متعارض و متناقض آیات کی توجیہ، ایک فریق ''ناسخ و منسوخ'' کے نظریہ کے تحت کرتا ہے (بشرطیکہ اس مسئلہ میں وہ پرویز صاحب سے متفق ہوں) اور دوسرا فریق، ''عبوری دور کے احکام'' کے نظریہ کے تحت۔

اس صورتِ حال میں کیا یہ بات قابل تعجب نہیں کہ ایک ہی حقیقت کو، اگر علماءِ کرام، ناسخ و منسوخ کے حوالہ سے بیان فرمائیں، تو پرویز صاحب اسے مضحکہ خیز قرار دیں، لیکن اگر اسی حقیقت کو، وہ خود، ''عبوری دور کے احکام'' کے حوالہ سے بیان کریں، تو وہ ''مفکر قرآن'' قرار پائیں، جب کہ دونوں کے الفاظ کے اختلاف کے باوجود، وہ حقیقت ایک ہی ہے، جس کی تعبیر کے لیے، مختلف الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے۔

---

[۱] مفہوم القرآن، ص ۱۷۷
[۲] مفہوم القرآن، ص ۱۸۷
[۳] مفہوم القرآن، ص ۱۸۸

''عجمی سازش''......وہ یا یہ؟

''مفکر قرآن'' صاحب، جس ''عجمی سازش'' کا افسانہ، بڑی قلمکاریوں کے ساتھ، پیش کیا کرتے تھے، وہ، تو صدیوں پہلے کی بات ہے۔ لیکن پرویز صاحب، صدہا سال پہلے کے اس فسانے کو، بڑے اعادہ وتکرار کے ساتھ، مختلف اسالیب وانداز میں صرف اس لیے دہرایا کرتے تھے کہ (۱) غیر اسلامی افکار ونظریات کو، مغرب کی ذہنی غلامی کے زیر اثر، اسلامی تعلیمات میں داخل کرنے کی جس سازش کے، وہ خود، سرخیل تھے، صدیون پہلے کی افسانوی سازش کا شور وشغب اٹھا کر، اُسے لوگوں کی نگاہ سے مخفی رکھا جائے، اور عوام الناس کے قلوب واذہان اور ان کے حواس ومشاعر پر'' عجمی سازش'' کا یہ بلند بانگ پراپیگنڈہ، اس قدر چھا جائے کہ لوگوں کی توجہ، خود'' مفکر قرآن'' کی اپنی سازش کی طرف، مبذول ہی نہ ہو سکے۔ عیار، مکار اور چالاک لوگوں کا ہمیشہ سے یہ رویہ رہا ہے کہ وہ اپنی سیہ کاریوں کو چھپائے رکھنے کے لیے، دوسروں پر کیچڑ اچھالا کرتے ہیں۔ اور ان پر ایسی فرضی سازشوں کا الزام لگایا کرتے ہیں جن کے پس پردہ، خود ان کی واقعی، اصلی اور حقیقی سازشیں چھپ جائیں۔ اس نفسیاتی ٹیکنیک کو خود طلوعِ اسلام نے بھی ایک مقام پر بیان کیا ہے۔ اس لیے بطورِ آئینہ، طلوعِ اسلام ہی کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے تا کہ اگر پرویز صاحب نہیں، تو ان کے اندھے مقلدین ہی اس میں عکس ملاحظہ فرمالیں، اور وہ خود بھی:

> ''اپنی روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس، دوسروں کی تنقیص میں اس لیے مصروف ہے تا کہ اس کی اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے، اور اسے چھپانے کے لیے، اُس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا کر رکھا ہو، فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔'' [1]

۲...... ''عجمی سازش'' کے پروپیگنڈہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی جھوٹی اور بے اصل بات کو، امر واقعی باور کروانے کے لے، وہ، گوئبلز کی ٹیکنیک، اختیار کرنے پر مجبور تھے، جو یہ

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۳

کہا کرتا تھا کہ؛

''جھوٹ کو اگر سو دفعہ دہرایا جائے تو وہ سچ بن جاتا ہے''..........دنیا، اس کے اس مقولے پر ہنستی رہی، لیکن دور رس نگاہوں نے، اسے قیمتی متاع سمجھ کر، احتیاط سے رکھ لیا، تاکہ بوقت ضرورت، اس سے کام لیا جاسکے۔ [1]

اب ظاہر ہے کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' سے بڑھ کر، ''دور رس نگاہ'' کس کی ہوگی۔ انھوں نے اسے قیمتی متاع سمجھ کر، احتیاط سے رکھ لیا، اور بوقت ضرورت، اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے، ''عجمی سازش'' کے فسانہ کو بار بار دہرایا۔

محدثین کرام کی طرف، ہمارے ''قرآنی گوئبلز'' نے، جس سازش کو، زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے، منسوب کیا ہے، اُس دور سے تعلق رکھتی ہے، جب نہ ہم تھے اور نہ ہی پرویز صاحب موجود تھے۔ لیکن ایک یہوی نژاد ذہن کی گھڑی ہوئی اشتراکیت کے جس بس بھرے پودے کو، انھوں نے، سرزمین اسلام میں لگانے کی ''عربی سازش'' کی ہے، وہ تو ہم سب کے سامنے کی بات ہے۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے، انھوں نے قرآن کی بین بجا کر، اشتراکیت کے سانپ کو حریم کعبہ میں داخل کیا ہے۔ اور اب منکرین حدیث یہ چاہتے ہیں کہ غلافِ کعبہ میں لپٹا ہوا یہ سانپ یونہی ''مقدس'' بنا رہے، بالکل اُسی طرح، جس طرح، قبل از اسلام، بت، داخلِ کعبہ ہو کر، نہ صرف مقدس ہی، بلکہ خدا بھی بن بیٹھے تھے، لیکن ان شاء اللہ العزیز، ہمارے دلائل و براہین کی لاٹھی کے سامنے، یہ ''مقدس سانپ'' ٹک نہیں سکے گا، اور اسے اُسی طرح، کعبہ سے نکلنا ہوگا جس طرح، بتانِ عرب کو نکلنا پڑا تھا۔ ساحرین فرعون کی رسیاں کب، عصائے موسوی کے سامنے ٹھہر سکی تھیں؟

مذہبِ پرویز پر ایک جامع تبصرہ:

اب آخر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب کے قرآن سے نچوڑے ہوئے ''دینِ پرویزیت'' پر وہ جامع تبصرہ بھی، اور بعض حلقوں میں اس نوایجاد مذہب

---

[1] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۶۹

کے اثرات بھی واضح کر دیئے جائیں۔ یہ تبصرہ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۹۶۱ء میں فرمایا تھا۔ اور میری نظر میں، مذہبِ پرویز پر اتنا مختصر، جامع اور برمحل تبصرہ، آج تک نہیں گزرا۔ وہ فرماتے ہیں:

جو ٹکنیک، اس فتنے کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے اہم اجزاء یہ ہیں......

۱:......حدیث کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے مغربی مستشرقین نے جتنے حربے استعمال کیے ہیں، ان پر ایمان لانا اور اپنی طرف سے حواشی کا اضافہ کر کے انھیں عام مسلمانوں میں پھیلا دینا، تاکہ ناواقف لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے سوا کوئی چیز بھی، امت کو قابل اعتماد ذرائع سے نہیں ملی ہے۔

۲:......احادیث کے مجموعوں کو عیب چینی کی غرض سے کھنگالنا......ٹھیک اسی طرح جیسے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں نے کبھی قرآن کو کھنگالا تھا......اور ایسی چیزیں نکال نکال کر، بلکہ بنا بنا کر، عوام کے سامنے پیش کرنا، جن سے یہ تاثر دیا جا سکے کہ حدیث کی کتابیں نہایت شرم ناک اور مضحکہ خیز مواد سے لبریز ہیں، پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ اپیل کرنا کہ اسلام کو رسوائی سے بچانا ہے تو اس سارے دفتر بے معنیٰ کو غرق کر دو۔

۳:......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو محض ڈاکیے کا منصب قرار دینا، جس کا کام بس اس قدر تھا کہ لوگوں کو قرآن پہنچا دے۔

۴:......صرف قرآن کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دینا، اور سنت رسول کو، اسلام کے قانونی نظام سے خارج کر دینا۔

۵:......امت کے تمام فقہاء، محدثین، مفسرین اور ائمۂ لغت کو ساقط الاعتبار قرار دینا تاکہ مسلمان، قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے ان کی طرف رجوع نہ کریں بلکہ ان کے متعلق غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ ان سب نے قرآن کی حقیقی تعلیمات

پر پردے ڈالنے کے لیے، ایک سازش کر رکھی تھی۔

۶:......خود ایک نئی لغت تصنیف کر کے قرآن کی تمام اصطلاحات کے معنیٰ بدل ڈالنا، اور آیاتِ قرآنی کو وہ معنیٰ پہنانا جن کی گنجائش، دنیا کے کسی عربی دان آدمی کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے۔ (لطف یہ ہے کہ جو صاحب یہ کام کر رہے ہیں، اُن کے سامنے اگر قرآن کی چند آیتیں، اعراب کے بغیر رکھ دی جائیں، تو وہ انھیں صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے، لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اب خود عرب بھی عربی نہیں جانتے، اس لیے اگر ان کے بیان کردہ معنوں کی گنجائش کسی عرب کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے تو قصور اس عرب ہی کا ہے۔)'' [۱]

یہ مذہب پرویز کے تخریبی اجزاء تھے، اب تعمیری اجزاء بھی دیکھئے:

ان چھ تخریبی اجزاء کے بعد، اب ان ''تعمیری اجزاء'' کو بھی ملاحظہ فرمایئے، جن کی تعداد صرف تین ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مذہبِ پرویز میں تخریبی عنصر بہت غالب ہے، اور جنھیں ''تعمیری اجزاء'' کہا جاتا ہے، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ان میں بھی تخریب ہی مضمر ہے۔ اس طرح، یہ پورے کا پورا دینِ پرویز، جن اجزاء پر مشتمل ہے، وہ تشکیک و تریب ہی کے اجزاء ہیں۔ تاکہ امت مسلمہ کے افراد میں شکوک و شبہات عام کر دیئے جائیں، ان شکوک کی بناء پر، اگر لوگ، دینِ پرویزیت قبول نہ بھی کریں، تب بھی کم از کم یہ تو ہو کہ قلوب و اذہان میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھ جائیں، اور وہ، قرآن و سنت پر مبنی اسلام پر مطمئن نہ رہنے پائیں، اور اسے ''عجمی سازش'' کا نتیجہ قرار دے دیں۔

بہر حال، ان ''تعمیری اجزاء'' کو سید مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ، بایں الفاظ بیان فرماتے ہیں۔

اس تخریبی کام کے ساتھ ساتھ، ایک نئے اسلام کی تعمیر بھی ہو رہی ہے، جس کے بنیادی اصول تعداد میں صرف تین ہیں، مگر دیکھیے کہ کیسے بے نظیر اصول ہیں:

۱:......اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ تمام شخصی املاک کو ختم کر کے ایک مرکزی

---

[۱] سنت کی آئینی حیثیت، ص ۱۹ تا ۲۰

حکومت کے تصرف میں دے دیا جائے، اور وہی حکومت، افراد کے درمیان تقسیم رزق کی مختارِکل ہو۔اس کا نام ہے''نظامِ ربوبیت''۔اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اصل مقصود یہی نظام قائم کرنا تھا،مگر پچھلے تیرہ سو سال میں کسی کو اسے سمجھنے کی توفیق میسر نہ ہوئی، صرف حضرت مارکس اور ان کے خلیفۂ خاص حضرت اینجلز،قرآن کے اس مقصد اصل کو پا سکے۔

۲:......اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام پارٹیاں اور جماعتیں توڑ دی جائیں، اور مسلمانوں کو قطعاً کوئی جماعت بنانے کی اجازت نہ دی جائے تا کہ وہ معاشی حیثیت سے بے بس ہو جانے کے باوجود، اگر مرکزی حکومت کے کسی فیصلہ کی مزاحمت کرنا چاہیں،تو غیر منظّم ہونے کی وجہ سے نہ کر سکیں۔

۳:......اس کا تیسرا اصول یہ ہے کہ قرآن میں ،جس'' اللہ و رسول'' پر ایمان لانے ، اور جس کی اطاعت بجا لانے ، اور جسے آخری سند تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد ہے'' مرکز ملت''۔ یہ مرکز ملت، چونکہ خود'' اللہ اور رسول'' ہے، اس لیے قرآن کو جو معنیٰ وہ پہنائے ،وہی اس کے اصل معنی ہیں۔ اس کے کسی حکم یا قانون کے متعلق یہ سوال سرے سے اٹھایا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ جو کچھ وہ حرام کرے وہ حرام۔ اور جو کچھ وہ حلال کرے۔ وہ حلال ہے۔ اس کا فرمان، شریعت ہے اور عبادات سے لے کر معاملات تک، جس چیز کی جو شکل بھی وہ تجویز کر دے، اس کا ماننا بھی فرض بلکہ شرطِ اسلام ہے۔جس طرح'' بادشاہ'' غلطی نہیں کر سکتا، اُسی طرح ''مرکز ملت '' بھی سُبُّوحٌ قدُّوسٌ ہے۔ لوگوں کا کام، اس کے سامنے بس سر جھکا دینا ہے۔'' اللہ و رسول'' نہ تنقید کا ہدف بن سکتے ہیں، نہ ان کے خطا کار ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، اور نہ ان کو بدلا ہی جا سکتا ہے۔''[1]

---

[1] سنت کی آئینی حیثیت، ص۲۰ تا ۲۱

دینِ پرویزیت کی پذیرائی کے حلقے:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، اس نئے اسلام کی پذیرائی جن حلقوں میں پائی ہے، نہ صرف یہ کہ ان کی نشاندہی بھی کی ہے، بلکہ نہایت ایجاز کے ساتھ، بڑے جچے تلے انداز میں، ان پذیرائی کی وجوہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''اس نئے اسلام کے ''نظامِ ربوبیت'' پر، ایمان لانے والے تو ابھی بہت کم ہیں، لیکن اس کے باقی تعمیری اور تخریبی اجزاء چند مخصوص حلقوں میں بڑے مقبول ہو رہے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کے لیے اس کا تصورِ ''مرکز ملت'' بہت اپیل کرنے والا ہے، اس لازمی شرط کے ساتھ کہ مرکز ملت وہ خود ہوں۔ اور یہ خیال بھی انھیں بہت پسند آتا ہے کہ تمام ذرائع، اُن کے تصرف میں ہوں، اور قوم، پوری طرح غیر منظّم ہو کر، اُن کی مٹھی میں آجائے۔ ہمارے ججوں اور قانون پیشہ لوگوں کا ایک عنصر، اسے اس لیے پسند کرتا ہے کہ انگریزی حکومت کے دور میں، جس قانونی نظام کی تعلیم و تربیت انھوں نے پائی ہے، اس کے اصولوں، اور بنیادی تصورات و نظریات اور جزئی وفروعی احکام سے اسلام کا معروف قانونی نظام قدم قدم پر ٹکراتا ہے، اور اس کے ماخذ تک بھی، ان کی دسترس نہیں ہے۔ اس بناء پر وہ اس خیال کو بہت پسند کرتے ہیں کہ سنت اور فقہ کے جھنجھٹ سے انھیں نجات مل جائے اور صرف قرآن باقی رہ جائے جس کی تاویل کرنا، جدید لغت کی مدد سے اب اور بھی آسان ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مغرب زدہ لوگوں کو یہ مسلک اپنی طرف کھینچ رہا ہے، کیونکہ اسلام سے نکل کر مسلمان ہے رہنے کا اس سے زیادہ اچھا نسخہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ آخر اس سے زیادہ مزے کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ مغرب میں حلال، اور ''ملّا کے اسلام'' میں آج تک حرام رہا ہے، وہ حلال بھی ہو جائے، اور قرآن کی سند، ان حلال کرنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔''[1]

---

[1] سنت کی آئینی حیثیت، ص ۲۱ تا ۲۲

کتابیات

الف - قرآن اور تفاسیرِ قرآن

نام مصنف	نام کتاب	ناشر و طابع	ایڈیشن نمبر	سالِ اشاعت
۱- اصلاحی، امین احسن	تفسیر تدبر قرآن، جلد۲	فاران فاؤنڈیشن، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور، پاکستان		جون ۱۹۸۵ء
۲- " "	تفسیر تدبر قرآن، جلد۴	فاران فاؤنڈیشن، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور، پاکستان		جون ۱۹۸۵ء
۳- پرویز، غلام احمد	تفسیر مطالب الفرقان، جلد۳	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرک، لاہور	I	نومبر ۱۹۷۹ء
۴- " "	تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرک، لاہور	I	نومبر ۱۹۸۱ء
۵- " "	تفسیر مطالب الفرقان، جلد۵	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرک، لاہور	I	نومبر ۱۹۸۲ء
۶- دریابادی، عبدالماجد	تفسیر ماجدی، اردو	تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی، لاہور		
۷- الرازی، فخر الدین	تفسیر الکبیر		III	
۸- صابونی، محمد علی	صفوۃ التفاسیر	دار القرآن الکریم، بیروت، لبنان	IV	
۹- مودودی، سید ابوالاعلیٰ	تفہیم القرآن، جلد۳	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	XX	جولائی ۱۹۹۸ء
۱۰- " "	تفہیم القرآن، جلد۶	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	XXVIII	جولائی ۱۹۹۸ء

ب - کتب متفرقہ

نام مصنف	نام کتاب	ناشر و طابع	ایڈیشن نمبر	سالِ اشاعت
۱۱- پرویز، غلام احمد	ابلیس و آدم	طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	V	۱۹۹۴ء
۱۲- " "	اسلام کیا ہے؟	طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	IV	۱۹۹۲ء

۱۹۹۳ء	7	طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	سلیم کے نام، جلد۳	۱۳- " "
۱۹۹۴ء	7	طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور	شعلۂ مستور	۱۴- " "
مارچ ۱۹۶۰ء	1	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور	لغات القرآن، جلد۱	۱۵- " "
اکتوبر ۱۹۶۰ء	1	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور	لغات القرآن، جلد۲	۱۶- " "
جنوری ۱۹۶۱ء	1	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور	لغات القرآن، جلد۳	۱۷- " "
اپریل ۱۹۶۱ء	1	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور	لغات القرآن، جلد۴	۱۸- " "
		ادارہ طلوع اسلام، دہلی	معارف القرآن، جلد۱	۱۹- " "
		۳۷، ترکمان روڈ، نئی دہلی	معارف القرآن، جلد۲	۲۰- " "
		۳۷، ترکمان روڈ، نئی دہلی	معارف القرآن، جلد۳	۲۱- پرویز، غلام احمد
۱۹۸۴ء	17	ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	معراج انسانیت	۲۲- " "
		ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	مفہوم القرآن، جلد۱	۲۳- " "
		ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	مفہوم القرآن، جلد۲	۲۴- " "
		ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	مفہوم القرآن، جلد۳	۲۵- " "
	1	المکتبۃ العلمیہ، ۱۵- لیک روڈ، لاہور	ابن مریم اور پرویز	۲۶- طاہر، عبدالرحمٰن سورتی
فروری ۲۰۰۴ء	1	سرسید میموریل لائبریری، کالج اسٹاپ، باغبانپوری، لاہور	ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی	۲۷- عصمت ابوسلیم
			سیرت النبی، جلد۳	۲۸- ندوی، سید سلیمان

29- The Bible, The Quran And Science By Dr. Maurice Bucaille, Alfalah

Islacim Books, Urdu Bazar, Lahore.

30- The American Heritage Dictionary of English Language



TRUEMASLAK@INBOX.COM

بیت الحکمت لاہور

اسلامی ریاست اور مسلم طرزِ حکمرانی	علامہ محمد اسد	110/-
صالحین کرام کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات	ابو مسعود عبدالجبار سلفی	140/-
ولادت عیسیٰ اور منکرین حدیث	ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی	150/-
تلخیص ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام آزاد	360/-
اجنبی شہر میں (افسانے)	محمد تقی خاں	100/-
حضورؐ بحیثیت سپہ سالار	محمد فتح اللہ گلن	100/-
آخرش (شاعری)	اشرف نقوی	120/-
خواب سرا (شاعری)	پروفیسر صدیق علی مرزا	100/-
اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش	ڈاکٹر محمد امین	130/-
شگفتہ افسانے	مرتب: پروفیسر خالد ندیم	150/-
اسلام پیغمبر اسلامؐ اور مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر	ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی	250/-
ہمارا تعلیمی بحران۔ چند نظریاتی مباحث	ڈاکٹر محمد امین	250/-
ہم کیوں مسلمان ہوئے	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	300/-
ہمیں خدا کیسے ملا؟	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	250/-
اوصافِ حمیدہ	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	150/-
سید مودودی سرحد میں	پروفیسر نور ور جان	90/-
مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	ڈاکٹر محمد امین	200/-
علامت نگاری (انتخاب مقالات)	پروفیسر اشتیاق احمد	175/-
پردہ اُٹھا دوں اگر چہرۂ الفاظ سے......	ڈاکٹر ف۔ عبدالرحیم	80/-
شہید قائد نے فرمایا!	ڈاکٹر قمر احسان کماپوری	50/-

منٹو اور مزاح	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	350/-
خودستائیاں (خودنوشت خاکے)	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	200/-
جھوٹا سب سنسار (شاعری)	مظفر حسین شمیم مرتب: خالد ندیم	200/-
کامیاب بیت بازی	ڈاکٹر محمود فیضانی	150/-
خطبۂ حجۃ الوداع (صدارتی ایوارڈ یافتہ)	ڈاکٹر نثار احمد	150/-
وجودِ باری تعالیٰ	پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ	90/-
سرورِ دو عالم ﷺ	فضل کریم خاں درانی	90/-
حیات مسیح اور ختم نبوت	نور محمد قریشی ایڈووکیٹ	90/-
☆ الموسوعۃ القضائیہ (عربی ایڈیشن)	نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر سہیل حسن	300/-
الموسوعۃ القضائیہ (اُردو ایڈیشن)	رسول کریم کے عدالتی فیصلوں کا مستند مجموعہ	300/-
قرآن اور تعمیر سیرت	پروفیسر فروغ احمد	100/-
مغربی جمہوریت، حقیقت اور سراب	ڈاکٹر مستفیض احمد علوی	150/-
تہذیب کے فرزند (مکالماتی کالم)	ڈاکٹر مستفیض احمد علوی	100/-
اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	300/-
انتخاب خطوط غالب	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	100/-
حقیقت ذکر	ڈاکٹر عبدالخالق	150/-
اُردو نثر میں طنز و مزاح	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	590/-
ذاتیات (طنز و مزاح)	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	100/-
تاریخ میں سفر	عدنان طارق	250/-
جہان حیرت (خودنوشت سوانح حیات)	سردار محمد چوہدری	700/-
بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان	سردار محمد چوہدری	200

قدرتی خزانوں سے علاج	حکیم راحت نسیم سوہدروی	100/-
بیماریاں اوران کا نباتاتی علاج	حکیم راحت نسیم سوہدروی	90/-
مادرملت، آبروئے ملت (ایوارڈیافتہ)	پروفیسر محمد رفیق عالم	350/-
بطل حریت۔فقیرآف اپی	ڈاکٹر فضل الرحمٰن	220/-
تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء (تذکرہ علمائے اہلحدیث)	عبدالرشید عراقی	220/-
نقاداور عقلیات	مطاہر ترمذی	140/-
جناب غلام احمد پرویزاپنے الفاظ کے آئینے میں	پروفیسر دین محمد قاسمی	220/-
مقالاتِ شاغف	ابوالاشبال شاغف بہاری	250/-
محمد علی کلے کا قبول اسلام	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	15/-
کائنات کے پانچ راز	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	15/-
غزل آباد (انتخاب شاعری)	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	200/-
علامت کے مباحث	پروفیسر اشتیاق احمد	320/-
محمد حسن عسکری۔عہد آفریں نقاد	پروفیسر اشتیاق احمد	180/-
تاج محل سے زیروپوائنٹ	چوہدری محمد ابراہیم	220/-
شہداور کلونجی	حکیم راحت نسیم سوہدروی	100/-
جدیدیت کا تنقیدی تناظر	پروفیسر اشتیاق احمد	350/-
نماز کے بعد دعائے اجتماعی	عبدالجبار سلفی	70/-
قلمی دشمنی	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	100/-
دفاعِ پاکستان	اورنگ زیب علی باغسر	200/-
عمر بن عبدالعزیزؒ	عبدالرشید عراقی	100/-

منکرین حدیث کے ''مفکرِ قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز کو ہم نے اُمت مسلمہ کے حق میں 'فی الواقعہ' ایک ایسے ہی سامری کے روپ میں پایا ہے۔ اُن کی آنکھوں پر 'تہذیبِ مغرب کی رنگین عینک تھی' جس کی بنا پر انہیں 'محمد رسول اللہ والذین معہ کی تہذیب' اپنے اصل اور فطری رنگ میں دکھائی دینے کی بجائے ''عجمی سازش'' کے رنگ میں مصبوغ نظر آتی تھی اور تہذیبِ مغرب کی ہر چیز انہیں' کھری اور حقیقی نظر آتی تھی' کیونکہ دل کی آنکھوں پر جو چشمہ نصب تھا اس کا یہی تقاضا تھا۔ ایک زمانہ تھا' جب وہ تنہا قرآن کی بجائے ''قرآن وسنت'' اور ''کتاب اللہ واسوہ حسنہ'' کا نام بھی لیتے رہے ہیں' اور ان دونوں کو سرچشمہ اسلام بھی قرار دیتے رہے ہیں' بلکہ اُن دنوں' وہ فقط ''قرآن قرآن'' کی رٹ لگانے والے ''اہل قرآن'' کے خلاف مضامین ومقالات بھی لکھتے رہے ہیں' لیکن صرف اس وجہ سے کہ فقیہِ مصلحت بیں اُن دنوں ایسا کرنا ''نظریہ ضرورت'' کا تقاضا دکھائی دیتا تھا' اور پھر بعد میں' جب اُن کے قارئین کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا' تو وہ مصلحت ومنافقت کا لبادہ ترک کر کے' رندِ بادہ خوار کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئے اور جن افکار ونظریات کی' وہ بربناءِ مصلحت' تردید کیا کرتے تھے' اُن کی تائید پر اُتر آئے' اور جن عقائد وتصورات کی تائید کیا کرتے تھے' ان کی مخالفت وابطال' اب' اُن کا فریضہ ٹھہرا۔

کتاب سرائے

الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اُردو بازار' لاہور۔ پاکستان

فون: 042-7320318 فیکس: 042-7239884

ای میل: hikmat100@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ

اُردو بازار' نزد ریڈیو پاکستان' کراچی۔

فون: 2212991-2629724